

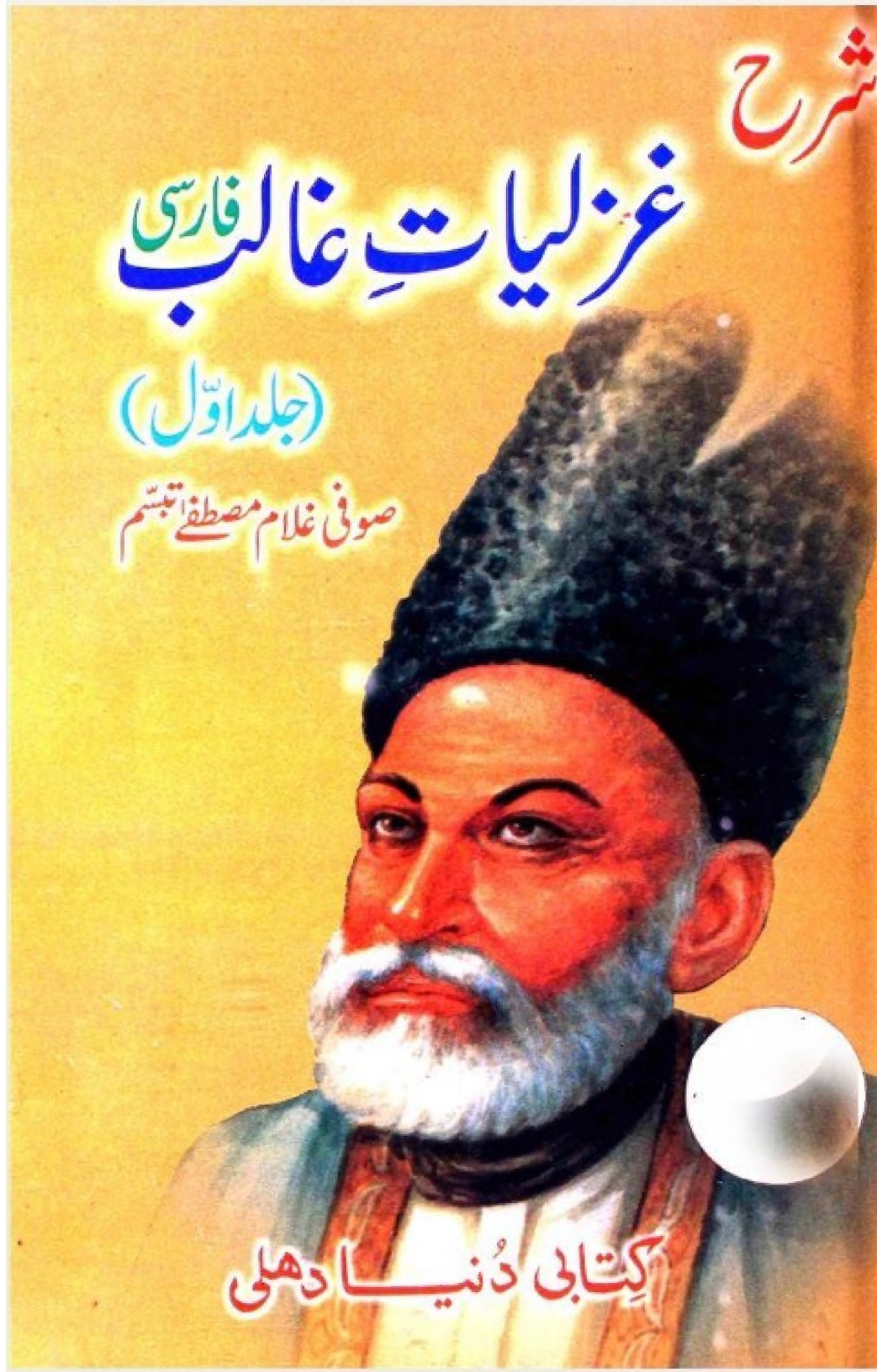
شرح

# غزلیاتِ غالب فارسی

(جلد اول)

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

کتابی دُنیا دہلی





© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ!

## Sharah Ghazaliyat-e-Ghalib Farsi

(Vol. I)

by:-

Sufi Ghulam Mustufa Tabassum

Year of Edition : 2006

ISBN-81-89461-08-7

Price Rs. 400/-

شرح غزلیات غالب فارسی (جلد اول)	:	نام کتاب
صوفی غلام مصطفی تبسم	:	شارح
۴۰۰ روپے	:	قیمت
۲۰۰۶ء	:	سند اشاعت
غلام مصطفی	:	ناشر ڈیزائننگ
کاک آفسیٹ پرنٹرز، دہلی	:	مطبع

Published by :-

**Kitabi Duniya**

1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,  
Opp. Anglo Arabic School, Turkman Gate, Delhi-110006

Mob: 9313972589, Ph: 011-23288452

E-mail: [kitabiduniya@rediffmail.com](mailto:kitabiduniya@rediffmail.com)

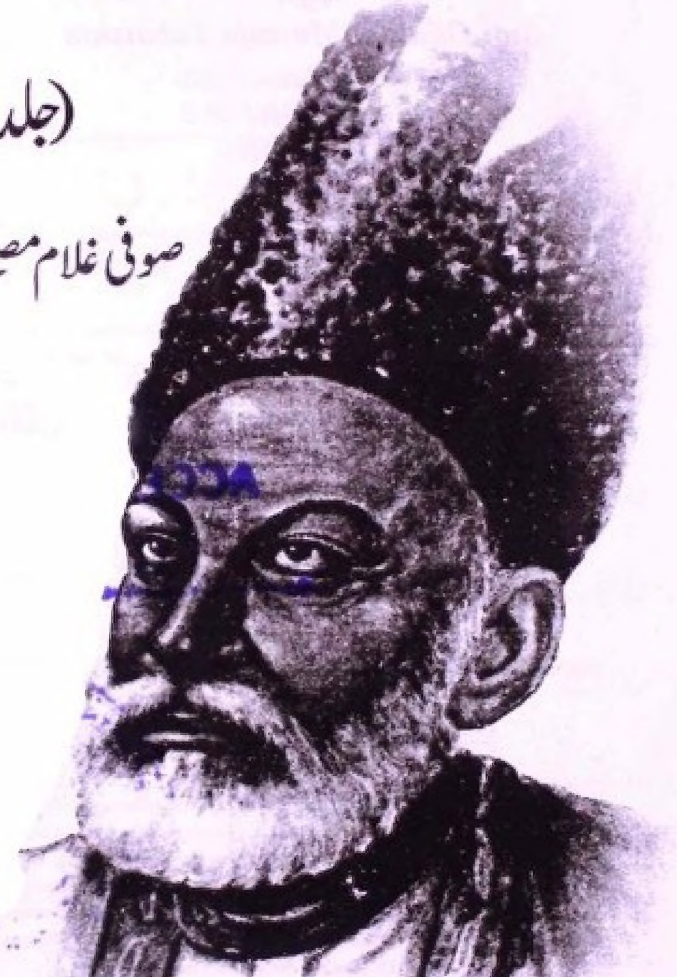
All rights reserved. No part of this publication may be reproduced, stored in a retrieval system or transmitted, in any form or by any means, without the prior permission in writing of Kitabi Duniya, or as expressly permitted by law, or under terms agreed with the appropriate reprographics rights organization. Enquiries concerning reproduction outside the scope of the above should be sent to the Rights Department, Kitabi Duniya, at the address above.

You must not circulate this book in any other binding or cover and you must impose this same condition on any acquirer.

# شرح غزلیات غالب فارسی

(جلد اول)

صوفی غلام مصطفی تبسم



کتابی دُنیا دہلی



## پیش لفظ

یہ ہمارے زمانے کا المیہ ہے کہ استاد محترم صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی عمر بے وفائی سے اپنی اس کتاب کی طباعت اور اشاعت خود نہ کرا سکے۔ غالب کی فارسی غزلیات کی شرح کی اہمیت کسی ذی علم شخص سے پوشیدہ نہیں۔ فارسی زبان آج سے سوا سو سال پہلے تک پنجاب کی سرکاری زبان تھی۔ تب پنجاب کا ہر لکھا پڑھا آدمی اس زبان کو کسی حد تک سمجھتا، بولتا اور لکھتا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگریزی زبان نے اس کی جگہ لی تو فارسی کا رواج رفتہ رفتہ کم ہونے لگا اور آج یہ حالت ہے کہ پورے پاکستان میں نہ کوئی فارسی بولتا ہے نہ لکھتا ہے۔ فقط وہ شخص جس کے درسی نصاب میں کبھی فارسی کی کچھ کلاسیکی کتابیں شامل رہی ہوں۔ اسے ایک حد تک صرف سمجھ سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی کے توسط میں جو جدید علوم و فنون ہم تک پہنچے ہیں وہ اپنی جگہ پر نہایت مفید ہیں، بلکہ ان کے بغیر ہم آج کی دنیا میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ لیکن فارسی ادب کے ذوق و شوق کے بغیر ہم اس تہذیب و ثقافت کی اساس کو، جس سے ہمارا تشخص ہوتا ہے، نہیں پاسکتے۔ یونانی، عربی اور عجمی فلسفے اور اساطیر کی سینکڑوں تلمیحات ہمارے قومی ادب یعنی اردو کی نظم و نثر کا حصہ بن چکی ہیں۔ لیکن انھیں کما حقہ سمجھنے کے لئے ہمیں فارسی کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔

اس رجوع کا ایک ثقلہ ذریعہ غالب کی فارسی غزلیات ہیں۔ غالب کے اردو کلام کو پچھلے ساٹھ ستر سال میں جو شہرہ اور وقار حاصل ہوا ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ اس

## ترتیب

پیش لفظ	5
تعارف	7
ردیف (الف)	13
ردیف (ب)	210
ردیف (پ)	229
ردیف (ت)	234
ردیف (ث)	452
ردیف (ج)	456
ردیف (چ)	465
ردیف (ح)	472
ردیف (خ)	480



شہرت کے باعث بے شمار پڑھ لکھے لوگوں کو اب شوق پیدا ہو رہا ہے کہ غالب کے فارسی کلام کو بھی سمجھیں۔ لیکن غالب جس کی اردو مشکل ہے، فارسی اور بھی مشکل ہے۔

استاذی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا یہ احسان موجودہ اور آئندہ آنے والے طالب علموں پر ہمیشہ رہے گا کہ انھوں نے غالب کی فارسی غزلوں کی تشریح آسان اردو میں کر دی ہے۔ عرب و عجم کی تہذیب و ثقافت کے تصورات سے شناسائی کے ذریعے اور بھی ہوں گے لیکن جس آسانی اور مسلسل لطف کے ساتھ انھیں کلام غالب کے توسط سے سمجھا جاسکتا ہے وہ کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ اسی لئے کتابی دنیا کا ادارہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم مرحوم کی شرح غزلیات غالب کا طبع اور شائع کرنا اپنے لئے فخر و سعادت سمجھتا ہے خدا کرے کہ اس سے ہمارے نوجوانوں میں نہ صرف فارسی فہمی کا شوق بڑھے بلکہ یہ ان کے لئے خود شناسی اور خود گری کا بھی ایک ذریعہ بن جائے۔

سید با بر علی

## تعارف

غالب کی فارسی غزلیات کا ترجمہ اور تشریح ہمارے وقت کی ایک ایسی ضرورت تھی جسے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے پورا کر کے وطن کے اہل علم اور اہل ذوق لوگوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ تبسم مرحوم فارسی کے ممتاز شاعر اور استاد تھے جنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں طلبہ کی کئی پشتوں کو فارسی ادب کی تعلیم دی۔ غالب کی فارسی غزلیات کی تشریح کے لئے پاکستان میں شاید ہی ان سے بہتر کوئی اور شخص ہوتا۔ یہ کام انھوں نے آج سے تقریباً آٹھ دس سال پہلے شروع کیا تھا اور کوئی تین سال ہوئے کہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ ایک ٹریجڈی ہے کہ وہ خود اپنی اس تصنیف کو طبع اور شائع ہوتا نہ دیکھ سکے اور ۱۹۷۸ء میں اسلام آباد سے لاہور آتے ہوئے حرکت قلب کے رک جانے سے فوت ہو گئے ان کے بعد ان کی اس کتاب کی طباعت اور اشاعت کا کام کتابی دنیا کے ادارے نے بھی اپنے ذمے لے لیا جس کا نتیجہ اب آپ کے سامنے ہے۔

بہت وقت نہیں گزرا کہ ہمارے یہاں فارسی بطور سرکاری اور مجلسی زبان مردج تھی۔ انگریز اور انگریزی کے آجانے سے یہ نقشہ بدل گیا۔ فارسی کا فہم عام نہ رہا اور وہ ہمارے لئے ایک اجنبی زبان بن کر رہ گئی۔ لیکن جو کچھ اس زبان میں یہاں پچھلے سات یا آٹھ صدیوں میں لکھا گیا اس کی اہمیت ہماری ملت کے لئے کم نہیں ہوئی اور اس کے مطالب و معانی کا جاننا اب بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ پہلے تھا۔ فارسی نظم و نثر کے ذریعے صوفیانہ روایات، علوِ اخلاق، غیرت مندی



نگاری، الفاظ کی نغمگی اور واردات عاشقی کی نفسیات ملتی ہیں وہ ذوق سلیم کو وجد و اہتراز میں لانے والی ہیں۔ جو خوش قسمت شخص شعر غالب سے کس لذت کرتے ہوئے اس سے اپنے احساسات، جذبات اور فکر کی تہذیب کرتا ہے۔ وہ ایسی دولت کا مالک ہے جسے زوال نہیں اور جو صحیح معنوں میں پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کی ثقافت کا وارث ہے۔ لیکن یہ بیش بہا خزانہ فارسی زبان کے جانے بغیر نہیں ملتا۔ اس لئے یہ کہنا ایک سچائی ہوگی کہ غالب کے فارسی اشعار کا ترجمہ اور تشریح ایک بہت بڑی ملتی خدمت تھی۔ جو صوفی تبسم مرحوم نے ہمارے زمانے میں انجام دی۔

اگرچہ غالب اپنے بہت سے مضامین، فارسی اور اردو اشعار دونوں میں دہراتا ہے لیکن اسے اپنی فارسی پر بڑا ناز ہے، وہ اسے اردو پر ترجیح دیتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ میرا اصل رنگ دیکھنا ہو تو میرا فارسی کلام دیکھو:

فارسی بین تا بہ بنی نقشہای رنگ رنگ  
بہر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است

وہ اپنے فارسی دیوان کی خوبیوں کے بیان میں اتنا غلو کرتا ہے کہ اسے ایک الہامی کتاب کا درجہ دیتا ہے:

غالب اگر این فن سخن دین بودی  
آن دین را ایزدی کتاب این بودی

وہ پورے ارادے سے شاعری کی عام راہ کو چھوڑ کر مشکل گوئی کو اپنا طرز امتیاز بنا لیتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے شعر بلکہ لفظ تک معانی کا ایک خزانہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ دیکھئے۔

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل

گویم مشکل و گر گویم مشکل

عالی حوصلگی اور آداب مجلس کے جو سبق، اور فکر باریک نزاکت احساس اور شوخی تخیل کا جو ورشہ ہم تک پہنچا ہے وہ برصغیر کی عجیب و غریب رسوم، بھونڈے بھدے فنون اور بھانت بھانت کی بولیاں رکھنے والی غیر دوستانہ قوموں کے درمیان ہمارا امتیاز اور تخلص بن گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دینی اعتقادات اور اداس و نواہی ہماری ملت کے تخلص کی اصل بنیاد ہیں۔ لیکن فارسی ادب کے اثرات ہر عہد میں اسے تقویت پہنچا کر اس کا نگملہ کرتے رہے ہیں۔

غالب وقت میں خسرو اور فیضی وغیرہ کی بہ نسبت ہم سے نزدیک تر ہے۔ اور قدیم کے ساتھ جدید مسائل پر بھی کہیں کہیں نظر ڈالتا ہے۔ ہم اپنے زمانے سے پچھلی طرف دیکھیں تو اس کا کلام برصغیر میں فارسی شعر کا مخلص اور نگملہ معلوم ہوتا ہے۔ کلام غالب میں قدیم عرب و عجم اور روم و یونان کے اساطیر و توہمات اور تصورات و مسائل کے ساتھ ساتھ ہمیں ہند و فرنگ سے اپنی آویزشوں پر شاعرانہ اشارے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں ازمنہ وسطی و قتیق کے ان مسائل کا ذکر تو ہے ہی جو آسمانوں اور سیاروں کی گردش، شاہد و مشہور، تفریق ذات و صفات، وجود و حادث اور جبر و اختیار سے متعلق تھے۔ یا جو ہندوستان کے زنا کاری برہمنوں اور ان کے بکھدوں کے اسرار و طلسمات سے تعلق رکھتے تھے، لیکن یہاں آس سلخو رانگلستان کی دو رخنی کا گلہ بھی ہے جو کبھی فعال مایرید ہے اور کبھی ایک جرمے کے عوض ہم سے ہمارا دین طلب کرتا ہے۔ غالب ان اور دوسرے بے شمار مضامین کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا چلا جاتا ہے جس سے ان دقیق مسائل کا بیان آسان، شگفتہ اور پر لطف ہو جاتا ہے ان مضامین سے آگہی ہماری ثقافت کا جزو ہے اور جیسا کہ پہلے عرض ہوا، کہ اس کا غالب کے شعر سے اخذ کرنا طالب علم کیلئے ایک پر لطف عمل ہے۔ ہماری بات اب تک صرف اساطیر، تصورات و مسائل کے علم سے متعلق تھی۔ لیکن غالب کا شعر جو بطور شعر لذت رکھتا ہے یہ ایک الگ باب ہے۔ اس کے شعر میں جو ترکیبوں کی نیرنگی، تصویر



گنجینہ معنی کا ظلم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

غالب کی یہ رائے چونکہ خود اپنے اور اپنے کلام کے متعلق ہے اس لئے اسے شاعرانہ تعلیمی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے معاصر اہل ذوق بھی اس کی رائے کے مؤید نظر آتے ہیں۔ اور اس کے کلام خصوصاً فارسی کلام، کی عظمت کے قائل ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی سے زیادہ ہندوستان کی فارسی شعری روایت کے سمجھنے پر کھنے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ غالب کے مقام کے متعلق فرماتے ہیں۔

قدسی و صائب و اسیر و کلیم

لوگ جو چاہیں آن کو ٹھرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت

خاک کو آسمان سے کیا نسبت

اس آسمان کی رسائی کی مشکل کو صوفی تبسم مرحوم نے آسان بنانے کی جو کوشش کی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ صوفی صاحب کی تشریحات جیسی وہ کر گئے ہیں، ان کی امانت ہیں جنہیں ہم رد و بدل کے بغیر آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ان کا مسودہ دیکھتے ہوئے بعض جگہ ایسا احساس ہوتا ہے کہ ان کی تشریح ایک اوسط درجے کے طالب علم کے لئے کافی نہ ہوگی۔ اور اسے تشنہ رکھے گی۔ بعض دوسری جگہوں پر نظر آتا ہے کہ شارح شعر کے اصل خیال کو چھوڑ کر صرف دُجو کے کسی ضمنی مسئلے کی طرف نکل گیا ہے۔ اور کئی جگہ تشریح کی بجائے صرف ترجمے پر اکتفا کی ہے،

حالانکہ وہاں تشریح کی ضرورت تھی۔ لیکن جیسا کہ عرض ہوا یہ میٹیریل صوفی صاحب کی امانت ہے، اس میں رد و بدل کا کسی کو حق نہیں۔ ان اسقام پر، جو بہت کم ہیں نظر ڈالتے ہوئے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ غالب کی فارسی غزلیات کی تعداد ساڑھے تین سو کے قریب ہے اور ان کی تشریح ہزار صفحے سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اتنے بڑے کام کو، جو برسوں کی محنت سے انجام تک پہنچا ہے، یکساں توجہ سے کرتے چلے جانا کسی جوان شخص کے لئے بھی مشکل ہوتا۔ چہ جائیکہ اس شخص کے لئے جس کی عمر ستر سے متجاوز تھی۔ یہ کام جیسا بھی ہوا ہے ہماری پوری ملت پر ایک احسان ہے کہ اس کے ذریعے اس کا فراموش شدہ ثقافتی ورثہ اسے واپس دلایا جا رہا ہے ہم صوفی صاحب مرحوم کی اس بے بہا خدمت کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔

ہمیں کتابی دنیا اور سید بابر علی صاحب کی دریا دلی کا معترف اور ممنون ہونا چاہئے کہ وہ اس کتاب کی طباعت پر ہزار ہا روپے کا خرچ برداشت کر رہے ہیں۔ سید بابر علی کو اپنے مرحوم استاد صوفی تبسم کا پاس تو ہے ہی لیکن اس کام سے جو انہوں نے قوم و ملت کی خدمت کی ہے اس کے لئے وہ عند اللہ ماجور ہوں گے۔

ڈاکٹر سید نذیر احمد



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## شرح غزلیات فارسی غالب ”ردیف الف“

غزل نمبر (۱)

ای بخلا و ملا خوئی تو ہنگامہ زا

با ہمہ در گفتگو، بی ہمہ با ماجرا

دستور کے مطابق دیوان غزلیات کی پہلی غزل حمد کی ہوتی ہے۔ چنانچہ مرزا غالب کی یہ غزل بھی حمد ہی کی ہے۔

خلا و ملا دو اصطلاحیں ہیں جو فلسفہ مابعد الطبیعات میں مستعمل ہیں۔ فلسفیوں کے نظریے تکوین کائنات کے مطابق جب دنیا وجود میں نہیں آئی تھی تو خلا کا عالم تھا۔ کائنات کے وجود میں آنے کے بعد یہی خلا ملا میں تبدیل ہو گیا۔ خلا کا لغوی مفہوم خالی ہوتا ہے اور ملا اس کی ضد ہے یعنی پر ہونا۔ گویا خالی جگہ پر ہو گئی۔

شعر کا سادہ اردو ترجمہ یہ ہے:

خدا یا تیری ذات، خلا ہو یا ملا، ہنگامہ آفرینی کی خوگر ہے۔ سب کے موجود ہونے پر تو ان سے محو گفتگو ہوتا ہے، جب کچھ نہ ہو تو تیری ذات پھر بھی اپنی پوری شان میں ہوتی ہے۔ غالب کا یہ اردو شعر دیکھیے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یعنی اللہ کی ذات ازلی اور ابدی ہے۔ یہ فانی انسان درمیان میں کیا آ گیا۔

اللہ تعالیٰ کی جلوہ گری اور شانِ خدا کی ہر عالم میں اور ہر آن قائم رہتی ہے اور اس کی موجودگی کا ہر ایک کو احساس ہے۔ گویا وہ ہر ایک مخلوق سے محو گفتگو ہے۔ جب یہ حالت نہ تھی تو اس وقت بھی وہ اپنی شانِ خود نمائی میں مصروف تھا۔ اور اس کے حسن کی ادائیں مصروف کار تھیں۔ حالانکہ ان کا دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ کائنات میں اس کی ذات کے جاری و ساری ہونے کو مرزا غالب نے ہنگامہ زائی یا ہنگامہ آفرینی کہا ہے اور جب یہ ہنگامے نہیں تھے اور ذات حق کی اداکاریاں اپنے پورے جو بن پر تھیں، اسے غالب نے بے ہمدردی سے تعبیر کیا ہے۔

شاہد حسن ترا، در روش دلبری

طرہ پر خم صفات موی میان ما سوا

الفاظ کی تشریح:

”شاہد حسن“ میں اضافت، اضافت تفسیمی ہے۔ یعنی حسن جو ایک معشوق کی طرح ہے۔ مراد خود حسن ہی ہے۔ طرہ پر خم زلف پر پیچ ہے اور موئے میاں، موئے کمر۔

ماسوا ہر وہ شے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ ہے۔ صوفیہ کے نزدیک، کائنات میں وجود باری تعالیٰ کے علاوہ، تمام اشیاء کا وجود غیر حقیقی ہے۔



صوفیا اور فلاسفہ میں خدا کی ذات اور اس کی صفات کا مسئلہ ہمیشہ زیر بحث رہا ہے۔ اس بحث کا سادہ اور مرکزی نقطہ یہ ہے کہ کیا ذات اور صفات الگ الگ ہیں یا ایک ہی ہیں۔ بہر حال شعر میں صفات سے مراد صفات الہیہ ہیں۔

مرزا غالب نے شاہد حسن کی صفات یعنی صفات الہیہ کو طرہ پر ختم کہا ہے اور اس کی ذات کے علاوہ جو کچھ ہے یعنی ماسوا کو موے کمر سے تشبیہ دی ہے۔ شعرا معشوق کی نازک کمر کو بال سے تشبیہ دیتے ہیں بلکہ اس حد تک مبالغہ کرتے ہیں گویا وہ ہے ہی نہیں۔ چنانچہ مرزا غالب خدا سے خطاب کر کے کہتے ہیں۔ کہ تیرے حسن کی شان دلہری یہ ہے کہ اس کی صفات زلف پر پیچ کی طرح الجھی ہوئی ہیں ان کو سلجھا یا نہیں جاسکتا یعنی ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اور پھر تیرا ماسوا شاہد حسن کی کمر کی طرح ہے، جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

مرزا غالب نے اپنے ایک اردو شعر میں دنیا کو شاہد ہستی مطلق کی کمر کہا ہے۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم

لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یعنی دنیا کا حقیقی وجود کچھ نہیں، یہ معشوق ازل کی کمر ہے۔

دیدہ واران را کند، دید تو بنش فزون

از نگہ تیز رو، گشتہ نگہ تو تیا

دیدہ دور: صاحب بصیرت۔

تو تیا: سرمہ، کہتے ہیں کہ سرمہ بینائی میں اضافہ کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تیرا دیدار، صاحب بصیرت لوگوں کی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ ان لوگوں کی نگاہ کی تیز روی (یعنی ان کی تیز نگاہی) نے ان کی نگاہ کو سرمہ بنا دیا ہے۔ جس سے ان کی بینائی بڑھ گئی ہے۔

آب نہ بخشی بہ زور، خون سکندر ہذر

جان نہ پذیری بہ ہیج، نقد خضر نا، دا

خون ہذر، خون رانگاں کو کہتے ہیں۔ وہ خون جس کا کوئی صلہ نہ ملے اور ضائع ہو جائے۔ نقد، کھرایا رانج سکھ ہوتا ہے اور ناروا کھوٹا سکھ جو رانج نہ ہو۔

اس شعر میں خضر اور سکندر کے ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ دونوں آب حیات کی تلاش میں نکلے۔ راستے میں سکندر راہ بھول گئے اور خضر نے آب حیات کو پالیا اور اسے پی کر عمر جاوداں حاصل کر لی۔

مرزا غالب کا اردو شعر ہے۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے

اب کسے رہنما کرے کوئی

اس واقعہ کے بیان سے شعر میں ایک صنعت آگئی ہے جسے صنعت تلمیح کہتے ہیں۔

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اے خدا تیری بے نیازی کے کیا کہنے! اگر کوئی زور آور کو شش سے پانی حاصل کرنا چاہے تو اسے نہیں دیتا۔ سکندر کا خون پانی کی تلاش و جستجو میں ضائع ہو گیا۔ اور اگر کوئی جان دینا چاہے تو اسے مفت بھی قبول نہیں کرتا۔ خضر کا نقد جاں کھوٹا سکھ بن کر رہ گیا ہے چاہتا ہے کہ مرے اور نہیں مرنے۔ نقد و ناروا ایک دوسرے کی ضد ہیں اس سے شعر میں صنعت تضاد بھی آگئی ہے۔

بزم ترا شمع و گل خستگی بو تراب

ساز ترا زیر و بم واقعہ کر بلا

بزم ترا اور ساز ترا دونوں میں ”را“ اضافت کا مفہوم دے رہا ہے۔ ایسے را کو راے



اضافی کہتے ہیں۔

شعری تشریح ہوگی:

خستگی بو تراب شمع و گل بزم تو دو واقعہ کر بلا زیر و بم ساز تو (ہست)۔

ایک روز حضرت علیؑ زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے انھیں اس حالت میں دیکھ کر پکارا۔ ”یا ابو تراب“ اسی دن سے حضرتؑ کا لقب ابو تراب ہو گیا۔ یہ لقب کنیت کی صورت میں ہے۔

حضرت علیؑ اور امام حسینؑ دونوں کی شہادت ہماری تاریخ کے بڑے المناک واقعات ہیں۔ مرزا غالب اس شعر میں بھی خدائے پاک کی بے نیازی کو یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ بو تراب، شہید ہوئے ان کی شہادت اور خستہ حالت تیری بزم بے نیازی کے لیے شمع و گل بنی اور سانچہ کر بلا تیرے ساز بے نیازی کا زیر و بم ہوا۔ زیر و بم اونچے اور نیچے سروں کو کہتے ہیں۔

یعنی اتنی عظیم اور عزیز ہستیاں یوں مظلومانہ موت کا شکار ہو گئیں اس کی بے نیازی کے قربان کی وہ دیکھتا رہا۔

نکبتیان ترا قافلہ بی آب و نان

نعمتیاں ترا ماندہ بی اشتھا

نکبت، نعمت کی ضد ہے۔ نکبتی اور نعمتی دونوں میں ”بی“ قافیہ ہے جس سے نکبتی کا مفہوم بد بخت یا بد نصیب اور نعمتی کا مفہوم خوش بخت یا خوش نصیب ہے۔ قرآنی رو سے نکبتی سے مراد مغضوب لوگ ہیں۔ اور نعمتی وہ ہیں جنہیں ”انعمت علیہم“ کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ پچھلے شعر کی طرح اس شعر میں بھی ترا میں ”را“ کا حرف اضافت کا مفہوم دے رہا ہے۔ مفہوم شعر یہ ہے کہ جو لوگ تیرے مردود ہیں ان کا قافلہ حیات پانی اور روٹی کو ترستا ہے۔ اور جن پر

تیرا فضل و کرم ہوا انھیں بغیر بھوک کے (کھانوں سے چنے ہوئے) دسترخوان میسر آتے ہیں۔

گرمی نبض کسی کز تو بدل داشت سوز

سوخته در مغز خاک ریشہ دارو گیا

دارو گیا، دارو گیاه کا مرخم ہے یعنی اس کا آخری حرف (ہ) گرا دیا گیا ہے جسے قواعد صرف و نحو کی رو سے ترخیم کہتے ہیں۔ ایسے شخص کی نبض کی گرمی سے، جس کے دل میں تیرا سوز محبت تھا، زمین کے اندر (مغز میں) دارو گیا کی جڑیں جل گئیں۔

مصرف زھر ستم دادہ بیاد تو ام

بزر بود جائی من در دھن اژدھا

اس شعر میں مرزا غالب نے محبوب کی ستم رانیوں کی تلخی کو زھر ستم کے نام سے یاد کیا ہے۔ کہتا ہے محبوب کی یاد میں زھر ستم رچا ہوا ہے۔ اگر میں اس عالم میں دھن اژدھا میں جا بیٹھوں تو میری جگہ بزر ہوگی۔

اب بزر کے لفظ کے دو معنوی پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ سر بزر کا مفہوم دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ زھر خوردہ انسان کے بدن کا رنگ سبزی مائل ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ”بزر بود جائی من“ یعنی میری جگہ بزر ہوگئی، یعنی وہاں بھی زھر پھیلانے لگی۔

اب پہلے مفہوم کے اعتبار سے اس مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس قدر زھر ستم کھائے ہوا ہوں کہ اژدھا کے منہ میں بجائے زہریلے پن کے مجھے آسودگی محسوس ہوگی۔ دوسرے یہ کہ اژدھا جس کا دھن تخت زہر آلود ہے، خود میرے زہر سے زہر آلود ہو جائے گا یہ بات شعر میں صنعت ایہام پیدا کر دیتی ہے۔



کم مشمر گریہ ام زان کہ بعلم ازل

بود درین جوی آب گردش هفت آسیا

ہفت آسیا سے مراد ہفت آسمان ہیں۔

جوئی آب آنسوؤں کے طوفان کے لئے آیا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میرے رونے کو حقیر مت جان، کہ کبھی میرے ان آنسوؤں کے سیلاب میں سات آسمان گردش کر رہے تھے، اور یہ بات علم ازل میں تھی۔

سادہ ز علم و عمل مھر تو در زیدہ ایم

ہستی ما پایدار، بادۂ ما ناشتا

ناشتا ناہار کو کہتے ہیں اور ناہار معدے کی خالی حالت کو۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم لوگ علم اور عمل دونوں سے عاری ہیں۔ ہاں ہم میں ایک وصف ضرور ہے اور یہ کہ ہم نے تجھ سے عشق کیا ہے۔ اور عشق کی مستی بڑی پایدار ہے۔ اس میں خمار کی نوبت نہیں آنے پاتی اس لئے کہ جو شراب (یعنی شراب محبت) ہم پیتے ہیں اس میں کسی چیز کے کھانے کی نوبت ہی نہیں آتی، مسلسل شراب پیتے چلے جاتے ہیں۔

خلد بہ غالب سپار، زانک بدان روضہ در

نیک بود عند لب خاصہ نو آئین نوا

روضہ سے مراد روضہ خلد ہے۔ نو آئین نوا وہ پرندہ ہے جو نئے نئے نغمے گاتا ہے۔

بدان روضہ در کا مطلب ہے اس روضے میں یعنی روضہ خلد میں۔ بدان روضہ کی ”ب“ میں کے معنی دیتی ہے اور در زائد ہے۔ جیسے کہ سعدی کے اس شعر میں۔

بدریا در منافع بی شمار است

وگر خواہی سلامت بر کنار است

بدریا میں ”ب“ در کے معنی دے رہا ہے اس لئے دوسرا در زائد ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اے خدا! باغ خلد میرے سپرد کر دے کیونکہ اس باغ میں ایک بلبل کا ہونا اچھی بات ہے، خاص کر ایسی بلبل جو نئے نئے نغمے گاتی ہو، یعنی نو فکر شاعر ہونے کی حیثیت سے میں اس کی بات کا مستحق ہوں کہ مجھے جنت عطا کی جائے۔



### غزل نمبر (۲)

تعالیٰ اللہ برحمت شاد کر دن بی گناہان را

نخل پسند و آزر م کرم، بی دستگاہان را

روایت کے مطابق یہ غزل نعت کی ہے

”بی گناہان“ = بے گناہ لوگ، وہ لوگ جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں۔

”بی دستگاہان“ = بے گناہان کی ضد ہے۔ وہ لوگ جو بے سرمایہ ہیں یعنی جن کے پاس نیک عملوں کی دولت نہیں۔

آزر م۔ مہربانی اور شفقت۔

مرزا رسول پاک ﷺ کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ سبحان اللہ! آپ کی شان یہ ہے کہ آپ نیکو کار بندوں کو رحمت سے نوازتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ آپ کی بخشش کی مہربانیاں بے گناہوں کو اپنی بے اعمالی پر شرمندہ ہوتے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتیں۔ یعنی آپ کی



رحمت کی وسعت کا تقاضا ہے کہ نیک اور بد دونوں اس سے فیضیاب ہوں۔

خوئی شرم گنہ در پیشگاہ رحمت عامت

سہیل وزہرہ افشاند زسیما روسیاحان را

خوئی شرم = عرق شرم، ندامت پسینہ۔ سہیل و زہرہ = دو ستارے ہیں۔

روسیاہ سے مراد گناہ گار لوگ۔ سیما = پیشانی۔

تیری بارگاہ رحمت میں ندامت گناہ سے جو پسینہ گناہ گاروں کی پیشانی سے بہتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ پسینے کے قطرے نہیں بلکہ سہیل اور زہرہ ستارے ہیں۔ روسیاهوں کی رعایت سے یہ چمکدار ستارے مذکور ہوئے ہیں۔

زجی دردت کہ با یک عالم آشوب جگر خائی

دود در دل گدایان را و در سر پا دشاہان را

با یک عالم آشوب جگر خائی = جگر کا دیوں کے دکھوں کے باوجود

”درد دل گدایان را“ = یعنی درد دل گدایاں

”در سر پادشاہان را“ = یعنی در سر پادشاہاں

”را“ دونوں جگہ اضافت کا مفہوم دیتا ہے۔

تمہارے دردِ محبت کے کیا کہنے کہ باوجود اس کے کہ اس میں دکھوں کی ایک دنیا بسی

ہوئی ہے۔ گداؤں کے دلوں میں بادشاہوں کے سروں میں سایا ہے۔

یعنی شاہ ہو کہ گدا کوئی بھی تیرے دردِ محبت سے خالی نہیں۔ شاعر نے گداؤں کے دل

اور پادشاہوں کے لئے سر کا استعمال کیا ہے۔ دل کا لفظ گر مجبوری محبت کے لئے موزوں ہے اور سر

کاوش خیال کے لیے۔

بہ حرفی، جلقہ در گوش افگنی آزاد مردان را

نجوابی مغز در شور آوری بالین پناہان را

جلقہ در گوش افگندن = غلام بنالینا

مغز در شور افگندن = پریشان کر دینا۔

بالین پناہاں = جمع ہے بالین پناہ کی، وہ شخص جو بڑے سکون سے نیچے کا سہارا لیے

ہوئے لیٹا ہو یا آرام سے سویا ہو۔ تو ایک بات کر کے آزادوں کو اپنا غلام بنالیتا ہے اور ایک خواب کے ذریعے سکون سے سونے والوں کی نیند پریشان کر دیتا ہے۔

ز شوقت، بیقراری آرزو، خارا نہادان را

بہ بزممت، لای خواری آبرو، پرویز جاہان را

خارا نہادان = سخت طبیعت لوگ، سنگدل۔

پرویز جاہاں = پرویز کی سی جاہ و حشمت رکھنے والے لوگ۔

شاہانہ ٹھاٹھ کے لوگ۔ لا = درد، تلخ، وہ میل جو خمیے کے نیچے بیٹھ جاتا ہے۔

پرانے زمانے میں دستور تھا کہ جب میخوار خمیے کو کھولتے تھے تو اوپر کے حصہ کی

شراب، جو صاف اور پاکیزہ ہوتی تھی، خود پیتے تھے اور نیچے کی شراب (درد) گداؤں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

بڑے بڑے سخت طبیعت لوگ تیرے شوقِ محبت سے بیقرار ہونے کی آرزو کرتے

ہیں۔ اور خسرو پرویز جیسی شان رکھنے والے تیری بزم میں دردِ خواری کو بھی اپنی آبرو خیال کرتے



ہیں۔ خسرو پرویز (شیریں کا شوہر) ایران کے ساسانی خاندان کے شہنشاہوں میں اپنی شان و شوکت کے باعث مشہور ہے۔

بہ داغت شادم لما زین خجالت چون برون آیم

کہ رشکم در جیم ا گلند، خلد آرامگا ہان را

داغ سے داغ محبت مراد ہے۔

نیکوکار لوگ اپنے اعمال صالحہ کے باعث جنت میں جائیں گے۔ ایسے لوگوں کو مرزا غالب نے خلد آرام گاہ کہا ہے کہ وہ باغ خلد میں چین سے پڑے ہیں اور ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے سرمایہ خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نیکوکار، خلد آرام گاہ ہیں۔ میرے پاس کوئی ایسا عمل نہیں۔ البتہ ایک تیری محبت کا داغ ہے جو سینے میں لیئے ہوئے ہوں۔ یہی میرے لئے کافی سرمایہ ہے۔ اور اسی پر نازاں بھی ہوں لیکن اس بات کا کیا علاج کہ مجھے دیکھ کر یہ خلد آرام گاہ لوگ رشک سے جل رہے ہیں۔ اور رشک کی آگ نے انھیں جہنم میں ڈال رکھا ہے۔ اور میں ان کی حالت زار کو دیکھ کر سخت شرمندہ ہوں اور اس خجالت کے احساس سے باہر نہیں نکل سکتا۔

بہ دلہا رنجی یکسر شکستن ہم ز یزدان دان

کہ لختی بر خم زلف و کلہ زد کج کلاہان را

فارسی میں ”شکستن“ کے بہت سے معنوی پہلو ہوتے ہیں۔ انھی میں ایک بل کھا جانا

ہے۔ چنانچہ ”زلف شکستہ“ وہ زلف ہے جو پر خم ہو۔

دل شکستن = دل توڑنا۔

”بہ دلہا رنجی یکسر شکستن“ کا مفہوم یہ ہے کہ تو نے دلوں کو سرتاپا شکست کے عالم میں

ڈال دیا یعنی دلوں کو توڑ دیا۔ یہ بات بھی اللہ کی دین ہے کہ جس نے کج کلاہ معشوقوں کی زلف و کلاہ میں کچھ شکن ڈال دیے ہیں کہ جس کے بل پر انھوں نے عاشقوں کے دلوں کو پیچ و تاب میں ڈال رکھا ہے۔ ”شکستن“ کی رسایت لفظی نے، شعر میں بلاغت پیدا کی ہے۔ مرزا غالب کی ندرت خیال و بیان دیکھیے کہتے ہیں کہ حسن اس بات پر نازاں ہے کہ اس نے دلوں کو شکستہ کر دیا، حالانکہ یہ عنایت ایزدی ہے جس کی بدولت حسن میں بھی تھوڑی شکن زلف و شان کج کلاہی آئی ہے اور وہ دلوں کو توڑنے کے قابل ہوا ہے۔

بنازم خوبی خون گرم محبوبی کہ در مستی

کند ریش از مکیدن ہا، زباں عذر خواہان را

عذر خواہاں = وہ لوگ جو اپنی خطاؤں کے لئے معافی کے خواستگار ہوں ”میں اس گرم

جوش محبوب کی خوبیوں پر ناز کرتا ہوں جو بکت کی مستی میں، اپنے عذر چاہنے والوں کے لبوں کو چوم چوم کر زخمی کر دیتا ہے۔

بہ نمی آسائش جانھا بدان ماند کہ ناگاہان

گذر بر چشمہ افتد تشنہ لب گم کردہ راہان را

شراب سے انسانی جانوں کو وہی آسودگی نصیب ہوتی ہے جیسی، پیاسے، بھولے بھٹکے

راہیوں کو چلتے چلتے، اچانک کسی چشمے پر پہنچ جانے سے ہوتی ہے۔

ز جورش داورمی بردم بہ دیوان، لیک زین غافل

کہ سعی رشکم از خاطر برد نامش گواہاں را

میں اس کے جور و آتم کے خلاف، عدالت میں، انصاف، طلب کرنے کے لئے حاضر



ہوا، لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ میرے جذبہ رشک کے اثر سے، گواہوں کو اس کا نام بھول جائے گا۔

گست تار و پود پردہ ناموس را نازم

کہ دام رغبت نظارہ شد رسوا نگاہان را

رسوا نگاہاں = وہ لوگ جو اپنی شوخ اور بے باک نظروں کے باعث بدنام ہوں۔ میں اپنے پردہ ناموس کے تار و پود کے بکھر جانے پر خوش ہوں۔ کہ میرا اس طرح بے تک و نام ہو جانا ہر طرف بے باک نظریں ڈالنے والے معشوقوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

اس شعر میں رسوا نگاہاں کے لفظ میں بڑی معنویت ہے۔ اس سے مقصود ایسے لوگ ہیں جو نہ فقط خود اپنی بے باک نگاہی کے لیے بدنام ہیں بلکہ وہ دوسروں کو رسوا ہوتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اس کی عیب پوشی کریں، ادھر خصوصیت کا اظہار کر کے، دوسروں کو ادھر توجہ کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔

اس شعر میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ یہی رسوا نگاہ معشوق عاشق کے پردہ ناموس کو چاک کرنے والے بھی ہیں۔

نشاط هستی حق دارد از مرگ اینم غالب

چراغم چون گل آشامد، نسیم صبحگاہان را

حق قائم و دائم ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں میں ہستی حق کے تصور میں مست ہوں، مجھے موت کا کیا خوف۔ میرا چراغ، بجائے اس کے کہ صبح کی ہوا کے چلنے سے بجھ جائے، پھول کی طرح، نسیم صبح کو پی کر شگفتہ ہوتا ہے۔

شاعر نے مرگ کے لیے نسیم صبح گاہاں کا نادر استعارہ استعمال کیا ہے۔



## غزل نمبر (۳)

خاموشی ما گشت بدآموز بتان را

زین پیش و گرنہ اثری بود فغان را

ہمارے خاموشی ہو جانے نے بتوں کو غلط سبق پڑھایا، ورنہ اس سے پہلے، ہماری فریاد کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا کرتا تھا۔ یعنی میرا محبوب میری خاموشی کا غلط مفہوم سمجھا اس نے یہ خیال کیا کہ اس کے دل میں عشق کا جذبہ ہی نہیں ورنہ یہ ضرور آہ و فریاد کرتا۔  
غالب کا یہ شعر دیکھیے۔

ہو گئی ہے غیر کی جادو بیانی کارگر

عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

منت کش تا شیر و فائیم کہ آخر

این شیوہ عیان ساخت عیار و گران را

منت کش = احسان مند۔

”ایں شیوہ“ سے شیوہ و فامراد ہے جس کا ذکر پہلے مصرعے میں آیا ہے، دیگر اس سے مراد غیر رقیب ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ ہم اپنے شیوہ وفا کے احسان مند ہیں کہ اس سے کم از کم اتنا تو ہوا کہ رقیبوں کے دعویٰ عشق کے جھوٹے ہونے کا راز کھل گیا۔ پتا چل گیا کہ ان کا معیار عشق کیا ہے۔ یعنی ہمارے خلوص محبت سے ان کی قلعی کھل گئی۔



در طبع بہار این ہمہ آشفنگی از چست

گوئی کہ دل از بیم تو خون گشتہ خزان را

شاعر محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے:

بہار کی طبیعت میں یہ پریشانی کس وجہ سے ہے؟ معلوم ہوتا ہے یہ بہار نہیں خزاں ہے جس کا دل تیرے خوف سے خون ہو گیا ہے۔ مرزا غالب نے بہار کی شگفتگی کا نہیں، آشفنگی کا ذکر کیا ہے۔ اور اسے خزاں خوں شدہ دل کہا ہے اور پھر اُسے محبوب کے حسن سے خوف زدہ ہونے کا نتیجہ کہا ہے جو اس کی ندرت فکر و بیاں کو ظاہر کرتا ہے۔

اس شعر میں ردیف ”را“ بھی اضافی ہے یعنی دل از بیم تو خون گشتہ خزاں را دراصل ”دل خزاں، از بیم تو خون گشتہ“ ہے۔

موی کہ برون نامہ باشد چہ نماید

بھودہ در اندام تو جستم میان را

شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ جو بال ابھی (جسم سے) باہر نہیں آیا وہ کیا نظر آئے گا ہم یونہی تیرے جسم میں (تیری) کمر کو ڈھونڈتے رہے۔

شاعر نے مبالغہ آمیزی سے کام لے کر، معشوق کی کمر کو ایسے بال سے تشبیہ دی ہے جس کا وجود ہی نہیں۔

غالب کا یہ شعر دیکھئے:

فریب وعدہ بوس و کنار یعنی چہ

دھن دروغ دروغ و کمر دروغ، دروغ

طاقت نتوانست بہنگامہ طرف شد

دادیم بدست غمت از نالہ عنان را

”از نالہ عنان را“ کے الفاظ میں از اضافت کا مفہوم دے رہا ہے۔ چنانچہ دوسرے مصرعے کی تشریہ ہوگی:

عنان نالہ را بدست غم تو دادیم۔ ہنگامہ سے مراد ہنگامہ عشق ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہماری کمزور طاقت ہنگامہ عشق کی تاب نہ لا سکی چنانچہ ہم نے آہ و فریاد کی باگ ڈور تیرے غم کے ہاتھ میں دے دی۔

یعنی عشق کے صدموں سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تو نالہ و فریاد کرنے لگے۔

تا شاہد رازت خموشی شدہ رسوا

چون پردہ بہ رخسار فروہشت بیان را

راز جب تک خموشی میں رہے، پنہاں رہتا ہے۔ جب اظہار و بیاں میں آئے افشا ہو جاتا ہے۔ مرزا غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ راز حقیقت کسی شرح و بیان میں نہیں آ سکتا۔ اس بات کو خدا سے خطاب کرتے ہوئے یوں ادا کیا کہ اے خدا تیرا شاہد راز، اپنی خموشی کے باعث (کیونکہ وہ کسی سے بات نہیں کرتا) رسوا ہو گیا ہے۔ اس نے بیان کو نقاب کی طرح اپنے چہرے پر ڈال لیا ہے۔ یعنی راز یوں تو ظاہر ہے لیکن اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کا یہ اردو شعر اسی نکتے کا آئینہ دار ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی تو ہی نغمہ ہائے راز سے آگاہ نہیں ورنہ یہاں جس کو تو حجاب کہہ رہا ہے وہی ساز کا کمر ہے۔



در مشرب بیداد تو خونم منی ناب است

کز ذوق نخمیازہ در افکنده کمان را

خمیازہ انگڑائی کو کہتے ہیں۔

خمیازہ کشیدن = انگڑائی لینا۔ در خمیازہ افکندہ = کسی کو انگڑائی کی حالت میں ڈال دینا۔

شراب پینے والوں کا جب نشہ اتر رہا ہو یا پورا نہ ہوا ہو تو وہ انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ انگڑائی لینے وقت، انسان کے دونوں بازو یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے کمان ہو۔ کہنا یہ ہے کہ معشوق تیر پہ تیر چلاتا چلا جا رہا ہے۔ مگر اس کا شوق ستم کم نہیں ہوتا۔ اسے یوں بیان کیا۔

”تیرے مسلک بیداد میں میرا خون، شراب ناب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی کیفیت سے کمان پر (بجائے نشے کے) خمار کی حالت طاری ہو رہی ہے۔ اور وہ انگڑائیاں لے رہی ہے“  
مسلک، مشرب، مذہب تینوں لفظ مترادف ہیں اور طریق یا طریقے کے معنی دیتے ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے مشرب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو مئے و شراب کے اعتبار سے بے حد موزوں اور بلیغ ہے۔

بر طاعتیان فرخ و بر عسرتیان سہل

نازم شب آدینہ ماہ رمضان را

طاعتیاں، طاعتی کی جمع اور عسرتیاں، عسرتی کی جمع ہے۔ دونوں میں ”ی“ فاعلی

ہے۔ طاعتیاں، اطاعت گزار بندے اور عسرتیاں، اصحاب عیش و نشاط ہیں۔

شب آدینہ، جمعہ کی رات، جمعہ چھٹی کا دن ہوتا ہے اس لیے شب آدینہ یعنی جمعہ کی رات، خاص کر رمضان کے مہینے میں، اطاعت گزاروں اور عیش و نشاط والوں دونوں کے لئے موزوں ہے۔ اطاعت گزاروں، کے لئے یہ رات مبارک ہے کہ وہ جتنی چاہیں عبادت کر لیں اور

شرابیوں کے لئے اس میں سہولت ہے کہ جب تک چاہے جی کھول کر پیتے رہیں۔ دوسرے مصرعے میں ردیف ”را“ پر کے معنوں میں آیا ہے۔ جس سے مصرعے کا مفہوم یہ ہو گیا ہے۔ کہ میں ماہ رمضان کی شب آدینہ ”پر“ ناز کرتا ہوں۔

ایک زدہ ام بال تقاضا ز دو مصرع

تا مژدہ معراج دہم سعی بیان را

فارسی میں ”بال زدن“ پر مارتا ہے تاکہ پرندہ اڑ سکے۔ تقاضا سے مقصود، تقاضاے زور بیاں ہے۔

کہتا ہے کہ لو میں نے اب دو مصرعے لے کر انھیں پر بنالیا ہے تاکہ میں پرواز کروں اور اس سے اپنی سعی بیان کو معراج کی خوش خبری سناؤں۔

ان دو مصرعوں کو شاعر نے ایک نیا مطلع بنایا ہے اور اس مطلع میں اپنے بیان کی بلند پروازی دکھائی ہے۔

معراج، بلندی ہے لیکن یہاں اس لفظ میں ایک لطیف نکتہ بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ یہاں سے اشعار میں نعتیہ رنگ آ گیا ہے۔

زینسان کہ فرو رفتہ بدل پیر و جوان را

مژگان تو جوہر بود آئینہ جان را

”بدل پیر و جوان“ میں را اضافت کا ہے۔ چنانچہ الفاظ کی ترتیب یوں ہے ”بدل پیر و جوان“ دوسرے مصرعے کی نثر بھی یوں ہوگی:

مژگان تو جوہر آئینہ جان بود

جوہر آئینہ سے مراد آئینے کی چمک ہے۔



شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ تیری مڑگاں، ہر بوڑھے اور جوان کے دل میں اس طرح سے چھپی ہوئی ہیں کہ وہ آئینہ جاں کا جو ہر بن گئی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تیری نگاہیں ہر پیر و جوان کی روح کو جلا بخشتی ہیں، گویا وہ روح رواں ہیں۔

واداشت سگ کوئی تو زین حد خنثاسی

در پائی تو می خواستم، افشاند روان را

حد خنثاسی = اپنے مقام اور حد کو نہ پہچاننا، حد سے گزر جانا۔ وا داشت = روک دینا۔

میں چاہتا تھا کہ اپنی جان تیرے قدموں پر بٹا کر دوں، اس جرأت اور حد سے تجاوز کرنے پر تیرے سگ کو چہ نے مجھے روک دیا۔

کتنے کا خاصہ ہے کہ وہ کسی غیر آدمی کو گلی میں آنے سے روکتا ہے اور اگر آجائے تو اسے کسی غیر حرکت سے باز رکھتا ہے۔

بر ترتم از بگل قدت جلوہ فرو بار

تا خاک کند نو بر از آن پای نشان را

’پائے نشان را‘ میں را اضافی ہے یعنی نشان پا۔ نو بر مجھے نوبادہ بھی کہتے ہیں۔ وہ پھل جو بازار میں تازہ آیا ہو۔ دستور ہے کہ جب کوئی پھل پہلے پہل بازار میں آتا ہے تو اسے لوگ ضرور چکھتے ہیں۔ اسے نو بر کردن یا نوبادہ کردن کہتے ہیں۔

اب ذرا تصور کیجئے کہ عاشق کی موت تازہ واقع ہوئی ہے اور قبر پر عزیز و احباب کی آمد ابھی شروع نہیں ہوئی۔ وہ چاہتا ہے سب سے پہلے اس کا محبوب آئے اور اس کی خاک مزار کو نوازے اور میری تربت پر اپنے درخت جیسے قد کا سایہ ڈال (جلوہ افشانی کر) تاکہ میری خاک تیرے نشان پا کو چوم سکے (مزہ چکھ سکے) گویا محبوب کے قدموں کے نشان اس تازہ پھل کی

طرح ہوں گے جسے لوگ بڑی خواہش سے کھاتے اور اس کا مزہ چکھتے ہیں۔

جستیم سراغ چمن خلد بہ مستی

در گرد خرام تو، رہ افتاد گماں را

گماں را رہ افتاد = خیال ادھر کو چل پڑا۔

ہم یونہی مستی میں چمن خلد کو تلاش کر رہے تھے۔ (اچانک) خیال اس گرد کی طرف چلا گیا جو تیری خرام کی وجہ سے اٹھ رہی تھی۔ یعنی اس گرد پر ہمیں یہ شبہ ہوا گویا وہ گرد و غبار نہیں بلکہ چمن خلد کھلا ہوا ہے۔

اس لحاظ سے گماں کا لفظ شعر میں بڑا پر معنی ہے۔ پہلے مصرعے میں مستی کا لفظ شعر کی جان ہے اور اردو کا لفظ ”دھن“ اس کے مفہوم کے قریب آتا ہے۔

مرزا غالب کے نزدیک خلد در حقیقت محبوب کی رہگزر ہی ہے اور کچھ نہیں۔ اس خیال کو جگہ جگہ مختلف پرایوں میں ادا کیا ہے۔ مثلاً یہ شعر۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست

لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

ای خاک دردت قبلہ جان و دل غالب

کز فیض تو پیرایہ ہستی است جہان را

یہاں سے صاف نعتیہ رنگ شروع ہوتا ہے۔

تیرے دروازے کی مٹی غالب کے جان و دل کا قبلہ ہے۔ کیونکہ تیرے فیض سے ہستی کائنات کی آرائش ہے۔



تا نام تو شیرینی جان دادہ بہ گفتن

در خویش فرو بردہ دل از مھر زبان را

تیرا نام لینے سے میری گفتار میں جان کی سی شیرینی آگئی ہے، اس شفقت اور محبت کے اثر سے میرے دل نے زبان اپنے اندر کھینچ لی ہے یعنی خاموش ہو گیا۔

خاموش ہونے کے دو پہلو ہیں:

ایک تو یہ کہ اس بات کا شکر لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا، دوسرے یہ کہ دل اندر ہی اندر مزے لے رہا ہے۔

اسی لیے تو مرزا غالب نے ”شیرینی جان“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں گویا رسول پاک ﷺ کا نام لینے سے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جسم میں جان تازہ آگئی ہے۔

بر امت تو دوزخ جاوید حرام است

حاشا کہ شفاعت نہ کنی سوختگان را

آپ ﷺ کی امت پر ہمیشہ دوزخ حرام ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ جلنے والوں کی شفاعت نہ کریں۔ یعنی یقیناً رسول پاک ﷺ اپنے گناہگار امتیوں کی شفاعت کریں گے اور وہ بخشے جائیں گے۔



## غزل نمبر (۴)

چون عذار خویش دارد، نامہ اعمال ما

سادہ پرکار فراوان شرم، اندک سال ما

عذار = رخسار فراوان شرم = بے حد شرمیلا

سادہ = بھولا بھالا اندک سال = کم سن۔

پرکار = ہشیار

شعر کے دوسرے مصرعے میں شاعر نے اپنے محبوب کی صفات گنوائی ہیں: وہ بھولا بھالا ہے اور پھر شوخ اور چالاک بھی ہے اور اس پر بے حد شرمیلا اور کسن بھی۔ جب معشوق میں یہ اوصاف موجود ہوں تو عاشق کو حسن کی بارگاہ میں کسی طرح کی گستاخی کی جرأت نہیں ہو سکتی بلکہ وہ اس میں پاکیزہ جذبات کو پیدا کرتا ہے۔ اور اس کا اعمال نامہ ویسا ہی سادہ رہتا ہے جتنا اس معشوق کا حسن یا چہرہ سادہ ہے۔ عذار محبوب اور نامہ اعمال عاشق میں باعث مشابہت، دونوں کا پاک و صاف ہونا ہے۔ حسن معصوم ہے عشق بھی پاکیزہ ہے۔

میل ماسوی وی و میلش بسوی چون خودی است

آرد از خود رفتش ناگہ باستقبال ما

از خود رفتن = بے خود ہونا

ہم تو اس کی طرف مائل ہیں اور وہ اپنے جیسے کسی اور حسین پر فریفتہ ہے۔ یہ فریفتگی اور عالم دارگی کسی نہ کسی دن اچانک، اسے ہمارے استقبال کے لئے لے آئے گی۔ یعنی اسے ہماری محبت اور لہجستگی کا احساس ہوگا۔



حال ما از غیر می پرسی و منت می بریم

آگهی باری کہ آگہ نیستی از حال ما

تو ہمارا حال غیر (رقیب) سے پوچھتا ہے اور ہم اس پر بھی ممنون ہیں۔ اس سے کم از کم یہ پتا تو چلتا ہے کہ تجھے اتنا احساس تو ہے کہ تو ہمارے حال سے آگاہ نہیں۔ (معشوق کا عاشق کے بارے میں پوچھنا اس کی دلچسپی کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے)

عیش و غم در دل نمی استد، خوشا آزادی

بادہ و خونا بہ یکسان است در غربال ما

دنیا کا عیش اور غم کوئی بھی ہمارے دل میں آکر نہیں ٹھہرتا۔ کیا اچھی آزادی ہے ہماری چھلنی میں شراب اور خون دونوں برابر ہیں یعنی دونوں بہہ جاتے ہیں۔

نقش ما در خاطر یاران دژم صورت گرفت

بسکہ رو در ہم کشید آئینہ از تماشال ما

چونکہ ہماری صورت سے آئنے نے ناک بھوں چڑھائی، ہمارے دوستوں کے دل میں بھی ہمارا نقش میز حایہ بیٹھ گیا۔

نیشتر سازید و بگدازید ہرجا تیشہ ایست

خون گرم کوھکن دارد رگ قیفال ما

قیفال = یونانی الاصل لفظ ہے۔ ایک رگ جہاں فصد کھولتے ہیں۔ ہماری رگ قیفال میں کوئکن (فرہاد) کا خون گرم جوش مار رہا ہے، اس لیے جہاں بھی

تیشہ ملے، اسے لو، پگھلاؤ اور نشتر بنا لو تا کہ فصد کھولی جائے اور یہ خون گرم بہہ جائے۔  
فرہاد کا جوش عشق تیشہ کی ضرب سے کم ہوا تھا، ہمارے خون گرم کو سرد کرنے کے لیے اسی تیشہ ہی سے بنا ہوا نشتر مفید ہوگا۔

ما ہمای گرم پروازیم، فیض از ما مجو

سایہ ہمجو دود بالا می رود از بال ما

ہم ایک پرندہ ہے جس کا سایہ مبارک سمجھا جاتا ہے۔  
شاعر کہتا ہے کہ ہم بلند پرواز ہما ہیں، ہم سے کسی فیض کی توقع نہ رکھ کیونکہ ہمارا سایہ ہمارے پروں سے بجائے نیچے پڑنے کے، دھوکے کی طرح اوپر کو جاتا ہے۔  
یعنی ایسے بلند مقام پر ہیں کہ کسی کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

خضر در سرچشمہ حیوان فرو غلتیدنش

لغزش پائی است کش رودادہ در دنبال ما

مرزا غالب نے اس شعر میں ایک تصویر کھینچی ہے جس کے نقش کچھ اس طرح ابھرتے ہیں کہ غالب اور خضر دونوں ہم سفر ہیں۔ غالب بہت آگے ہیں اور خضر بہت پیچھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سفر کے دوران میں چشمہ حیوان آیا۔ تو خضر (حیات جاودانی حاصل کرنے کے لیے) اس چشمہ حیوان ہی میں غوطہ زن ہو گئے اور غالب آگے نکل گئے۔

مرزا غالب کی نظر میں خضر کا یہ عمل ایک طرح کی لغزش پاتھی ورنہ سفر زندگی اور اس کی تنگ و دو یوں ختم نہیں ہو جاتی۔ چنانچہ شعر میں اس بات کو یوں بیان کیا کہ۔۔۔

خضر کا چشمہ حیوان میں غلطاں ہونا ایک ایسی لغزش پا ہے جو اسے یعنی خضر کو ہمارے عقب میں رہ کر پیش آئی۔



خاک را از ابر اورار معین داده اند

بی نمی پارینہ برما رائدہ اند امسال ما

اورار = بہنا۔ اسی لیے زور کی بارش کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ اس شعر میں ابر کی رعایت سے آیا ہے۔

پارینہ = پچھلے سال کی یا پرانی

خاک پر بادل سے مقرر، مقدار ہی میں بارش ہوتی ہے۔ اس سال کو بغیر نئے پارینہ کے ہماری طرف دیکھ لیا گیا ہے۔ یعنی ابر رحمت سے اس سال بارش نئے نہیں ہوئی۔ یہ سال خالی گیا۔

اب نئے پارینہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ امسال کی رعایت سے نئے پارینہ سے مراد وہ شراب ہے جو گذشتہ سال یعنی پار سال میسر آئی تھی۔ اور دوسرے معنی شراب کہن ہیں، جو پرانی ہونے کے باعث تیز اور عمدہ سمجھی جاتی ہے۔

با چنین گنجینہ ارژد، اژدھائی ہم چنین

حلقہ بر گرد دل ما زد زبان لال ما

زبان لال = زبان گنگ، زبان خاموش

پرانے زمانے میں لوگ اپنے خزانے کسی دیرانے میں دفن کر دیتے تھے تاکہ چرائے نہ جاسکیں اسی سے یہ تو ہم بھی لوگوں میں پھیل گیا کہ اس خزانے پر سانپ بیٹھتا ہے شعر میں اسی عام عقیدے کی طرف اشارہ ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ہماری خاموش زبان ہمارے دل کے گرد حلقہ ڈال کر بیٹھ گئی ہے۔ ہاں، ایسے خزانے کے لیے (یعنی دل کے خزانے کے لیے) ایسا ہی اژدہا ہونا چاہیے۔

خاموش رہنے سے انسان کے خیالات کا خزانہ چھپا رہتا ہے۔

جان غالب! تاب گفتاری گمان داری هنوز

سخت بیدردی کہ می پرسى ز ما احوال ما

مرزا غالب اپنے محبوب سے خطاب کر کے کہتے ہیں: جان غالب! تجھے ہم سے ابھی تک تاب گفتاری کی توقع ہے۔ تو سخت بے درد واقع ہوا ہے۔ کہ ہم سے ہمارا حال پوچھ رہا ہے۔ تاب گفتار کے نہ ہونے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اب صورت حال عرض حال کے مرحلے سے گزر چکی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ عرض حال کی طاقت ہی نہیں رہی۔ ان دو حالتوں کے پیش نظر پرشش حال کرنا بے دردی نہیں تو اور کیا ہے۔



### غزل نمبر (۵)

گر بیائی مست، از در گلزار ما

گل ز بالیدن رسد تا گوشہ دستار ما

اگر تو مستانہ وار، اچانک ہمارے باغ کے دروازے سے اندر آ جانے تو (تیرے جلوہ حسن سے) پھول اتنے پھولیں پھلیں، (ان میں اتنی گفتگو آ جائے) کہ وہ خود بخود ہمارے گوشہ دستار تک پہنچ جائیں۔



یعنی پھولوں میں وہ رعنائی آجائے کہ ہم انھیں اپنے زیب دستار کریں کہ وہ تمہارے حسن ہی سے چمکتے ہیں۔ مرزا غالب نے بالکل یہی خیال اردو کے اس شعر میں ادا کیا ہے۔

دیکھ کر تجھ کو چمن بکھڑو کرتا ہے  
خود بخود پہنچے ہے گل گوشہ دستار کے پاس

وحشی در طالع کاشانہ ما دیدہ است

میں پرد چوں از رخ، سایہ از دیوار ما  
ہمارے گھر کے فصیحے میں اُس نے کچھ ایسی وحشت دیکھی ہے کہ ہماری دیوار کا سایہ،  
دیوار سے یوں بھاگتا ہے جیسے چرے سے رنگ اڑ جاتا ہے۔

مرزا غالب نے اپنے گھر کی پریشان حالت کو یوں بیان کیا ہے کہ اس کے در و دیوار  
پر وحشت برستی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اس کا سایہ بھی اس سے گریزاں ہے۔

گوشہ گیرانیم و محو پاس ناموس خودیم

آبروئی ما گداز جوھر رفتار ما

ہم گوشہ نشین ہو گئے ہیں اور خلوت میں بیٹھے اپنے پاس ناموس میں محو ہیں۔ اس گوشہ  
نشینی ہی میں ہماری عزت محفوظ ہے۔ گویا ہماری (طاقت) رفتار کا جوہر گداز ہو کر ہماری آبرو کا  
سامان بن گیا ہے۔

جب کوئی چیز گداز ہو جائے تو اس میں ایک چمک سی آ جاتی ہے۔ شاعر نے اسی لحاظ  
سے آبرو کا سامان کہا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ اب اس گوشہ نشینی ہی میں عزت و آبرو محفوظ ہے

حسہ عجزیم و از ما جز گنہ مقبول نیست

تکیہ دارد بر شکست توبہ استغفار ما

ہم حسہ عجز ہیں کہ ہم سے سوائے گناہ کے کوئی چیز قبول نہیں کی جاتی۔ ہمارا استغفار  
شکست توبہ کا سہارا لیے ہوئے ہے۔ یعنی ہم توبہ کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے ہیں۔  
لیکن یہ توبہ، توبہ نہیں بلکہ شکست توبہ ہوتی ہے کیونکہ فوراً ٹوٹ جاتی ہے۔

توبہ کو توڑنا بھی اک گناہ ہے اس طرح سے گناہ کرنا اور گناہوں سے توبہ کرنا برابر ہے۔  
اس بات کو شاعر نے یوں ادا کیا ہے کہ سوائے گناہ کے ہماری کوئی چیز مقبول نہیں۔ اور  
یہی بات اس کے عجز کی دلیل بھی ہے۔

سخت جانیم و قماش خاطر ما نازک است

کارگاہ شیشہ پنداری بود کھسار ما

قماش، کا لفظ رخت و سامان، جامہ اور جوہر تینوں معنی دیتا ہے۔ یہاں جوہر کے مفہوم  
میں آیا ہے۔ قماش خاطر ما نازک است کے معنی ہیں، ہمارا مزاج نازک ہے۔ شاعر نے اپنی  
سخت جانی کو کبسا رکھا ہے اور اپنی نازک مزاجی کو کارگاہ شیشہ یعنی شیشے بنانے کا کارخانہ۔

یوں تو ہم سخت جان ہیں۔ دکھ پہ دکھ اٹھائے چلے جاتے ہیں اور مرتے نہیں۔ لیکن  
ساتھ ہی مزاج اتنا نازک واقع ہوا ہے کہ شیشے کی طرح ہلکی نہیں بھی برداشت نہیں کرتا۔

می خزاید در سخن رنجی کہ بر دل می رسد

طوطی آئینہ ما می شود زنگار ما

طوطی آئینہ پرانے زمانے میں دستور تھا کہ طوطی کو باتیں کرنا سکھانے کے لیے اسے



ایک آئینے کے سامنے بٹھا دیتے تھے۔ اور ایک شخص یا ایک طوطی آئینے کے پیچھے بیٹھ کر وہ باتیں کرتا جو سکھانی مقصود ہوتیں، طوطی اپنا عکس آئینے میں دیکھ کر یہ سمجھتا کہ یہ باتیں اس کا حریف یا مد مقابل جو آئینے میں ہے، کر رہا ہے۔ اور پھر وہی باتیں کرنا۔ طوطی آئینے سے مراد وہ طوطی ہے جو آئینے میں ہے۔ اسی سے طوطی پس آئینہ وہ شخص ہے جو آئینے کے پیچھے بیٹھ کر طوطی کو باتیں سکھاتا ہے۔

طوطی کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم میں آئینہ فولاد کا ہوتا تھا۔ اور موسم باراں میں رنگ آلود ہو جاتا ہے جسے صاف کرنا پڑتا تھا۔ اسے رنگارنگ بھی کہتے ہیں۔ اس شعر میں طوطی کے رنگ کی رعایت سے رنگارنگ لفظ استعمال ہوا ہے۔

شعر کا سادہ اردو ترجمہ یہ ہے:

جو دکھ اور رنج دل کو پہنچتا ہے وہ گفتار میں آکر بڑھ جاتا ہے، ہمارا رنگارنگ ہمارا طوطی آئینہ

بن جاتا ہے۔

شاعر نے دکھی دل کو رنگارنگ کہا ہے۔ اور سخن یا گفتار کو طوطی آئینے سے تشبیہ دی ہے۔ دل آئینے کی طرح ہوتا ہے۔ اور رنجیدہ ہونے پر، گویا رنگ آلودہ ہو جاتا ہے اس کے رنگارنگ آلودہ یا رنگ آلودہ ہونے کی رعایت سے شاعر نے اسے طوطی آئینہ بھی کہہ دیا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دل کو کوئی دکھ پہنچے تو وہ دکھ تلخ فریاد بن کر لب پر آ جاتا ہے۔ گویا یہ رنگارنگ طوطی آئینہ یا طوطی گفتار بن جاتا ہے۔

از گداز یک جہان ہستی، صبحی کردہ ایم

آفتاب صبح محشر، ساغر سرشار ما

صبحی اس شراب کو کہتے ہیں جو صبح سویرے پی جائے۔ ساغر سرشار، ایسا جام ہے جو

مستیوں سے لبریز ہو۔

قیامت کے دن ہستی کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس فناء ہستی کو شاعر نے گداز ہستی کہا ہے اور اسی رعایت سے یہ کہا ہے کہ ہم نے ہستی کے گداز کو صبحی بنا کر پی لیا۔ یہ آفتاب قیامت ہمارا جام سرشار ہے۔

سر گرانیم از وفا و شرمساریم از جفا

آہ از ناکامی سعی تو در آزار ما

سرگراں = مشکبر اور مغرور کو کہتے ہیں اس کا مفہوم بے اعتنا اور بے نیاز کا بھی ہے اور یہاں اسی مفہوم میں آیا ہے۔

معشوق کا شیوہ، عاشق کو آزار پہنچاتا ہے۔ معشوق اور عاشق کے مابین، یا رابطہ و قاہو سکتا یا رابطہ جفا۔

مرزا غالب کہتے ہیں کہ ہم لوگ وفا سے بے نیاز ہیں اور جفا سے ہمیں شرمساری ہوتی ہے کہ ہمیں ممنون احساس فرمایا گیا۔ اب وفا ہو کہ جفا دونوں حالتوں میں محبوب کی آزار رسانی کی کوشش ناکام رہتی ہیں جس کا ہمیں افسوس ہے۔

چاک لا اندر گریبان جہات افکنده ایم

بی جہت بیرون خرام از پردہ پندار ما

اس خیال کو کہ شش جہت میں اس کی ذات کے سوا کوئی موجود نہیں، یوں ادا کیا کہ ہم نے جہات کے گریبان کو لا سے چاک کر ڈالا ہے۔

ذره جز در روزن دیوار نکشود است بار

جنس بیتابی بہ دزدی برده از بازار ما



بارکشودن = بوجھ اتار کر رکھنا

بدزدی بردن = چر کر لے جانا

ذرے فضا میں بے تاب اور سرگرداں رہتے ہیں۔ انھیں کہیں قرار نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ ذرات ایک جگہ اپنا سامان کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور وہ جگہ روزانہ دیوار ہے۔ وہ دیوار کے اندر یعنی مکان میں نہیں ٹھہرتے۔ یقیناً انھوں نے بیتابی کا سامان ہمارے بازار سے چر لیا ہے۔

از نم باراں نشاط گل بد آموز تو شد

گریہ ابر بھاری کردہ آبی کار ما

بارش کے برسنے سے پھولوں کی تازگی اور شادابی نے تجھے غلط سبق پڑھایا۔ ابر بہار کے گریہ نے ہمارے کام پر پانی پھیر دیا۔ یعنی محبوب آمد، بہار سے پھولوں کے نظاروں میں محو ہو گیا اور اس کی توجہ ہماری طرف کم ہو گئی۔ بہار کیا آئی، ہماری خزاں آگئی ہے۔

غالب از صہبای اخلاق ظہوری سرخوشیم

پارہ بیش است از گفتار ما کردار ما

مرزا غالب جن شعراے فارسی سے زیادہ متاثر تھے ان میں ایک ظہوری بھی تھے۔ انھوں نے ان شعرا کی بعض زمینوں میں غزلیں لکھی ہیں جن میں ایک غزل یہ ہے۔ مقطع کا دوسرا مصرعہ ظہوری ہی کا ہے۔

اس مقطع میں مرزا غالب نے اس تاثر کا اظہار کیا ہے۔ جو انھوں نے ظہوری کے افکار

و بیان سے لیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم ظہوری کی مئے اخلاق سے سرشار ہیں۔

ہمارا کردار ہماری گفتار سے کچھ زیادہ ہے۔

”ہمارا کردار ہماری گفتار سے بلند تر ہے“ یہی اخلاقی سبق ہے جو مرزا غالب کو مرغوب ہے۔



## غزل نمبر (۶)

نمی بینیم در عالم نشاطی کآسمان ما را

چو نور از چشم نابینا، ز ساغر رفت صہبا را

شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں ہمیں کوئی ایسی خوشی نظر نہیں آتی جسے آسمان نے ہمارے ساغر شراب سے یوں نہ غائب کر دیا ہو۔ جس طرح ایک نابینا کی آنکھوں سے نور چھن جاتا ہے۔ مرزا غالب کے کلام میں شدید احساس غم پایا جاتا ہے۔ یہ شعرا سی احساس غم کا اظہار ہے ان کا یہ شعر دیکھیے:

جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام

دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

مکن ناز و ادا چندین، دلی بستان و جانی ہم

دماغ نازک من بر نمی تابد تقاضا را

اتنے ناز و ادا سے کام نہ لے۔ دل بھی لے لے اور جان بھی۔ میرا دماغ بڑا نازک

ہے۔ اس سے تقاضا برداشت نہیں ہو سکتا۔



سراب آتش از افسردگی چون شمع تصویرم

فریب عشق بازی می ہم اهل تماشا را

سراب، وہ چمکتی ہوئی ریت جو دور سے پانی نظر آتی ہے۔ مرزا غالب نے اپنے دل کو جو افسردہ ہو گیا، لیکن عشق کا دعوے دار ہے، سراب کو آتش کہا ہے جو آگ کی طرح دکھائی دیتا ہے مگر آگ نہیں، محض سراب آتش ہے فریب نظر ہے اور پھر اس سراب آتش کو شمع تصویر سے تشبیہ دی ہے۔ جو بظاہر شمع نظر آتی ہے مگر اس میں سوز نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں کہ میں افسردہ گی کے ہاتھوں، شمع تصویر کی طرح سراب آتش بن گیا ہوں۔ محض دیکھنے والوں (اہل تماشا) کو عشق بازی کا دھوکا دیتا ہوں۔ اُن کا یہ شعر دیکھیے اسی حالت کی آئینہ داری کر رہا ہے۔

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

من و ذوق تماشای کسی، کز تاب رخسارش

جگر بر تابہ چسپ، آفتاب عالم آرا را

تابہ = تو

دوسرے مصرعے میں را اضافی ہے یعنی جگر آفتاب عالم آرا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں ایسے حسن کے نظارے میں محو ہوں کہ جس کے رخسار کی تابانی اور گرمی سے آفتاب جہاں تاب کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا جگر کسی تپتے ہوئے توے کے ساتھ چسپاں ہو گیا ہے۔

تاب کے لفظ کو بڑی خوبی سے استعمال کیا، اس کا مفہوم تابانی بھی ہے اور پیش بھی۔

تاب اور تابہ کے لفظوں میں تینیں زائد ہے۔

چہ لب تشنه است خاکم، کاستین گرد بادمن

چواشک از چہرہ، از روی زمیں بر چید دریا را

لب تشنه = پیاسا۔ گرد باد = گولا۔

دریا فارسی میں سمندر کے معنوں میں آتا ہے۔

میری خاک کس قدر پیاسی ہے کہ خاک سے اٹھنے والے گولوں کی آستین، روئے زمین سے سمندر کو یوں چوس لیتی ہے جیسے چرے سے آنسو پونچھ لیتے ہیں۔

خیالش را بساطی بھر پا انداز می جستم

پسندیدم بہ مستی مخمل خواب زلیخا را

پا انداز = وہ قالین یا کپڑا جو پاؤں کے نیچے بچھایا جاتا ہے۔ بساط = فرش۔

شاعر نے محبوب کے خیال کو ایک مجسم صورت دی ہے۔ کہتا ہے کہ میں سوچ رہا تھا کہ کون سا فرش پا انداز اس کے خیال کے لیے موزوں ہوگا اور اس سوچ میں کھو گیا اور میں نے زلیخا کے بستر خواب کی مخمل کو پسند کیا۔

مرزا غالب اپنی ندرت بیان سے لفظوں کو نئے نئے معنوی سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ یہاں ”مستی“ کے لفظ میں بڑی بلاغت ہے۔ اور یہی شعر کی جان ہے۔ شاعر کا منشا یہ ہے کہ مخمل خواب زلیخا کو یونہی مستی میں انتخاب کر لیا گیا ورنہ وہ محبوب کے کوئی شایان شان شے نہ تھی۔

دل مایوس را تسکین بہ مردن می توان دادن

چہ امید است آخر خضر، ادریس و مسیحا را



دل مایوس کو مر جانے ہی سے تسکین دی جاسکتی ہے۔ سوچتا ہوں کہ آخر، خضر، اور یس اور مسیح، کس امید پر بیٹھے ہیں۔ ان کی زندگی جاویدانی ہے، کبھی مایوس ہوئے تو کیا کریں گے۔ موت تو آنے کی نہیں۔

بھاران است و خاک از جلوہ گل امتلا دارد

بہ رگ زن نشتر از موج خرام ناز صحرا را

امتلا = لغوی معنی بھر جانے کے ہیں۔ اصطلاح طب میں جوش خون یا زیادتی خون کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر لوگ نشتر سے فصد کھلاتے تھے اور کچھ خون نکل جانے سے، جوش خون کم ہو جاتا تھا اور تسکین ہو جاتی تھی۔

بہار آئی ہے اور زمین (سرخ) پھولوں کے جلووں سے لبریز ہے۔ (گویا اسے امتلا سے خون ہو گیا ہے۔ اور اپنے خرام ناز سے صحرا کی رگ میں نشتر چھو دے تاکہ یہ جوش بہاراں ماند پڑ جائے۔

مطلب یہ ہے کہ محبوب آئے گا تو بہاروں کے جلوے ماند پڑ جائیں گے۔

سرو کارم بود یا ساقی کز تندی خویش

نفس در سینہ می لرزد ز موج بادہ مینا را

مجھے ایک ایسے ساقی سے واسطہ پڑا ہے جس کی تندی خو کے باعث شراب میں لہروں کا جوش ابھرتا ہے اور اس سے صراحی کے سینے میں سانس لرز نے لگتا ہے۔

شراب کی تیزی اور تندی سے اس میں جوش پیدا ہوتا ہے اور لہریں ابھرتی ہیں۔ شاعر نے شراب کے اس جوش کو ساقی کی طرف منسوب کیا ہے گویا یہ اس کی تند طبیعت کا اثر ہے۔

خطی بر ہستی عالم کشیدیم از مرہ بستن

ز خود رفیتم و ہم باخویشتن بر دیم دنیا را

خطا بر چیزی کشیدن = کسی چیز کو کاٹ دینا۔

اس شعر کا پس منظر یہ عقیدہ ہے کہ اس کائنات کا وجود خارجی نہیں بلکہ چنی ہے۔ ہم ہیں تو جہاں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے آنکھ بند کی اور اس سے وجود عالم پر لکیر کھینچ دی۔ یعنی عالم کا وجود ختم ہو گیا۔ ہم اپنے آپ سے گئے اور اپنے ساتھ دنیا کو بھی بھول لے گئے۔

در آغوش تغافل، عرض یک رنگی توان دادن

تھی تا می کنی پھلو، بما بنمودہ جا را

تغافل = ایسی غفلت جو بناؤنی ہو۔

محبوب اپنے عاشق سے غافل نہیں ہوتا لیکن نا بر کرتا ہے کہ غافل ہے اور ارادنا اس سے پہلو تہی کرتا ہے۔ اور اس کا ایسا کرنا ایک ادائے معشوقانہ خیال کیا جاتا ہے۔

اس شعر کا پس منظر متصوفانہ ہے۔ خدا ہمیں نظر نہیں آتا، بظاہر وہ ہم سے الگ رہتا ہے۔ لیکن اس کا الگ رہنا یا ہم سے پہلو تہی کرنا، محض تغافل ہے۔ حقیقت میں وہ ہم میں موجود ہے۔ وہ اور ہم ایک ہیں۔ اسی حالت کو شاعر نے یک رنگی کہا ہے۔ جس میں ”من و تو“ کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں جب معشوق حقیقی ہم سے بظاہر پہلو تہی کرتا ہے تو ہمیں اس کا سرا مل جاتا ہے اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ ہم سے دور نہیں ہمارے آغوش ہی میں ہے۔ محض پہلو تہی کر رہا ہے۔ جو ایک شان معشوقانہ ہے۔

نمی رنجد کہ در دام تغافل می تپد صیدش

نمی دانم چه پیش آمد نگاه بی محابا را



نگاہی مخابا = بے باک نگاہ۔ ایسی نگاہ جو بغیر کسی جھجک کے ڈالی جائے۔

ہمارے محبوب کو ذرا بھی اس بات سے تکلیف نہیں ہوتی کہ اس کا شکار اس کے دام تغافل میں پڑا تڑپ رہا ہے۔ اللہ جانے اس کی بے دھڑک نگاہوں کو کیا ہو گیا ہے اور وہ کیوں غفلت سے کام لے رہا ہے۔

زمین گوی است، کو مجنون، کہ من بدم زمی دانش

غبارم، در نور خود، فرو پیچید صحرا را

گوے = گیند۔

گوئے از میدان برون = جیت جانا۔ چوگان بازی میں حریف سے گیند چھین کر لے جانا، گویا اس سے سبقت لے جانا ہے۔ اسی سے ایک اور محاورہ، گوے سبقت برون ہے۔ اور اردو میں بھی رائج ہے: گوے سبقت لے جانا۔

مجنوں کی صحرا نور دی ضرب المثل ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ زمین ایک گیند ہے۔ مجنوں کہاں ہے؟ اسے بتادو کہ میں اس گیند کو اس سے میدان ہی سے چھین کر لے گیا ہوں۔ یعنی میں صحرا نور دی کی بازی جیت گیا ہوں۔ میری خاک کے گرد و غبار نے صحرا کو اپنی ایک لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور میں نے صحرا نور دی کے تمام مرطے ایک ہی جست میں طے کر لیے ہیں۔

ازین بیگانگیا می تراود، آشنائی ها

حیا می ورزد و در پردہ رسوا می کند مارا

معشوق شرم و حجاب کی وجہ سے بظاہر عاشق سے بیگانگی اور بے رخی برتا ہے لیکن اس کی بیگانگی کا اندازہ ایسا ہے کہ اس سے آشنائی کا رنگ نکلتا ہے اور تازے والے تاز جاتے ہیں۔ چنانچہ جس راز کو وہ چھپانا چاہتا ہے وہ نہیں چھپتا اور ہم اس کے ایسا کرنے سے در پردہ

رسوا ہو رہے ہیں۔

شاعر ”بیگانگی با“ اور ”آشنائی با“ جمع کے الفاظ لایا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ معشوق جتنے بھی مختلف انداز بیگانگی اختیار کرتا ہے وہ سب کے سب آشنائی کے انداز بن جاتے ہیں۔

حذر از زمهریر سینہ آسودگان غالب

چہ منت ها کہ بردل نیست جان ناشکیبارا

زمهریر = فضا میں ایک کرہ سرد ہے جو کرہ ہوا کے وسط میں ہے اور بے حد سرد ہے۔ اسے زمهریر کہتے ہیں۔

زم سردی ہے۔ اسی سے زمستان یعنی موسم سرما مانا ہے زم ہریر، زم اور ہریر سے مرکب ہے۔ معنی ہیں سرد کنندہ۔ قدیم نظریے کے مطابق جب بخارات، سمندر سے اٹھتے ہیں اور اس کرے میں پہنچتے ہیں تو بخمد ہو کر بادل بن جاتے ہیں۔

ایک عقیدے کے مطابق یہ وہ سرد جگہ ہے جہاں کافروں کو شدید سردی کے عذاب میں ڈالا جائے گا۔

آسودگان سے مراد وہ لوگ ہیں جو درد و سوز محبت سے بالکل عاری ہیں۔ مرزا غالب نے ایسے لوگوں کے سینے کو زمهریر سے تشبیہ دی ہے جو سوز محبت سے بالکل خالی ہیں۔

کہتے ہیں غالب ان آسودہ دلوں کے سینے سے دور رہ۔ ان کا سینہ تو زمهریر ہے۔ یہ بدنصیب محبت کی گر جوشیوں کی نعمتوں سے محروم ہیں۔ ہمیں دیکھو، ہم پر محبت کی آگ میں جلنے والی جان بے قرار کے کتنے احسان ہیں یعنی ہم نے سوز عشق سے کیا کیا لذتیں سہی ہیں اور اس سے کتنا فیض حاصل کیا ہے۔

سوز عشق ہی ساز حیات ہے اور اسی سے علم و فن کے چشمے۔ پھونٹتے ہیں۔





## غزل نمبر (۷)

پس از کشتن بہ خوابم دید، نازم بدگمانی را  
 بخود پیچید کہ ہی ہی دی غلط کردم فلانی را  
 اس بدگمانی کے قربان جاؤں، مجھے قتل کرنے کے بعد اس نے مجھے خواب میں دیکھا اور  
 اب خود ہی پیچ و تاب کھارہا ہے، اور کہہ رہا ہے کہ ہائے فلاں آدمی کے قتل کے سلسلے میں مجھ سے  
 اشتباہ ہوا اور میں نے غلطی سے اُسے مار ڈالا۔

دلم بر رنج نابرداری فرہادی سوزد

خداوند! بیامرز آن شہید امتحانی را

رنج نابرداری = دکھ نہ اٹھا سکتا۔

فرہاد کو پہاڑ کاٹنے پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ دراصل اُس کے عشق کا امتحان تھا۔ بقول  
 مرزا غالب وہ اس امتحان میں پورا نہ اتر سکا اور قیشہ مار کر اپنی جان دے دی۔ اسی بنا پر اسے  
 شہید امتحانی کا نام دیا اور کہا کہ اس میں دکھ سہنے کی پوری طاقت نہ تھی۔ ساتھ ہی اس کے حق میں  
 دعا بھی دی۔ فرماتے ہیں، میرا دل فرہاد کے دکھ نہ اٹھا سکنے پر جلتا ہے۔ اے خدا! اس شہید  
 امتحان کو بخش دے۔

در بخت از حسرت دیدار، ورنہ جانی آن دارد

کہ بی رویت، بہ دشمن دادہ باشم زندگانی را

افسوس تیرے دیکھنے کی حسرت رہ جائے گی ورنہ صورت حال کا تقاضا یہی ہے کہ  
 جب تیرا دیدار میسر نہیں آتا تو کاش اپنی زندگی کو دشمن یعنی رقیب کی نذر کر دیتا۔ اس شعر میں  
 جان نذر کر دینا جذبہ ایثار کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ عاشق کو رقیب پر رشک آ  
 رہا ہے کہ وہ محبوب کے دیدار سے فیض یاب ہے اور میں نہیں ہوں۔ چنانچہ کہتا ہے کہ ایسی زندگی  
 رقیب کو دے دوں تو اسے بھی محرومی دیدار کا دکھ ہوا ورنہ مزہ آجائے۔ دیکھوں وہ کیسے ایسی محرومی کی  
 تاب لاتا ہے۔

شعر میں لطیف نکتہ یہ ہے کہ رقیب تاب نہیں لاسکے گا اور اس کے دعویٰ عشق کا بھرم  
 کھل جائے گا۔

سرشتم را بپالودند تا سازند از لالیش

پر پروانہ و منقار مرغ بوستانی را

سرشت = طینت، فطرت۔ لالے = وہ میل جو کسی مانع کے نیچے بیٹھ جائے۔ میری  
 سرشت کو پاک صاف کیا گیا تاکہ اس میں سے جو میل نکلے اس سے پروانے کے پر اور مرغ  
 بوستان (خازن فرہاد) کی منقار بنائی جائے۔

پر پروانہ سوز کی علامت ہے اور منقار مرغ بوستانی، نغمہ خوانی کی۔ یہ دونوں وصف ایک  
 شاعر کے بھی ہیں کہ اس میں سوز دل بھی ہوتا ہے اور سوز بیاں بھی۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ  
 میر سے خمیر فطرت سے پروانے کو پر اور مرغ گلستان کو نغمہ خوانی ملی۔ یہ سب میر سے ہی سوز دل اور  
 خوش نوائی کا اثر ہے۔ یہ شعر دیکھیے:



میں چن میں کیا گیا ، گویا دبستاں کھل گیا  
بلبلیں سن کر میرے نالے غزل خواں ہو گئیں

چو خود را ذرہ گویم، رنج از حرفم زہی طالع  
ز خود می دانم بی مھر، نازم مھر بانی را

جب میں اپنے آپ کو از رہ انکسار ذرہ کہتا ہوں تو وہ خفا ہوتا ہے۔ اور نہیں چاہتا کہ میں ایسا کروں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ وہ بے مہر مجھے عزیزوں میں شمار کرتا ہے۔ (اپنے سے منسوب کرتا ہے) اور مجھے اس کی اس مہربانی پر ناز ہے۔

شعر میں نکتہ یہ ہے کہ اس کا محبوب باوجود بظاہر بے مہر ہونے کے دل ہی دل میں اسے چاہتا ہے۔ اور اسے عزت و احترام سے دیکھتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب غالب اپنے آپ کو حقیر اور ناتواں چیز کہتا ہے تو اس کے محبوب کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ یہی اس کی درپردہ محبت کی دلیل ہے اور یہ واقعی فخر کا مقام ہے۔

پہا لیش جان نشاندن شرمسارم کرد، می دانم  
کہ داند ارزشی نبود متاع را نگانی را

متاع را نگانی = بے فائدہ شے، ایسا سرمایہ جس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو۔ میں اس کے پاؤں پر اپنی جان قربان کر کے شرمندہ ہوا اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ ایک بے فائدہ چیز (یعنی جان عاشق) کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ ایسی حقیر شے کو شمار کر دینا کون سی بڑی قربانی ہے۔ کتنا یہ یہ ہے کہ عام طور پر عشق میں جان دے دینا بہت بڑا ایثار سمجھا جاتا ہے۔ مرزا غالب یہ کہتا چاہتے ہیں کہ جانفشانی تو ایک حقیر قربانی ہے۔

غالب کا اردو میں شعر دیکھئے۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی  
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

فدایت دیدہ و دل، رسم آرایش مہرں از من  
خراب ذوق گل چینی، چہ داند باغبانی را

گل چیں = پھول چننے والا

باغبان = پھولوں کی پاسبانی کرنے والا

گل چینی اور باغبانی دو متضاد عمل ہیں۔ گل چین، چمن کو ایک طرح برباد کرتا ہے۔ اور باغبان اسے سنوارتا ہے۔

میرادل اور میری آنکھیں تم پر فدا ہوں۔ مجھ سے رسم آرایش کے بارے میں مت پوچھ۔ جو شخص گل چینی کے ذوق کا مارا ہوا ہو وہ کیا جانے باغبانی کیا ہوتی ہے۔

”خراب“ کا لفظ فارسی میں رند اور مست کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ اور بد حالی کا بھی۔ اس شعر میں اس لفظ کے دونوں معنوی پہلو پائے جاتے ہیں۔ ”خراب ذوق گل چینی“ کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ شخص جو گل چینی کے ذوق میں سرشار ہوا اور یہ بھی ہے کہ ذوق گل چینی نے جسے بد حال کر دیا ہو۔ چنانچہ انہی معنوی پہلوؤں سے شعر میں خوبی پیدا ہوئی ہے۔

چہ خیزد گر حوس گنج امیدم در دل افشانده

درین کشور روئی نیست نقد شادمانی را

گنج امید میں اضافت تضحیمی ہے یعنی امید جو خزانے کی طرح ہوتی ہے۔ امیدوں سے دل کو راحت ہوتی ہے جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ شعر میں گنج امید سے مراد امیدوں کا مجموعہ ہے۔



شاعر کہتا ہے کہ اگر میری خواہشوں اور تمناؤں نے میرے دل میں ہزار ہا۔ امیدوں کا خزانہ لاکھ ڈال دیا ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے کہ اس دہس میں تو خوشی کے سکے کا کوئی چلن ہی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں خوشی کا وجود ہی نہ ہو یا فضا ہی ناسازگار ہو وہاں امیدوں سے کیا ہوتا ہے۔ اسی خیال کو مرزا غالب نے ایک اردو کے شعر میں یوں ادا کیا ہے۔

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام  
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

نشاط لذت آزار را نازم کہ در مستی

ہلاک فتنہ دارد ذوق مرگ ناگہانی را

مرگ ناگہانی۔ یعنی اچانک موت میں بھی ایک مزہ ہوتا ہے کہ اس سے دکھ نہ رہے کہ مرنے سے نجات مل جاتی ہے۔ لیکن محبوب کے ستم اٹھانے میں لذت ہوتی ہے اور اس سے جو خوشی نصیب ہوتی ہے وہ مرگ ناگہاں میں کہاں۔ چنانچہ غالب کہتا ہے کہ میں تیرے آزار کی لذت اور خوشی پر ناز کرتا ہوں کہ جب یہ لذت اپنی پوری کیفیت پر آتی ہے تو مرگ ناگہانی کا ذوق ماند پڑ جاتا ہے۔

اسے یوں ادا کیا کہ مرگ ناگہانی کی لذت، محبوب کی آزار رسانیوں کے فتنے پر قربان ہو جاتی ہے۔

میرس از عیش نو میدی کہ دندان در دل افشردن

اساس محکمگی با شد، بھیشٹ جاودانی را

دندان در دل افشردن = دانتوں کو دل میں چھونا یعنی انتہائی رنج و الم۔ ناامیدی کے

عیش و نشاط کا الم نہ پوچھ غم میں دانتوں کو دل میں چھو لینا ایسا ہے جیسے بہشت جاودانی کی بنیاد کو مضبوط کرنا۔

ناامیدی میں جو راحت اور فراغت حاصل ہوتی ہے وہ گویا بہشت جاودانی کی راحت ہے۔

سراسر غمزہ ہایت لا جور دی بود و من عمری

بہ معشوقی پرستیدم بلائی آسمانی را

لا جور دی = نیلگوں

چونکہ چرخ لا جور دی کی گردش کے ساتھ ہر طرح کی آفتوں کو منسوب کیا جاتا ہے۔ اور ان کا انداز ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے، اس لیے شاعر نے معشوق کے ناز و انداز کو لا جور دی کہا۔ کہتا ہے کہ تیرے ناز و انداز میں تپا آفت تھے۔ اسی لیے میں عمر بھر آسمان سے ہر نازل ہونے والی بلا کو اس طرح پوچھا رہا جیسے کوئی معشوق ہو۔

بجز سوزندہ اخگر گل نہ گنجدر گیر بایم

بد آموز عتابم، برنتام مہربانی را

میرے گریباں میں، سوائے جلانے والی چنگاری کے کوئی پھول نہیں ساتا۔ میری عادتوں کو معشوق کے عتاب نے بگاڑا ہے۔ میں انداز مہربانی کی تاب ہی نہیں لاسکتا۔

دلم معبود زر دشتت، غالب فاش می گویم

بہ خس یعنی قلم، من دادہ ام آذر فشانی را



زردشت یا زرتشت = پارسیوں یا آتش پرستوں کے پیغمبر کا نام ہے۔ آذر آگ ہے۔ آذر فشانے = آگ برسانا یا چمکانا۔

خس تنکے کو کہتے ہیں جو آگ میں فی الفور جل جاتا ہے۔ مرزا غالب نے اپنے قلم کو خس کہا ہے گویا وہ آسانی بھڑک اٹھتی ہے۔ غالب! میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میرا دل زردشت کا معبود ہے یعنی آگ ہے اور میں نے خس یعنی تم کو آگ برسانے کا کام سپرد کیا ہے۔ یعنی میرے قلم سے شعلے نکلنے لگے ہیں۔



### غزل نمبر (۸)

محو کن نقش دوئی از ورق سینه ما

ای نگاہت، الف صیقل آئینہ ما

الف صیقل = آئینہ پہلے فولا دکا ہوا کرتا تھا۔ برسات میں عام طور پر رنگ آلود ہو جاتا اور اسے صیقل کرنا پڑتا جس آلے سے اسے صیقل کرنے تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی سلاح ہوتی تھی۔ جس کا ایک سرانوکدار اور تیز ہوتا تھا۔ جب صیقل سے آئینے کو صاف کرنے لگتے تو صیقل کی تیز نوک سے جو لکیر آئینے پر پڑتی اسے الف صیقل کہتے تھے۔ الف جو پہلا حرف ہے وحدت کی علامت ہے۔ صیقل کی لکیر کو شکل کے اعتبار سے اور ابتدائے صیقل کے اعتبار سے الف صیقل کہنا بہت موزوں ہے۔

نگاہ بھی لکیر کی طرح ہوتی ہے۔ اسی لیے شاعر نے کہا ہے: اے کہ تیری نگاہ ہمارے آئینے (یعنی آئینہ دل) کا الف صیقل ہے ہمارے سینے سے دوئی کے نقش کو مٹا دے۔

یعنی محبوب کی نگاہ دل کا تزکیہ کر کے اس میں توحید کا نقش جماتی ہے اور اگر کوئی غیر نقش وہاں ہوں تو انھیں بکسر مٹا دیتی ہے۔

وقف تاراج غم تست چہ پیدا چہ نہان

گھجورنگ از رخ ما رفت دل از سینه ما

جو کچھ ظاہر ہے اور جو کچھ پنہاں ہے سب تیرے غم کے ہاتھوں لئے جا رہے ہیں۔ جس طرح ہمارے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے۔ اسی طرح ہمارے سینے سے ہمارا دل غائب ہو گیا ہے۔ چہرے کے رنگ کا اڑنا ظاہر بات ہے اور دل کا سینے سے غائب ہو جانا پوشیدہ بات ہے۔ مرزا غالب نے اس تضاد سے شعر میں حسن پیدا کیا ہے جو اس کے ندرت بیان کی دلیل ہے۔

چہ تماشا ست ز خود رفتہ خویشت بودن

صورت ما شدہ عکس تو در آئینہ ما

اپنے آپ سے کھوجانا بھی عجب شے ہے۔ ترا عکس ہمارے آئینے میں آکر ہماری صورت اختیار کر گیا ہے۔ یعنی ہم نے اپنے آپ کو کھو کر تجھے پالیا ہے۔

عرصہ بر الفت اغیار چہ نگ آمدہ است

خوش فرد رفت بہ طبع تو خوشا کینہ ما

تیری طبیعت میں ہمارا کینہ اس قدر مایا ہوا ہے۔ کہ اب اس میں غیروں کی محبت کے لئے جگہ تنگ ہو گئی ہے۔



اس شہر میں ”چہ“ اور ”خوش“ کے الفاظ بڑے خوب صورت معنوی پہلو لیے ہوئے ہیں۔  
عرصہ چہ جنگ آمدہ است کا مفہوم ہے جگہ کس قدر جنگ ہو گئی ہے اس جملے میں  
”چہ“ سے تحقیر کا پہلو نکالتا ہے۔ ”نوش فرد رفتہ“ یعنی کیا خوب سا گیا ہے۔ یہاں ”خوش“ تحسین  
کے لئے آیا ہے۔

مختم زادہ اطراف بساط عدمیم

گوھر از بیضہ عنقا است بہ گنجیہ ما

عنقا ایک فرضی پرندہ ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ اسی لیے شاعر نے اسے عدم سے  
منسوب کیا ہے۔ بیضہ عنقا اور گوھر میں وجہ شبہ ظاہر ہے۔  
مختم زادہ = صاحب عزت لوگ۔

ہم سر زمین عدم کے عالی خاندان اور ذی اقتدار بانیوں میں سے ہیں۔ بیضہ عنقا  
ہمارے خزانے کا موتی ہے۔ شاعر نے انسان کے وجود کی فنا آمادگی کو کس خوبصورت پیرائے  
میں بیان کیا ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا

میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

نیمت متان ترا تفرقہ بدر و ہلال

بادہ مصحاب بود در شب آدینہ ما

ہلال۔ پہلے دن کا چاند اور بدر ماہ کامل ہے۔

ساغر شراب = ماہ کامل کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن اس میں چاند کی طرح کوئی تبدیلی نہیں

ہوتی، ہمیشہ لبریز رہتا ہے اور بدر کی طرح چمکتا ہے شب آدینہ جمعہ سے پہلی رات ہے چونکہ جمعہ  
کے دن چھٹی ہوتی تھی اس لیے لوگ بڑی فراغت سے بیٹھتے تھے اور رات رنگ رلیوں میں گزار  
تے تھے۔

تیرے مستوں کے لئے ہلال و بدر کا کوئی تفرقہ نہیں کہ آج بدر ہے تو کل ہلال نہ ہو  
جائے۔ ان کا چاند تو ساغر شراب ہے جو ہمیشہ بدر ہی رہتا ہے اور خاص کر جمعہ کی شب کو پورے  
جمال و جلال کے ساتھ چمکتا ہے۔

غالب امشب ہمہ اذ دیدہ چکیدن دارد

خون دل بود مگر بادہ دوشینہ ما

بادہ دوشینہ یا بادہ دوشین، وہ شراب جو گذشتہ رات پی گئی ہو۔ اے غالب شاید ہماری  
بادہ دوشینہ، ہمارا اپنا خون دل تھا کہ آج وہی آنسو بن کر آنکھوں سے سارے کے سارا بہتا چلا جا  
رہا ہے۔

یعنی خوشی کی رات کے چند لمحے پھر غم کی نذر ہو گئے اور شراب، خون کے آنسوؤں میں  
تبدیل ہو گئی۔





## غزل نمبر (۹)

سوز عشق تو پس از مرگ، عیان است مرا

رشتہ شمع مزار از رگ جان است مرا

رشتہ شمع، وہ دھاگایا ڈوری چوموم بتی کے درمیان میں ہوتی ہے۔ اور جس سے وہ جلتی ہے تیرے عشق کی گرمی مرنے کے بعد بھی بدستور قائم ہے۔ اور اس کا ہونا ظاہر ہے۔ دیکھ لو میرے مزار پر جو شمع ہے اس کا دھاگا میری رگ جان ہے اور وہ اسی کے زور پہ چل رہی ہے۔ یعنی یہ شمع مزار میرے ہی سوز عشق سے فروزاں ہے۔

می نگنجم ز طرب در شکن خلوت خویش

حلقہ بزم کہ چشم نگران است مرا

حلقہ بزم = پرانے زمانے میں لوگ محفل میں حلقہ باندھ کر بیٹھتے تھے، وہی حلقہ بزم ہے۔ شاعر نے اسی دائرے کی مناسبت سے اسے چشم نگران سے تشبیہ دی ہے۔

یہ کسی کا حلقہ بزم میری چشم نگران بنا ہوا ہے کہ میں اپنی خلوت گاہ کے گوشے میں بیٹھا خوشی سے پھولا نہیں رہا۔ یعنی محبوب کی محفل طرب کے تصور سے مجھ پر انبساط کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔

ہر خراشی کہ ز رشک تم آفتد بر دل

در سپاس دم تنق تو زبان است مرا

تیری تلواریں کا وار میرے تن پر پڑتا ہے۔ (اور دل اس لذت سے بظاہر محروم رہتا ہے)۔ لیکن رشک سے دل پر بھی چر کے لگتے ہیں اور دل ان رشک کے چرکوں یا زخموں کا بھی

ممنون ہے ہر زخم جودل پر یوں رشک کی وجہ سے لگتا ہے گویا ایک زبان ہے جو تیری تلواریں دھاگے کا شکر یہ ادا کر رہی ہے۔

دل خود از تست و ہم از ذوق خریداری تست

این همه بحث کہ در سود و زیان است مرا

دل تیرا ہی ہے اور یہ جو میں اس دل کے بارے میں سود و زیان کی بحث کرتا ہوں یہ بھی اس لذت کی وجہ سے ہے جو تیری خریداری میں بحث کرنے سے مجھے حاصل ہوتی ہے۔

جوئی از بادہ و جوئی ز غسل دارد خلد

لب لعل تو ہم این است و ہم آن است مرا

جنت میں ایک شراب کی نہر ہے اور ایک شہد کی۔ ہمارے لیے تیرے سرخ لب ہی شراب کی نہر اور شہد کی نہر ہیں۔

چون پری زاد کہ در شیشہ فروش آرند

روئی خوبت بہ دل از دیدہ نھان است مرا

اس پری زاد کی طرح جسے شیشے میں اتارا جاتا ہے، تیرا حسین چہرہ میرے دل میں نمایا ہوا ہے اگرچہ آنکھوں سے نہاں ہے۔

بہ تنگ و تاز من افزود گسستن یک دست

در رھست رشتہ امید عنان است مرا

لگام نوٹ جائے تو گھوڑا سر پٹ دوڑنے لگتا ہے۔ مرزا غالب نے رشتہ امید کو لگام



سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں: رشید! امید میرے لیے عنان ہے کہ اس کے یکسر ٹوٹ جانے سے میری دوڑ دھوپ میں اضافہ ہو گیا۔ یعنی ناامیدی سے میری جدوجہد میں فرق نہیں آیا بلکہ امید کا رشتہ ٹوٹنے سے محبت کی راہ میں میری رفتار اور بھی بڑھ گئی ہے گویا جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

بی خودی کردہ سبک دوش فراغتی دارم

کوہ اندودہ رگ خواب گران است مرا

بے خودی نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا اب مجھے پوری فراغت حاصل ہے اب تو غم کا پہاڑ میرے لیے بھاری نیند بن گیا ہے۔ یعنی طبیعت کو غموں سے نجات مل گئی ہے۔

خارھا از اثر گرمی رفتارم سوخت

مختی بر قدم راہروان است مرا

میری چیز رفتاری کے اثر سے راہ کے کانٹے جل گئے ہیں۔ آنے والے رہبر و ہوں کے قدموں پر میرا بہت بڑا احسان ہے۔ یعنی میں نے آئندہ آنے والوں کی رہنمائی کی ہے۔

رہرو تفتہ در رفتہ بہ آبم غالب

توشہ بر لب جو ماندہ نشان است مرا

میں ایک جلا ہوا پیا سا مسافر ہوں جو پیاس کی شدت کی تاب نہ لا کر پانی میں ڈوب گیا ہو۔ میری زار و راہ (توشہ راہ) جو کنارے پہنچ رہی ہے وہی میرے وجود کا پتہ دیتی ہے۔ کہ کبھی میں تھا۔



## غزل نمبر (۱۰)

آشنایانہ کشد خار رھت دامن ما

گوئی این بود ازین پیش بہ پیراھن ما

تیری راہ کا کاٹنا، ہمارے دامن کو آشنا کی طرح کھینچتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کبھی ہمارے پیراہن میں تھا۔ مقصود یہ ہے کہ راہ عشق میں خلش خار ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ ایسے تلخ تجربات ہماری فطرت کا جز بن چکے ہیں۔

بی تو، چون بادہ کہ در شیشہ ہم از شیشہ جداست

نبود آمیزش جان در تن ما با تن

جس طرح شراب مراچی میں رہ کر بھی، مراچی سے جدا رہتی ہے اسی طرح تیرے فراق میں، ہماری روح ہمارے جسم میں ہے لیکن ایسے جیسے اس کا جسم سے کوئی علاقہ نہیں۔ فراق کے انتہائی درد و کرب کی حالت کو یوں بیان کیا ہے گویا انسان میں جان ہی ہے۔

سایہ و چشمہ بہ صحرا دم عیشی دارو

اگر اندیشہ منزل نشود رھزن ما

بیابان میں سائے اور چشمے کا وجود، عیش و نشاط کی کیفیت پیدا کرتا ہے بشرطیکہ وہاں منزل کا خیال انسان کا رہزن نہ بن جائے۔ مرزا غالب نے ایک اور شعر میں اسی طرح کے خیال



کو یوں ادا کیا:

اگر بہ دل نہ خلد ہر چہ از نظر گذرد  
خوشا روانی عمری کہ در سفر گذرد  
وہ زندگی جو سفر میں گزرتی ہے۔ بہت خوب ہوتی ہے اگر نظر سے گزرنے والی چیزیں  
دل ہی میں کھب کے نہ رہ جائیں۔

تا رود شکوہ تیغ ستم آسان از دل

بخیہ بر زخم پریشان فتد از سوزن ما  
عاشق معشوق کی تیغ ستم کے زخم سلواتا ہے لیکن جب سوئی سے ان زخموں کو بخیہ کیا  
جاتا ہے تو وہ بخیہ بکھرا بکھرا ہوتا ہے۔ وہ اس لیے کے تیغ ستم کے زخم سہنے سے جو شکایت عاشق  
کے دل میں پیدا ہوئی ہے وہ باسانی ان نیم سلے اور نیم کشادہ زخموں سے نکل جائے۔  
مقصود شاعر یہ ہے کہ عاشق کو معشوق کے ستم کا شکوہ نہیں ہوتا اور اگر وہ شکوہ کرتا بھی  
ہے تو محض اوپر ہی دل سے کرتا ہے۔

دوست با کینہ ما مھر نھان می ورزد

خود ز رشک است اگر دل برد از دشمن ما

اگر ہمارا محبوب ہم سے (بظاہر) کینہ رکھتا ہے تو اس کے اس کینے میں ایک پوشیدہ  
محبت بھی ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ جو رقیب سے دل چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ہم سے  
عداوت کی وجہ سے نہیں کر رہا بلکہ اسے اس بات کا رشک ہے کہ میرے حسن کا گردیدہ ایک ہی  
کیوں ہو اور بھی کیوں نہ ہوں۔

می پرد مور مگر جان بہ سلامت بہر د

تا چہ برق است کہ شد تا مزد خرمن ما

بکلی گرتی ہے تو غلے کی ڈھیروں (خرمن) کو جلا دیتی ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ یہ  
برق کیا ہے جسے ہمارا خرمن جلانے پر مامور کیا گیا ہے۔ یہ دراصل چیونٹی ہے جسے پر لگ گئے ہیں  
اور وہ اڑ رہی ہے کہ پرواز کر کے اور جان بچا کے کسی طرف نکل جائے۔

مرزا غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ برق ہمارے خرمن کو کیا جلانے گی وہ تو خود اپنا آپ  
بچائے پھرتی ہے۔

دعوی عشق زما کیست کہ باور نہ کند

می جھد خون دل ما ز رگ گردن ما

کون ہے جو ہمارے دعوے عشق کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہمارے دل کا خون تو ہماری گردن  
کی رگوں سے اچھل اچھل کے باہر آ رہا ہے۔ یعنی ہم تو سرتاپا تسلیم و رضا ہیں اور عشق کی راہ میں  
اپنے خون کا ہر قطرہ بہا دینے کے لیے آمادہ ہیں ہمارے دعوے عشق کو کون جھٹلا سکتا ہے؟

خن ما ز لطافت پذیرد تحریر

نہ شود گرد نمایان ز رم تو سن ما

تو سن = گھوڑا رم تو سن = گھوڑے کی دوڑ یا تیز رفتاری

ہماری باتیں اتنی لطیف ہیں کہ تحریر کی صورت میں نہیں آ سکتیں۔ ہمارے افکار کا گھوڑا  
جب دوڑتا ہے تو اس سے کوئی گرد و غبار نہیں اٹھتا۔

مرزا غالب اپنے شعر میں ایسے افکار لطیف کی بات کر رہے ہیں جو کسی طرح سے اظہار



بیان میں نہیں سہکتے۔

طوطیان را نبود ہرزہ جگر گون منقار

خوردہ خون جگر از رشک خن گفتن ما

جگر گون = سرخ

طوطیوں کی چونچ یونہی سرخ نہیں ہوتی۔ وہ ہماری شیریں بیانی کے رشک سے اپنا خون جگر پیتے ہیں اسی لیے چونچیں خون آلود ہیں یعنی سرخ ہیں۔

ما نبودیم بدین مرتبہ راضی غالب

شعر خود خواہش آن کرد کہ گردد فن ما

غالب ہم تو اس (بلند) منصب کے لئے آمادہ نہیں تھے، شاعری نے خود خواہش کی کہ

ہمارا فن بن جائے۔

فن کی عظمت و فنکار کی عظمت سے ہوتی ہے۔ غالب نے فن شعر کو عظمت دی ہے اور

اس کا یہ کہنا کہ ہم کو تو شاعر ہونا گوارا نہیں تھا۔ فن نے خود اپنے آپ کو ہم سے منسوب کرنا چاہا تو نہ کوئی تعالیٰ نہیں بلکہ عین حقیقت ہے۔



## غزل نمبر (۱۱)

نقشی ز خود براہ گذر بستہ ایم ما

بر دوست راہ ذوق نظر بستہ ایم ما

نقش بستن = نقش بنانا

راہ پر کسی بستن = کسی کا راستہ روک لینا یا بند کر دینا۔ ہم نے (ہر) راہ گذر پر اپنا نقش

چھوڑا ہے اور اپنے دوست کے لیے ذوق نظر کی راہ بند کر دی ہے۔

یعنی ہم جدھر سے بھی گزرتے ہیں وہاں اپنی یاد کا کوئی نہ کوئی نقش چھوڑا ہے۔ اب

ہمارا محبوب جس شے پہ بھی نظر ڈالے گا وہاں ایسے نقش ہوں گے جن سے اسے ایک تلخ

احساس ہوگا کیونکہ اس میں ان کی بے وفائیوں کی داستان بھی ہوگی اور وہ یقیناً ذوق نظر سے

محروم رہے گا۔

بایندہ خود این ہمہ سختی نمی کنند

خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما

اپنے بندے کے ساتھ اتنی سختی نہیں کی جاتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم نے اپنے

آپ کو زبردستی تم سے وابستہ کیا ہوا ہے۔ اور اسی لیے مورد عتاب ہیں۔

اس شعر کے کوہندہ و مولای یعنی انسان اور خدا کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔

غالب کے یہ شعر سامنے رکھیے اور پھر دیکھیے کہ اس شعر کا اور ہی لطف ہوگا۔



زندگی اپنی جو اس رنگ میں گزری غالب  
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے  
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

دل مشکل و دماغ و دل خود نگاہدار  
کاین خود ظلم دود و شرر بستہ ایم ما

دود و شرر = دھواں اور چنگاریاں

مرزا غالب نے اپنے دل کو دود و شرر کا ظلم کہا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے دل کو دل نہ سمجھ۔ یہ دھوئیں اور آگ کا ظلم ہے اسے توڑے گا تو اس میں دھواں اٹھے گا اور تیرے دماغ کو پریشان کرے گا اور چنگاریاں ابھر سکیں گی۔ تو تیرے دل کو جلا نہیں گی۔ اس لیے اپنے دماغ اور دل کو بچالے اور ہمارے دل کو نہ توڑ۔

بر روی حاسدان در دوزخ کشودہ رشک

از بھر خویش جنت در بستہ ایم ما

”جنت در بستہ = وہ جنت جس کے دروازے بند ہوں اور وہاں کسی کا گزرنہ ہو۔

ہم اپنی ذات میں ایک جنت ہیں، ایسی جنت کہ جس کے دروازے بند ہیں اور کوئی غیر وہاں نہیں آ سکتا۔ ہماری اس حالت کو دیکھ کر حاسد لوگ رشک سے جل رہے ہیں۔ ان کی یہ کیفیت ہے جیسے دوزخ کا دروازہ ان کی طرف کھلا ہوا ہو۔

دوزخ اور جنت، کشادہ اور بستہ، یہ الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہیں جس سے اس شعر

میں صنعت تضاد آگئی ہے اور وہ لطف دے رہی ہے۔

فرمان درد تا چہ روائی گرفتہ است

صد جا چوئی بہ نالہ کمر بستہ ایم ما

تیرا فرمان درد ہر جگہ پہنچا ہوا ہے اور ہر جگہ اس کا چرچا ہے۔ چنانچہ ہم جہاں بھی جاتے ہیں نئی کی طرح فریاد پر کمر باندھ لیتے ہیں۔

”صد جا“ لفظی معنی سو جگہ مقصود کثرت جا ہے۔

سوز ترا روان ہمہ در خویشمن گرفت

از داغ تھمتی بہ جگر بستہ ایم ما

عشق کا اثر صرف اتنا نہیں ہوتا کہ جگر پر کوئی داغ یا دل پر کوئی زخم لگ جائے۔ عشق انسان کے رگ وریشے اور روح میں سرایت کر جاتا ہے۔ چنانچہ مرزا غالب کہتے ہیں:

تیرے سوز عشق کو ہماری روح نے یکسر سمولیا ہے۔ ہم نے جگر پر داغ عشق کے ہونے کی تہمت لگائی ہے۔

گوئی وفا ندارد اثر، ہم بما گرای

زین سادگی کہ دل بہ اثر بستہ ایم ما

تیرا یہ خیال ہے کہ وفا کا کوئی اثر نہیں ہوتا، چلو یونہی سہی مگر ہماری سادگی دیکھ کہ ہم اثر پر دل جمائے ہوئے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وفا کا اثر ہوتا ہے۔ ہماری اس سادگی ہی کی خاطر ہماری طرف مائل ہو جا۔



شعر میں نکتہ یہ ہے کہ محبوب مائل ہوگا تو یہ سمجھ لیجئے کہ وفا کا اثر ہو کے رہا۔

تا در وراع خویش چه خون در جگر کنیم

از کوئی دوست رختِ سفر بستہ ایم ما

خون در جگر کردن = انتہائی قلق کی حالت۔

رختِ سفر بستن = سفر کی تیاری کرنا۔ رخت = سفر ہونا۔

کوچہ یار سے رخت ہونا کم غم انگیز نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے آپ سے رخت ہو رہا ہو۔ یہ انتہائی درد و رنج و قلق کی بات ہے۔ ایک طرح سے عالم نزع ہے۔

ھر جا ست ناله همت ما حق گذار اوست

حرزی بہ بال مرغ سحر بستہ ایم ما

حرز = تعویذ، جو بالعموم نظریہ سے بچنے کے لیے باندھا جاتا ہے۔

مرزا غالب کہتے ہیں، جہاں کہیں بھی کوئی فریاد کرنے والا ہے۔ ہماری ہمت اس کی حق گزار ہے۔ یعنی ہماری فریاد کرنے کی ہمت، اس کی ہمت فریاد کی داد دیتی ہے۔ مرغ سحر، صبح کو اٹھ کر فریاد کرتا ہے چنانچہ ہم نے اس کے پروں میں تعویذ باندھ دیا ہے کہ اسے نظر بد نہ لگے اور وہ بونہی فریاد کرتا رہے۔

یہی حق گزاری کی دلیل ہے۔

ازخوانِ نطقِ غالبِ شرین سخن بود

کاین مایہ زلہ حائی شکر بستہ ایم ما

این مایہ = اتنے

زلہ = وہ کھانے کی چیزیں، خصوصاً مٹھائی وغیرہ، جو لوگ رسماً دعوتوں سے اٹھالیتے

ہیں اور گھر لے جاتے ہیں۔ اسی سے، زلہ برادر کا لفظ بنا ہے یعنی زلہ سیٹنے والا۔

زلہ کے ساتھ بستن کا مصدر آتا ہے۔ تو اس کا مفہوم زلہ سیٹنے والا ہوتا ہے مرزا غالب

کہتے ہیں کہ ہم نے جو شیرینیوں کے اتنے ڈھیر سمیٹ لیے ہیں یہ غالب شیریں سخن کی شیریں بیانی کے دسترخوان سے لیے ہیں۔

غالب کے کلام میں شیرینی کی فراوانی کو دکھانا مقصود ہے۔



## غزل نمبر (۱۲)

در گردِ غربت آئینہ دارِ خودیم ما

یعنی ز بی کسانِ دیارِ خودیم ما

پرانے زمانے میں متول گھرانے کی عورتیں جب اپنی آرائش کرتی تھیں تو ایک ملازم

عورت بال سنواری اور عازہ وغیرہ ملتی، وہ مشاطہ کہلاتی۔ ایک اور عورت سامنے آئینہ لے کر بیٹھتی

وہ آئینہ دار کہلاتی۔ پھر مجازاً آئینہ دار کے معنی عکس ہو گئے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ شاعر کا کلام اس کی

زندگی کا "آئینہ دار" ہوتا ہے، یعنی اس میں اس کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔

گردِ غربت = دشتِ غربت میں جو گردِ غبار اٹھتا ہے مجازاً مسافری میں بے کسی کی

حالت اور اس کی کوفتیں۔

مرزا غالب اپنی بے کسی کی حالت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ مسافری یا گردِ غربت میں



بھی ہمیں اپنی ہی حالت کا عکس نظر آتا ہے ہم اپنے وطن کے بیکسوں میں سے ہیں۔ وطن میں بھی بے کس تھے اور غربت میں آکر بھی ہمیں اپنی بے کس کی صورت دکھائی دی۔

مرزا غالب کا یہ اردو شعر بھی اسی حالت کی آئینہ داری کرتا ہے۔

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب  
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

دیگر ز سازِ بیخودی ما صدا مجوی

آوازی از گسستن تارِ خودیم ما

اب ہمارے سازِ بیخودی سے کسی قسم کی صدا ابھرنے کی توقع نہ کر۔ ہم اپنے ساز (ہستی) ہی کے تار ٹوٹنے کی آواز ہیں۔

ہم بے خودی کے عالم میں ہیں اور اپنے آپ کو بھول چکے ہیں اب۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی

کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ایک آواز ہے جو آتی ہے اور وہ ساز کے ٹوٹنے یعنی بیخودی کے طاری ہونے کی آواز

تھی۔ اب تو بے خودی کا سناٹا ہے۔

ہم ہیں اپنی شکست کی آواز

از بسکہ خاطرِ ہوس گلِ عزیز بود

خوں گشتِ ایم و باغ و بہارِ خودیم ما

ہماری طبیعت کو پھولوں کی شدید خواہش تھی۔ اسی خواہش کی خاطر ہم خود خون ہو گئے

اور اپنے ہی باغ و بہار بن گئے۔

یعنی پھول میسر نہ آئے اور آرزوے گلِ خون ہو گئی اور اب حسرتوں کے پھول سجائے بیٹھے ہیں۔

ما جملہ وقف خویش و دل ما زما پڑست

گوئی ہجوم، حسرت کارِ خودیم ما

ہم سرتاپا اپنے لیے وقف ہو چکے ہیں۔ ہمارا دل ہم سے ہی پڑ ہے۔ زندگی میں کام کرنے کی بڑی آرزوئیں تھیں۔ کوئی آرزو پوری نہ ہوئی۔ البتہ کاموں کے کرنے کی حسرتیں رہ گئیں۔ اور اب ان حسرتوں کا ہجوم ہے اور ہم ان حسرتوں میں کھوئے بیٹھے ہیں۔

از جوشِ قطرہ گچھو سرشک آبِ گشتِ ایم

اما ہمہ بہ جیبِ کنارِ خودایم ما

جوشِ قطرہ = دریا کے موج سے قطرہ ابھرتا ہے اور ایک انفرادی وجود حاصل کرتا ہے۔ اور پھر دریا سے جالمتا ہے۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔

جیب و کنار سے مراد یہاں گریباں اور دامن ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں بہتے ہیں تو گریباں اور دامن میں گرتے ہیں۔

مرزا غالب کہتے ہیں کہ ہم بھی جوشِ قطرہ لے کر ابھرے اور ایک آنسو کی طرح ابھرے اور پانی بن گئے لیکن اپنے ہی گریباں اور دامن میں گر پڑے۔

مراد یہ ہے کہ قطرہ جوش میں آتا ہے اور سمندر تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اور مقصدِ حیات کو پالیتا ہے۔ لیکن ہمارا وجود ایک آنسو کی طرح، ابھرتا تو در کنار، ندامت کے باعث پانی پانی ہو گیا ہے۔ اور اپنے ہی گریباں و دامن سے لپٹ کے رہ گیا ہے۔



مشت غبارِ ماست پراگندہ سو بسو

یارب بدھر در چہ شمار خو دیم ما

ہمارا وجود ایک مشت غبار ہے جو ہر طرف بکھرا ہوا ہے آخر اے خدا ہمارا وجود کس شمار میں ہے یعنی ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے۔

با چون توئی معاملہ بر خویش منت است

از شکوہ تو شکر گزار خودیم ما

تیرے جیسے کے ساتھ وابستہ ہونا گویا اپنے آپ پر احسان کرنا ہے۔ یہ جو محبت میں ہم تجھ سے گلے شکوے کرتے ہیں۔ درحقیقت ہم اپنا شکر ادا کر رہے ہیں۔ تو مہربان ہو یا نا مہربان، تجھ سے منسوب ہونا ہی بہت بڑی بات ہے۔ دراصل اس شعر کا خطاب خالق ازلی سے ہے اور یہ رنگ غزل کے تقریباً باقی تمام شعروں میں پایا جاتا ہے۔

روی سیاہ خویش ز خود ہم نہفتہ ایم

شمع خموش کلبہ تارِ خودیم ما

شمع خموش = بجھی ہوئی شمع

کلبہ تار = اندھیرا گھر

شعر کا سادہ اردو ترجمہ یہ ہے:

ہم نے اپنا سیاہ چہرہ اپنے آپ سے بھی چھپا رکھا ہے۔ ہم اپنے اندھیرے گھر کی بجھی ہوئی شمع ہیں۔

تاریک گھر میں ایک بجھی ہوئی شمع کو دیکھ کر یوں احساس ہوتا ہے کہ گویا شمع اپنا چہرہ

چھپائے بیٹھی ہے اور اس طرح چھپ کر بیٹھنے کی وجہ یہ ندامت ہے کہ وہ گھر کو روشن نہ کر سکی۔ مرزا غالب نے اس شعر میں ایک ایسے انسان کی تصویر کھینچی ہے جو اپنے مقصد حیات کی تکمیل میں نا کام رہا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے شمع خاموش کا استعارہ، محاکاتی رنگ میں بڑی فی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے جو ان کی ندرت بیان کی دلیل ہے۔

درکار ماست نالہ و ما در ہوای او

پروانہ چراغ مزارِ خودیم ما

ہمیں نالہ و فریاد کی ضرورت ہے اور حالت یہ ہے کہ ہم اس کی محبت کی دھن میں اپنے چراغ مزار کا پروانہ بن گئے ہیں۔

ایک چراغ محفل میں جلتا ہے اور محفل کی رونق کا باعث ہوتا ہے اور ایک دیا مزار پہ جلتا ہے اور ایک حسرت ناک منظر پیش کرتا ہے۔ اسی طرح ایک پروانہ چراغ محفل پہ گر کر جان دیتا ہے اور ایک چراغ مزار پر جلتا ہے ذرا اس دوسرے پروانے کو دیکھیے کہ اس کے جلنے کی حالت کتنی حسرت ناک ہے کہ اس کا دیکھنے والا بھی کوئی نہیں خاموشی ہی سے جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

مرزا غالب نے اپنے آپ کو ایسے ہی پروانے سے تشبیہ دے کر اپنی حالت کو بیان کیا ہے کہ محبت میں جل گئے۔ لیکن چراغ مزار کے پروانے کی طرح جل گئے۔

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا

آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

خاک وجودِ ماست بہ خونِ جگر خمیر

رنگینی قماشِ غبارِ خودیم ما

قماش = لباس، اور گھر کے ساز و سامان کو بھی کہتے ہیں۔



تماش غبار = لباس خاکی

ہمارا وجود خاکی ہے اور اس میں ہمارے خون جگر کی آمیزش ہے، (اور خون جگر سے) ہم نے اپنے لباس خاکی کو رنگینی عطا کی ہے۔ یعنی ہم نے اپنے خون جگر سے اپنی زندگی کو سنوارا ہے۔

ہر کس خبر ز حوصلہ خویش می دہد

بدستی حریف و خمارِ خودیم ما

بدستی = نشہ

خمار = نشے کے اترنے یا نشے کے پورا نہ ہونے کی حالت مستی اور خمار دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

حریف، ہم پیشہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہم پیشہ لوگ ایک دوسرے کے دوست بھی ہوتے ہیں اور مقابل بھی۔ اس لیے حریف کا لفظ دونوں مفہوم دیتا ہے۔ اس شعر میں حریف مقابل، یا رقیب کے لیے آیا ہے۔

ہر شخص سے اس کے ظرف کا پتا چل جاتا ہے۔ ہم اپنے رقیب کے لیے بدستی کا سامان ہیں اور اپنے لیے خمار کا۔ یعنی رقیب کم ظرف ہے۔ محبوب کی ادنیٰ توجہ اسے مدہوش کر دیتی ہے۔ ہم ہیں کہ اس کی ہزاروں نوازشوں سے بھی جی نہیں بھرتا۔ ہمیشہ خمار کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔ غالب ہی کا شعر ہے۔

بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی

جو تو دریائے نئے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

بیدل کہتے ہیں

ہمہ عمر با تو قدحِ زودیم و نہ رفت رنجِ خمار ما

چہ قیامت کی نہی رسی ز کنار ما بکنار ما

تارِ نگاہ پیرو ما سلک گوہر است

رفتارِ پایِ آبلہ دارِ خودیم ما

شاعر نے آبلوں کو گوہر سے تشبیہ دی ہے۔

ہمارے پیرو یعنی ہمارے پیچھے آنے والوں کی نظریں، موتیوں، کی لڑیاں بن گئی ہیں۔ ہم اپنے آبلہ دار پاؤں کی رفتار ہیں۔

عاشق راہ وفا میں تیز تیز چلا جا رہا ہے۔ اور اس تیز رفتاری سے اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ لیکن اس کی رفتار میں فرق نہیں آیا۔ اس کے پیچھے آنے والوں کی نظریں اس کے پاؤں کے آبلوں پر مسلسل پڑ رہی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ آبلے جو موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ ان لوگوں کی نظروں میں پردے جارہے ہیں اور ان کی نگاہیں گویا موتیوں کی لڑیاں بن گئی ہیں۔ یعنی عاشق کی تیز رفتاری، پیچھے آنے والوں کو مسحور کر رہی ہے۔ اور وہ اسی دھن میں اس کی پیروی پر مجبور بھی ہیں اور خوش بھی ہیں، کشاں کشاں چلتے جا رہے ہیں۔

غالب چو شخص و عکس در آئینہ خیال

با خویشتن یکی و دو چار خودیم ما

اے غالب! یہ دنیا عالم خیال ہے۔ اس میں جو کچھ ہمارے رو برو ہے وہ ہم سے الگ

نہیں جس طرح آئینہ دیکھنے والا اور اس کا عکس، ہر چند کہ ایک دوسرے کے مقابل نظر آتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت ایک ہی ہوتے ہیں الگ الگ نہیں ہوتے۔





## غزل نمبر (۱۳)

بہ شغل انتظار مہوشان در خلوت شبہا

سر تار نظر شد رشتہ تبیع کوکبہا

لغت:- مہوشان = چاند جیسے، مراد معشوق

”کوکب ہا“۔ ستارے۔

ترجمہ: راتوں کی تنہائیوں میں معشوقوں کے انتظار میں مشغول ہونے سے ہمارا تار نظر ستاروں کی تبیع کا دھاگہ بن گیا ہے۔

حل: عشاق کا انتظار کی راتوں کو تارے گن کر گزارنا معروف ہے۔ یہاں اسی خیال کو ایک بلیغ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ عاشق کی نظر کا مسلسل ایک ستارے سے اٹھ کر دوسرے ستارے پر پڑنا، ایسا ہے کہ ستارے تبیع کے دانوں کی طرح ایک ہی لڑی میں منسلک ہو رہے ہیں۔ (اس اعتبار سے) مہوشان کا لفظ یہاں نہایت موزوں ہے۔

بروی برگ گل تا قطرہ شبنم نہ پنداری

بہار از حسرت فرصت بدندان میگذر لبہا

لغت:- تا بمعنی ز نہار

ترجمہ: پھول کی پتیوں پر جو پانی کے قطرے نظر آ رہے ہیں۔ ہرگز انھیں قطرات

شبنم نہ سمجھنا یہ تو بہار اپنی کم فرصتی سے رنجیدہ ہو کر (کبیدہ خاطر ہو کر) حسرتاک انداز میں، دانتوں سے اپنے لب کاٹ رہی ہے۔

بدنماں لب گزیدن انتہائے رنج و حسرت کی علامت ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ وہ قطرات شبنم، اصل میں بہار کے دانت ہیں جن سے وہ لب کو کاٹ رہی ہے۔ کیونکہ اسے اپنی ناپائنداری کا احساس ہے۔ گویا دنیا کا بخش کسی آئندہ غم کا پیش خیمہ ہوتا ہے اس کا فانی ہونا اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس شعر میں صنعت حسن تعلیل ہے۔ (شاعر جب کسی اصل واقعہ کی توجیہ کرتا ہے تو اس کی کوئی حسین سی علت بیان کرتا ہے تو وہ حسن تعلیل ہے۔

بہ خلوت خانہ کام نہنگ لازم خود آ

ستوہ آور دل از ہنگامہ غوغای مطلب ہا

لغت:- ”کام نہنگ“ = مگر چھ کا حلق ”ستوہ آمدن“ = عاجز آنا۔ تنگ آنا

”مطلب ہا“ = مجازاً خود غرضیاں ”لا“ = نہیں۔ فنا

ترجمہ: حل: اہل جہاں کی خود غرضیوں کے شور و غوغا سے دل تنگ آ گیا ہے پس میں نے اپنے آپ کو لاکے کام نہنگ میں ڈال دیا ہے۔ یعنی اپنی آرزوؤں کو خیر باد کہہ دیا ہے اور یہی مقام سکون و عافیت ہے۔ انگلستان کے مشہور ادیب کارلائل کا خیال ہے کہ اپنی خواہشات کو صفر بنا دو تو دنیا تمہارے اختیار میں ہوگی۔

کند گر فکر تعمیر خرابی ہائی ما گردون

نیابد خشت مثل استخوان بیرون ز قالب ہا

لغت: ”قالب“ اجسام، تعمیر ہا۔

ترجمہ: حل: اگر آسمان ہماری بربادیوں کی تعمیر کی کوشش کرے تو جس طرح تن سے



ہڈیاں باہر نہیں نکل سکتیں اسی طرح ہماری تعمیروں (اجسام) سے ایک ہڈی بھی باہر نہیں نکل سکتی۔  
تعمیر خرابی ہاں سے ایک تو مراد ہے بربادیوں کی تلافی کرنا اور دوسرے بربادیوں کی تکمیل کرنا۔  
بہر حال شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہماری بربادیاں انتہا کو پہنچ چکی ہیں۔ اس شعر کے ساتھ مرزا غالب  
کے اس شعر کو بھی ملحوظ رکھیے:

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا  
کرید تے ہو جواب را کہ جستجو کیا ہے

خوشا بی رنگی دل، دستگاہ شوق را نازم

نمی بالند بخولیش ایں قطرہ از طوفانِ مشربِ ہا

لغت: ”دستگاہ“ سرمایہ۔ ”بے رنگی“ ہر طرح کے خارجی اور مصنوعی رنگ سے عاری  
ہونا۔ ”شوق“ عشق و محبت ”نمی بالند“ نہ پھولتا۔

ترجمہ وصل: شاعر دل کے لیے قطرہ کا استعارہ لایا ہے۔ تلاشِ حق یا جستجو حقیقت  
جاری ہے۔ اس تلاش و جستجو کے مختصر مسلک اور مشرب یعنی طریقے ہیں اور اتنے زیادہ ہیں گویا  
ایک طوفانِ پیا ہے۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ میرے دل کی بے نیازی دیکھو اس نے اپنے پہ کوئی رنگ  
چڑھنے نہیں دیا۔ وہ دستگاہ شوق یعنی حق تعالیٰ یا حقیقت کی محبت ہی میں سرسار ہے اور اس عشق و  
محبت کی دولت پہ نازاں ہے۔ اسی نے اس قطرے، یعنی دل کو بے رنگ رکھا اور اس میں کسی  
طرح کا مصنوعی غرور و نخوت کا رنگ نہیں آنے دیا۔

ندارد حسن در ہر حال از مشاطگی غفلت

بود تہ بندی خط، سبزہ خط در تہ لب ہا

لغت: ”تہ بندی“ رنگریز لوگ جب کپڑے پر کوئی اور رنگ چڑھاتے ہیں جس سے  
اصلی رنگ خوب نکھر کے آتا ہے اور پختہ ہوتا ہے تو پہلا رنگ ”تہ بندی“ کہلاتا ہے۔  
تہ بندی خط کی ترکیب میں خط گویا ”خط و خال“ ہے جو مشاطگی یا آرائش کے وقت  
سنوارے جاتے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ حسن کسی حالت میں بھی آرائش سے غافل نہیں ہوتا۔ چنانچہ سبزہ خط  
کے ظاہر ہونے پر بھی آرائش کا پہلو موجود ہے۔ لبوں کے نیچے سبزہ خط ظاہر ہو چکا ہے لیکن یہ سبزہ  
خط، تہ بندی کا کام دے رہا ہے۔ اس سے حسن کے خط و خال خوب نکھرے ہیں۔ گویا حسن ہر  
حالت میں اپنا جو بن دکھاتا ہے۔

خوشا رندی و جوش زندہ رود و مشربِ عذبش

بہ لب خشکی چہ میری در سرالستانِ مذہبِ ہا

لغت: ”زندہ رود اصفہان کے پاس کے ایک دریا کا نام ہے، پھر عام ہندی اور دریا کے  
لیے بھی مستعمل ہے۔

”مشربِ عذب“ = رنگین انداز

ش کا مرجع رندی ہے۔

ترجمہ وصل: میخواری اور دریائے موجزن اور رندی کے رنگین طور طریقے کتنے اچھے  
ہیں۔ تو مذہب کی ان راہوں میں جو سراہوں کی طرح ہیں کیوں بیا سا جان دے رہا ہے۔

تو خوی پنداری و دانی کہ جانِ بردم، نمیدانی

کہ آتش در نہادم آب شد از گرمی تب ہا



لغت: خوی کے لفظ میں دا و نہیں بولا جاتا۔ یہ لفظ (طے) کے وزن پر ہے۔ پسینہ۔  
 حل: تو اسے پسینہ خیال کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں آتش عشق سے پسینے میں شراپور  
 ہوں، نہیں تو نہیں جانتا یہ پسینہ نہیں ہے یہ تو (عشق کی) آگ ہے جو میرے جسم کے جب یعنی  
 انتہائی گرمی سے پانی بن گئی ہے

مبادا ہچو قار سبھ از ہم بگسلد غالب

نفس یا این ضعیفی بر نتا بد شور یا رب ہا

لغت: ”نفس“ سانس۔ یہاں وہ سانس مراد ہے جو یا رب کہنے کے ساتھ لیا جاتا  
 ہے۔ ”سبھ“ تسبیح ہے۔

حل: ہمارا سانس اس قدر کمزور ہے کہ شور یا رب کو بھی برداشت نہیں کر سکتا، کہیں ایسا نہ  
 ہو کہ یہ تسبیح کے دھاگے کی طرح ٹوٹ جائے۔ یہ شعر مرزا غالب کی ندرت بیان کی ایک نہایت  
 عمدہ مثال ہے۔ ان کا یہ اردو شعر دیکھیے:

جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یہی بات انھوں نے اپنے فارسی شعر میں کہی ہے مگر کس رکھ رکھاؤ سے کہی ہے۔



## غزل نمبر (۱۳)

پس از عمری کہ فرسودم بمشقی پار سائی ہا

گدا گفت و بمن تن درنداد از خود نمائی ہا

لغت: تن در بہ کسی یا بہ چیز سے دادن۔

کسی شخص یا چیز کی طرف راغب ہونا، اسے قبول کرنا۔ حسن میں خود نمائی کا پہلو بہت نما  
 یاں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس زہد و پار سائی میں تواضع اور انکسار ہوتا ہے۔

اس بات کو پیش نظر رکھ کر شعر کی طرف آئیے۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ جب میں اک  
 عمر پار سائی کی مشق کرتے کرتے فرسودہ حال ہو چکا تو میرے محبوب نے مجھے گدا کہہ کر مال دیا۔  
 اور اپنے حسن کی خود نمائیوں کے باعث مجھے خاطر میں نہ لایا۔ شاعر شعر میں پار سائی یا یعنی جمع کا  
 صیغہ لایا ہے اور اس کے ساتھ مشق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ گویا یہ پار سائی کے کئی ایک تیور اختیار  
 کیے۔ پھر بھی محبوب کا منظور نظر نہ ہو سکا۔

اسی خیال کو اردو کے اس شعر میں دیکھیے:

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے تنگ و نام ہے

یہ جاننا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

فغاں زان بوالہوس برکش، پیشہ کش کز من

رباید حرف و آموزد بدشمن آشنائی ہا

لغت: بوالہوس رقیب کے لیے اور محبت پیشہ، عاشق کے لیے استعمال ہوا ہے۔ معشوق،

رقیب کی، جو بوالہوس ہے، حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اور اسے ابھارتا ہے۔ اور عاشق، جو خلوص دل



سے محبت کرنے والا ہے اسے دباتا ہے اور اس کی جان کے درپے ہے۔ چنانچہ وہ عاشق پیار کی باتوں کا انداز چاہتا ہے۔ اور دشمن یعنی رقیب کو سکھاتا ہے۔

بہ مشکل پسند از ابتذال شیوہ می رنجد

بگو سیدش کہ از عمر است آخر بی وفائی ہا

لغت: ”مشکل پسند“ وہ شخص جو ہمیشہ مشکل کام کو پسند کرے۔

”ابتذال شیوہ“ فرسودہ طریق کار۔

میرا محبوب مشکل پسند ہے اور ہر اس بات سے جسے دوسرے کرتے ہوں اور وہ مبتذل اور عام ہو گیا ہو، نا پسند کرتا ہے اور برہم ہوتا ہے۔ اسے یہ تو کہو تو جو عمر بھر سے بے وفائیاں کر رہا ہے۔ یہ بھی تو فرسودہ ہو گئی ہیں۔ اس میں بھی تو کوئی جدت نہیں۔ ان بے وفائیوں کو کیوں نہیں چھوڑ دیتا؟

دوسرے مصرعے میں ”عمر“ کو اگر زندگی کے مفہوم میں لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زندگی بھی تو بے وفائی کرتی ہے محبوب نے بے وفا ہو کر کون سی جدت دکھائی ہے۔

نشد روزی کہ سازم طرہ اجزائی گریبان را

بدستم چاکھا چون شانہ ماند از نارسائی ہا

وہ دن نصیب نہ ہوا کہ میں اپنے پٹے ہوئے گریبان کے اجزا کو جمع کر کے انھیں ایک طرح کی صورت دے دیتا۔ گریباں کے یہ چاک میری نارسائیوں کے باعث کٹنگھی کی طرح میرے ہاتھ ہی پڑے رہ گئے۔

یعنی محبت میں میرا جوش جنوں کسی کام نہ آ سکا۔

نیرزم التفات دزد و رهن، نیازم بین

متاعم را بہ غارت دادہ اند از ناروائی ہا

میری بے نیازی دیکھ کہ میں چور اور رہزن کی توجہ کے قابل بھی نہیں ہوں کہ وہ میرا سر و سامان کسی کام کا سمجھ کے لوٹے، انھوں نے تو میری متاع کو ایک بیکار اور فضول چیز جان کر لٹا دیا۔

بروز رستخیز از جنبش خاکم بر آشوبی

تو دیزداں چہ سازد کس، بدین صبر آزمائی ہا

لغت: رستخیز کا لفظ رستہ اور خیز کا مرکب ہے۔ رستہ قدیم فارسی میں مردہ ہے رستخیز سے مراد مردوں کا جی اٹھنا یعنی قیامت ہے۔ عمر بھر تو میں نے صبر و ضبط سے کام لیا، قیامت کے روز (جب ہر مردہ جسم میں زندگی تازہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔) میری خاک میں بھی حرکت آئی۔ مگر تجھے یہ بھی گوارا نہ ہوا اور تو برہم ہوا کہ اس کی خاک میں یہ جنبش کیوں آئی۔ تجھے اللہ کی قسم! اب تو ہی بتا کہ اتنی صبر آزمائیوں کی کوئی کیسے تاب لاسکتا ہے۔

کدوی چونہ می یابم چنان بر خویشتم بالم

کہ چندارم سرآمد روزگار بی نوائی ہا

لغت: ”کدو“ کدو سے تراشا ہوا ایک پیالہ نما برتن جو عموماً درویش لوگ استعمال کرتے ہیں اور اسی میں کھاتے پیتے ہیں۔ ”سرآمد“ ختم ہونا۔

جب کبھی مجھے کوئی شراب سے بھرا ہوا کدو میسر آتا ہے تو میں خوشی سے یوں پھول جاتا ہوں کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری مفلسیوں کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔



چہ خوش باشد دو شاہد را بہ بحث ناز پیچیدن

نگہ در نکتہ زائی ہا، نفس در سرمہ سائی ہا

وہ بھی کیا دلکش منظر ہوتا ہے جب کوئی دو معشوق باہم بیٹھ کر ناز و انداز کے تیوروں کے بارے میں بحث کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے الجھتے ہیں۔ اس عالم میں ان کی نگاہیں کیا کیا نکتہ آفرینیاں کرتی ہیں اور ان کے سانس (یعنی گفتگو) میں سرمی انداز و لقمہ ہی پایا جاتا ہے۔ یعنی ان کی نظروں اور باتوں میں عجیب رعنائی آ جاتی ہے۔ یہ شعر حسن کا ایک دلکش محاکاتی منظر پیش کرتا ہے۔

خن کو تہ، مرا ہم دل بہ تقویٰ مائل است اما

ز ننگ زاحد افتادم بہ کافر ما جرائی ہا

مرزا غالب کا مشہور اردو شعر ہے

جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

تقریباً اسی قسم کے احساس کو اس نے شعر میں بیان کیا ہے کہ مختصر بات کہتا ہوں کہ دوسروں کی طرح میرا دل بھی زہد و تقویٰ کی طرف مائل ہے۔ لیکن زاحد کے اطوار ناہنجار دیکھ کر میں نے کافرانہ طرز عمل اختیار کر لیا ہے (کہ یہ ایسے غلط زاہدانہ کردار سے بہتر ہے)۔

زنجم گر بہ صورت از گدایان بودہ ام غالب

بدار الملک معنی می کنم فرماں روائی ہا

غالب! اگر میری ظاہری زندگی فقیروں کی سی ہے تو مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں۔ میں باطنی

طور پر ایک ایسا شہنشاہ ہوں جو روحانی دارالسلطنت کا تاجدار ہے۔

صورت اور معنی میں تضاد ہے۔ اور اسی طرح گدا اور فرمانروا کے الفاظ میں ہے۔ چنانچہ اس شعر میں منعت تضاد پائی جاتی ہے۔



## غزل نمبر (۱۵)

جان برنباہ ای دل ہنکامہ ستم را

از سینہ ریز بیروں، مانند تیغ، دم را

لغت: ”دم تیغ“ تلوار کی تیزی اور اس کی آبداری کو کہتے ہیں۔ اس کے لئے فارسی میں لب تیغ، دہن تیغ اور روئے تیغ کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ گویا دم تیغ تلوار کی تیز دھار ہے جو ایک طرح سینہ تیغ سے باہر ہی ہوتی ہے۔ مرزا غالب کا مشہور شعر ہے۔

جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے

سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اس اردو شعر کا دوسرا مصرع پہلے مصرع کی وضاحت کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی شاعر نے جذبہ بے اختیار شوق کو ظاہر کیا ہے۔ کم و بیش یہی طرز فکر فارسی کے شعر میں موجود ہے۔ جذبات شوق کی شدت کے باعث عاشق کے دل میں ایسے ایسے ہنگامے پارہتے ہیں کہ جان تنگ آ جاتی ہے۔ اسی حالت کو بیان کرنے کے لیے مرزا غالب کہتے ہیں: اے دل تیرے ہنگاموں کے ستم کی ہماری جان نازک تاب نہیں لاسکتی۔ تیغ کی طرح تو اپنی دہار کو سینے



سے باہر نکالے تاکہ تو جوچہ کے لگا رہا ہے ان سے ہمیں نجات مل جائے۔

از وحشت بروغم، بگر غم دروغم

آمیزش غریبی باشد بہ ہوش رم را

لغت: شاعر نے رم کے لفظ کو رم ہوش یعنی ہوش کے اڑنے کا مفہوم دیا ہے۔ اور ہوش اور رم ہوش میں ایک پوشیدہ آمیزش کی نشاندہی کی ہے۔

جب تک غم دل میں چھپا رہتا ہے اس کا پتا نہیں چلتا لیکن جب ظاہری حالت پریشان ہو تو غم پنہاں کارا رکھل جاتا ہے۔ گویا ہوش میں اور اڑنے میں ایک عجیب ربط ہوتا ہے۔

گویند می نویسد، قاتل برات خیری

یارب شکستہ باشد بر نام ما قلم را

لغت: یارب۔ ان الفاظ کے ”اے خدا“ کے علاوہ اور مفہوم بھی ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک ”اے کاش“ یا اللہ کرے“ بھی ہے۔ یہاں انھی معنوں میں آیا ہے۔ برات خیر۔ نیکی کا پروانہ، بری نامہ۔ جاں بخشی کا حکم۔ سنا ہے کہ قاتل ان لوگوں میں سے جنہیں وہ قتل کرنا چاہتا ہے۔ بعض کی جاں بخشی کا حکم لکھ رہا ہے۔ اللہ کرے کہ جب ہمارا نام آئے تو اس کا قلم ٹوٹ جائے۔

بی وجہ در رخت نیست از پافادان من

برویدہ می ستانم، درہر قدم، قدم را

میں تیری راہ میں چلتے چلتے یونی نہیں گر پڑتا۔ دراصل میں ہر قدم پر اپنے پاؤں اپنی

آنکھوں پر رکھ لیتا ہوں کہ یہ تیری راہ میں چل رہے ہیں انھیں آنکھوں پہ بٹھانا چاہیے۔

گویا محبوب کی راہ میں چلنا بھی ایک بڑی سعادت ہے۔

سومند کشتنم خورد، از غصہ جان سپردم

کردم ز بی نیازی خون در جگر قسم را

لغت: ”خون در جگر کسے کردن“ کسی کی حالت کو تلخ کر دینا۔ ”غصہ“ انتہائے غم۔

محبوب نے مجھے مار ڈالنے کی قسم کھائی۔ میں نے غم کے ہاتھوں جاں دے دی۔ یہ گویا میری بے نیازی تھی کہ میں نے اس کو مارنے کا موقع ہی نہ دیا اور اس کی قسم دھری کی دھری رہ گئی۔

در نامہ تا غمشتی بر من نوید قہلی

در دل چو جوہر تیغ جا دادہ ام رقم را

جب سے تو نے خط میں مجھے قتل کرنے کی خوشخبری دی میں نے اس تحریر کو دل میں اس طرح رکھ لیا جس طرح تیغ میں جوہر تیغ ہوتا ہے۔

بیداد گر ندارد سرمایہ تواضع

تبیخت برسم یغما از ما ربودہ خم را

لغت: یغما۔ لوٹ کا مال۔ مال غنیمت۔ شکر خاں انسان میں تواضع کہاں ہوتی ہے۔

تیری تمکوار میں جو خم ہے وہ تیری اس کی خوئے تواضع کے باعث نہیں۔ یہ تو ہماری نیاز مندی کا خم ہے جو تیری تمکوار نے بطور مال غنیمت ہم سے چھین لیا۔



کاشانہ گشت ویران، ویرانہ دل کشا تر

دیوار و در نازد زندانیان غم را

لغت: زندانیان "زندانی کی جمع۔ زندانی کی "ی" فاعلی ہے یعنی زندان میں رہنے

والا۔

ہمارا گھر ویران ہو گیا، ویرانہ ہی اچھی جگہ ہے غم کے اسیروں کو (گھر کے) دیوار و در

اس نہیں آتے۔

مانند خار زادی کاتش زنند در وی

سوزد ز بیم خویت اجزای نالہ ہم را

لغت: "اجزائے نالہ ہم" یعنی فریاد کے تمام اجزائے بعد دیگرے۔

"زنند" فارسی میں صیغہ جمع غائب بالعموم محاورہ آتا ہے اور فعل مجہول کا مفہوم دیتا

ہے۔ یہاں وہی مفہوم ہے کاتش زنند یعنی جسے آگ لگائی گئی ہو۔

نارزار کو جلدی آگ لگ جاتی ہے۔ اور وہ یکسر جل جاتا ہے۔ اس خارزار کی طرح

جسے آگ لگادی گئی ہو، تیری آتشیں خو کے خوف سے میری فریادیں یکسر جل جاتی ہیں یعنی میں

تیری طبع چیز کے خوف سے فریاد ہی نہیں کر پاتا۔

در مشرب حریفان منع است خودنمائ

بنگر کہ چون سکندر آئینہ نیست جم را

لغت: مشرب حریفان "باہم مل کر پینے والوں کا مسلک" جم۔ جم سے دو شخصیں مراد

ہوتی ہیں: جب خاتم جم آئے تو جم سے مقصود حضرت سلیمان ہوتے ہیں اور جب جام جم آئے تو

جم سے جمشید مراد لیتے ہیں۔

آئینے کی ایجاد کو سکندر اعظم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ جمشید اپنی بزم تائے دنوش کے لیے مشہور ہے۔

میخواروں کے مذہب میں خودنمائی ممنوع ہوتی ہے۔ دیکھ لو، جمشید کے پاس سکندر کی طرح کوئی آئینہ نہیں تھا۔

جمشید کے پاس جام جم تھا جس میں، کہا جاتا ہے۔ آئینہ آنے والے واقعات منعکس ہوتے تھے۔ سکندر کی طرح آئینہ نہیں تھا کہ وہ اس میں اپنا عکس دیکھتا اور پھر خودنمائی کرتا۔

زاہد مناز چندین، زقارم ار گستی

از جھہ ام نہ وزدد کس سجدہ صم را

اے زاہد اگر تو نے میرا زنا (نشان کفر سمجھ کر) توڑ دیا تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔

بظاہر تو نے میرا کفر مٹا دیا۔ لیکن میری پیشانی سے تو سجدہ بت کا نشان نہیں مٹا سکتا۔

یعنی میرا کفر زنا تک محدود نہیں۔ یہ ایک طبعی شے ہے اور میں نے اسے ریاضتوں سے حاصل کیا ہے۔

اشکی نماند باقی از فرط گریہ غالب

سلی رسید و گوئی از دیدہ شست نم را

اے غالب، میں اس جوش سے رویا ہوں کہ اب ایک آنسو بھی باقی نہیں رہا۔ یوں لگتا

ہے جیسے کوئی سیلاب آیا تھا اور وہ میری آنکھوں کی ساری نمی کو بہا کر لے گیا ہے۔





## غزل نمبر (۱۶)

من آن نیم کہ دگر می توان فریفت مرا

فریبش کہ مگر می توان فریفت مرا

میں وہ نہیں کہ مجھے اب کوئی فریب دے سکے۔ لیکن میں اپنے محبوب کو محض اس لیے یہ غلط احساس دلاتا ہوں کہ میں فریب کھا سکتا ہوں کہ اس خیال سے شاید وہ مجھے فریب دینے پر آمادہ ہو جائے۔

مقصود یہ ہے کہ میں اب حسن کے کسی فریب میں نہیں آ سکتا۔ لیکن فریب کھانے میں جلدت ہے اس لذت کو ابھی نہیں بھولا اور اسے ظاہر نہیں کرتا۔ چاہتا ہوں میرا محبوب مجھے دھوکا دے اور مجھے مرہ آئے۔

بحرف ذوق نگہ می توان ربود مرا

بہ وہم تاب کمر می توان فریفت مرا

محبوب کی کمر کے متعلق شعرا کا خیال ہے کہ وہ بہت تپلی ہوتی ہے بلکہ بعض مبالغہ آمیزی سے کام لے کر کہتے ہیں کہ وہ ہوتی ہی نہیں، محض دیکھنے والے کا وہم ہوتا ہے کہ کمر ہے۔ ایک ذوق نگاہ کی بات سے میرا دل موہ لیا جاسکتا ہے اور کمر کے وہم میں ڈال کر مجھے دھوکا دیا جاسکتا ہے۔

ز ذکر مثل بگمان می توان گفند مرا

ز شاخ گل بہ ثمری توان فریفت مرا

شراب کے ذکر سے مجھے سرور میں لایا جاسکتا ہے اور مجھے یہ گمان دلایا جاسکتا ہے کہ میں نشے میں ہوں، اور میں کسی شاخ گل کو دیکھ کر اس دھوکے میں آ سکتا ہوں کہ اس پر پھول نہیں پھل گئے ہوئے ہیں۔ حسن شاخ گل کی طرح ہوتا ہے جس پر ناز و ادا کے پھول تو کھلتے ہیں لیکن وفا کے پھل نہیں لگتے۔ لیکن مرزا غالب ایک ایسے عاشق ہیں جو یہاں بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔

ز درد دل کہ بافشانہ درمیان آید

بہ نیم جنبش سر می توان فریفت مرا

افسانہ محبت کہتے کہتے، ذرا سی کہیں درد دل کی بات آجائے (جیسا کہ عموماً آجایا کرتی ہے) تو اس بات پر کسی افسانہ سننے والے کا ہولے سے سر ہلا دینا بھی مجھے فریب دینے کو کافی ہے۔ یعنی سننے والے کی ذرا سی جنبش سر سے یہ سمجھ لوں گا کہ اس میں درد دل کا ہلکا سا احساس ضرور ہے۔

ز سوز دل کہ بہ واگویہ بر زبان گزرد

بیک دو حرف حذر می توان فریفت مرا

لغت: ”واگویہ“ گفتگو۔ بعض کے نزدیک واگویہ وہ گفتگو ہوتی ہے جو کسی بات کا چرچا کرنے کے لیے دہرائی جائے۔

اس شعر میں دونوں معنوں کے پہلو موجود ہیں۔ ذرا سے سوز دل کے اظہار سے جو گفتگو کے دوران میں زبان پر آئی جاتا ہے مجھے ذرا وے کے ایک دو حرفوں سے دھوکا دیا جاسکتا



ہے۔ (یعنی چپ کرایا جاسکتا ہے۔) کہ میں سوز دل کی بات نہ کروں۔

من و فریفتگی! ہرگز آن محال اندیش

چرا فریفت اگر می توان فریفت مرا

میں اور فریب کھا جاؤں ناممکن بات ہے۔ اور اگر واقعی مجھے دھوکا دیا جاسکتا ہے تو میرے محبوب نے، جو ہمیشہ محال کام ہی کرنے کی کوشش کرتا ہے، مجھے کیوں فریب دیا۔ مقصود شعر یہ ہے کہ محبوب فریب دینے سے گریز کرے یا عاشق فریب کھانے کی کوشش کرے، عشق میں فریفتگی آئی جاتی ہے۔

تم بھی ضبط کرد، میں بھی

عشق ہے کس کے بس کی بات

خدنگ جز بگرایش کشاد نہ پذیرد

از و بزخم جگر می توان فریفت مرا

تیر محبوب کے میلان طبع کے بغیر زہ سے نکل کے جابی نہیں سکتا۔ پھر بھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے اس کے تیر سے جگر پر زخم کھا لیا ہے۔

ز باز نامدن نامہ بر خوشم کہ هنوز

بہ آرزوی خبر می توان فریفت مرا

نامہ برداپس نہیں آیا اور میں اس کے نہ آنے پر اس لیے خوش ہوں کہ محبوب کی طرف سے کسی (اچھی) خبر کے آنے کی آرزو سے اپنے دل کو (کچھ وقت اور) فریب میں مبتلا کیا جاسکتا ہے۔

شب فراق ندارد سحر، ولی یک چند

بہ گفتگوی سحر می توان فریفت مرا

شب جدائی کی کوئی سحر نہیں ہوتی تاہم کچھ وقت کے لیے سحر کا ذکر کر کے مجھے یہ فریب تو دیا جاسکتا ہے کہ سحر ہوگی۔

نشان دوست ندانم جز این کہ پردہ در است

ز در بہ روزن در می توان فریفت مرا

نشان دوست کے بارے میں، میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا کہ وہ پردہ در ہوتا ہے۔

گر سنہ چشم اثر عیسم کہ در رہ دید

یہ کیمیائی نظری توان فریفت مرا

لغت: ”گر سنہ چشم“ وہ شخص جس کی نگاہیں بھوکی ہوں۔ مرزا غالب نے ”گر سنہ چشم اثر“ کے بڑے بلیغ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان سے مراد اس نے وہ شخص لیا ہے جو محبت بھری نظروں کے اثر کو دیکھنے کو ترس رہا ہو۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ میں آنکھوں کے اثر کو دیکھنے کا بھوکا نہیں لیکن مجھے اتنا تو فریب دیا جاسکتا ہے کہ محبت بھری نظریں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔ ان کا اثر ضرور ہوتا ہے۔

سرشت من بود این، ورنہ آن نیم غالب

کہ از وفا بہ اثر می توان فریفت مرا



اے غالب میں کیا کروں میری سرشت ہی ایسی ہے ورنہ میں وہ نہیں کہ یہ سن کر  
دھوکے میں آ جاؤں کہ وفا کا اثر ہوتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ وفا کا اثر ہونہ ہو، ہم خوگر وفا ہیں، وفا  
ہی کرتے رہے ہیں۔



### غزل نمبر (۱۷)

ز من گرت نہ بود انتظار، بیا  
بھانہ جوی مباحش و ستیزہ کار بیا  
میں تیرا انتظار کر رہا ہوں اور اگر تجھے اس بات کا اعتبار نہیں آتا تو آ کر دیکھ لے۔  
یونہی بھانے تلاش نہ کر بلڑنے جھگڑنے کے انداز ہی میں آ جا۔

بیک دو شیوہ ستم دل نمی شود خرسند  
بہ مرگ من کہ بہ سامان روزگار بیا  
دو ایک طرز ستم سے میرا جی نہیں بھرتا۔ تجھے میری موت کی قسم، آ اور جو ر و ستم کے سازد  
سامان کی ایک دنیا لے کر آ۔

بہ مرگ من میں ”ب“ قسمیہ ہے یہاں موت کی قسم کھانے میں ایک نکتہ ہے، یعنی اگر  
محبوب کے جو ر و ستم کے ہاتھوں موت بھی واقع ہو تو مضاقت نہیں۔

بھانہ جوست در الزام مدعی شوق  
یکی بر غم دل نا امیدوار بیا  
غالب کا ایک مشہور اردو شعر ہے

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا  
آپ آتے تھے مگر کوئی عنان کیر بھی تھا  
یعنی تیرے آنے میں جو تاخیر ہوئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ رقیب مانع تھا۔ فارسی کے  
شعر میں اسی خیال کو ایک اور انداز میں پیش کیا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارا شوق بھرا دل ہمیشہ رقیب پر  
الزام لگانے کے بہانے سوچتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ تیرے نہ آنے کا باعث رقیب ہے۔ ایک  
بار ہمارے دل کے اس پختہ احساس کے خلاف (خلاف توقع) آ جا۔

ہلاک شیوہ تمکین مخواہ مستان را  
عنان گسستہ تر از باد نو بھار بیا  
لغت: ”مستان“ سے مراد عاشق ہیں جو اپنے جذبات محبت میں مست ہیں۔  
”تمکین“، تمکنت، حسن کا غرور و ناز ”عنان گسستہ“ وہ جانور جس کی لگام نوٹ گئی ہو اور وہ بغیر کسی  
روک تھام کے آزاد بھاگتا چلا جائے۔ تو اپنے عاشقان سر مست کو اپنے ناز حسن سے کیوں ستار ہا  
ہے۔ آ اور یہ غرور نخوت چھوڑ کر بے تکلف چلا آ۔ باد بہاری سے زیادہ بے تکلف ہو کر آ کہ وہ جدھر  
چاہے آزادانہ چلی آتی ہے۔

ز ما گستی و با دیگران گرو بستی  
بیا کہ عہد وفا نیست استوار، بیا



لغت: ”گر و بستن“ عہد باندھنا۔

مولانا حالی اس شعر کی شرح یوں لکھتے ہیں:-

”یعنی اگر تو نے ہم سے توڑ کر غیروں کے ساتھ بیان باندھا ہے تو اس کا خیال نہ کر اور بے تکلف ہمارے پاس آ جا کیونکہ عہد وفا نوٹنے ہی کے لیے باندھا جاتا ہے اور وہ کبھی استوار نہیں ہوتا جیسا کہ ہمارے ساتھ بندھ کر ٹوٹ گیا۔

عہد وفا کوئی پائدار شے نہیں جس طرح تو نے ہم سے عہد وفا باندھ کر توڑ دیا۔ اسی طرح تو نے جو دوسروں کے ساتھ عہد و بیان کیا ہے اسے بھی توڑا جاسکتا ہے۔ جھجک کس بات کی ہے۔

وداع و وصل جداگانہ لذتی دارد

ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

جدا ہونے اور ملنے میں دوا لگ ا لگ لذتیں ہیں۔ ہزار بار جا اور لاکھ بار آ۔

”اگرچہ شاعر نے فراق و وصال، دونوں کی لذتوں کا نام لیا ہے، تاہم وصل کی لذت کے کیا کہنے۔ اسی لیے مرزا غالب نے محبوب کے جانے کے لیے ہزار بار اور آنے کے لیے لاکھ بار کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

تو طفل سادہ دل ہمنشیں بد آموز است

جنازہ گرننوان دید، بر مزار بیا

تو ایک نادان بچے کی طرح ہے۔ اور رقیب جو تیرا ہم نشین ہے تجھے غلط سبق سکھا کر گمراہ کر رہا ہے۔ اگر تو میرے جنازے کو دیکھنے کے لیے نہیں آ سکا تو نہ سہی، کم از کم مزار پر تو آ جا۔

شاعر نے دو مصرعے میں، ”جنازہ گرننوان دید“ کے لفظ استعمال کیے ہیں۔ جنازے میں شریک ہونا تو بڑی بات ہے جنازے کو گزرتے دیکھنا یا اسے دیکھ لینا ہی کافی ہے کیونکہ رقیب مانع ہے یہ ساری بات محبوب کی سادگی اور رقیب کی بد آموزی کو ظاہر کرتی ہے۔

فریب خوردہ نازم، چھانمی خواہم

یکی بہ پرسش جان امیدوار بیا

چھا، چکی جمع ہے، مبالغے یا کثرت کے لیے آیا ہے۔

میں کیا کچھ نہیں چاہتا تھا لیکن تیرے ناز و انداز کے فریب میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ ایک بار تو میری جان امیدوار کا حال پوچھنے کے لیے آ اور دیکھ کہ کیا کیا خواہشیں وہاں ابھی تک دہی ہوئی ہیں۔

حسن کے ناز و انداز کی کار فرمایوں کا یہ عالم ہے کہ ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دس اور ابھر آتی ہیں۔ دل کیا ہے امید کا ایک انبار ہے۔ امیدوں کے اسی جھوم کے لیے مرزا غالب نے ”جان امیدوار“ لکھا ہے گویا عاشق کی زندگی ہی امیدوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔

ز خوی تست نھاہ شکیب نازک تر

بیا کہ دست و دلم می رود ز کار بیا

تیری طبیعت نازک ہے اور ہمارا صبر اس سے زیادہ نازک ہے۔ آ کہ صبر کرتے کرتے ہمارا ہاتھ اور دل دونوں کام سے رہ گئے ہیں۔۔



رواج صومعه هستی است، زینهار مرو

متاع میکده مستی است، هوشیار بیا

خانقاہ میں خودی اور غرور و پندار کا رواج ہے وہاں ہرگز نہ جا میکدے کا سارا سرمایہ کیف و مستی ہے یہاں آ اور ہوشیار ہو کر آ۔ مولانا حالی ”ہوشیار بیا“ کے بارے میں فرماتے ہیں۔ ”یعنی میکدے میں ظرف عالی لے کر آنا چاہیے۔ مستی حاصل کرنے کے لیے ہوشیار ہو کر آنے میں جو لطف ہے وہ محتاج بیان نہیں۔“

حصار عافیتی گر ہوس کنی غالب

چو ما بہ حلقہ رندانِ خاکسار بیا

اے غالب اگر تجھے عافیت کی جگہ کی خواہش ہے تو رندانِ خاکسار کی صحبت میں آ کر بیٹھ۔ مرزا غالب نے حلقہ رندان کو حصار عافیت کہا ہے یعنی عافیت کا قلعہ جہاں دنیا کے تفکرات کو کوئی دخل نہیں۔



### غزل نمبر (۱۸)

چون بہ قاصدِ بہرمِ پیغام را

رشمک نگذارد کہ گویم نام را

جب میں کوئی پیغام (اپنے محبوب کے نام) قاصد کے سپرد کرتا ہوں تو رشمک مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں اس کا نام لوں۔

گشتہ در تاریکی روزم نھان

کو چراغی تا بجویم شام را

میرادن تاریکیوں میں چھپ گیا ہے۔ چراغ کہاں ہے کہ میں شام کو تلاش کروں ”یعنی میرادن اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اس کی تاریکی دونوں مل گئیں اور یہ نہ معلوم ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن کب چھپا۔“ (حالی)

آن نمیم باید کہ چون ریزم بجام

زور می در گودش آرد جام را

مجھے وہ شراب چاہیے کہ میں جب اسے پیالے میں ڈالوں تو اس کی تیزی اور تندی سے پیالہ خود بخود گردش میں آ جائے۔ بظاہر شراب کی تندی اور تیزی دکھانی مقصود ہے لیکن اس میں ایک لطیف اشارہ یہ بھی پنہاں ہے کہ ایسی شراب ہو کہ ساقی کی ضرورت محسوس نہ ہو جام ساقی گری بھی کرے۔

بی گناہم، پیر دیر از من مرنج

من بہ مستی بستہ ام احرام را

لغت: ”دیر“ کہند نما عبادت خانہ۔

یہ عبادت خانہ آتش پرستوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس رعایت سے پیر دیر ”پیر مغاں“ ہوگا۔ معبد آتش پرستاں کا پادری۔ دیر، حرم کی ضد بھی ہے دیر و حرم، عبادت خانہ کافراں اور کعبہ آتش پرستوں کے یہاں شراب پینا جائز تھا۔ اس لیے پیر مغاں کا لفظ، پیر میکدہ کے لیے مستعمل ہے۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں مستی کا لفظ اسی لیے آیا ہے، کہتا ہے: اے



بیردر، مجھ سے رنجیدہ نہ ہو، میں جو یہاں احرام باندھ کر آ گیا ہوں یہ مستی اور نشے کا اثر ہے۔

از دل تست آنچہ بر من می رود  
می شناسم خنچی ایام را

معشوق کے جو رستم اور زمانے کے جو رستم میں یک گونہ مماثلت ہے۔ معشوق سنگدل ہے اور اس کا دل پتھر کی طرح سخت ہے اسی لیے شاعر نے زمانے کے دکھ درد کو خنچی ایام کہا ہے۔

کہتا ہے، میں زمانے کی خنٹیوں کو پہچانتا ہوں، ان میں وہی انداز ہے جو تیرے جو رستم میں ہے۔ اور پھر تیرا دل چاہتا بھی یہی ہے کہ میں ان خنٹیوں میں مبتلا رہوں۔ یہ سب کچھ تیری دلی آرزو کے مطابق ہو رہا ہے۔

شعر کے ان قریبی اور بعیدی معنوں کے اعتبار سے، شعر میں دقیق صنعت ایہام پیدا ہو گئی ہے۔

تا میخند هر که تن پرور بود

خوش بود گردانه نبود دام را

اگر جال بچھا ہو اور اس میں دانے نہ بکھیرے گئے ہوں تو بڑی اچھی بات ہوگی کیوں کہ اس طرح جال میں کوئی تن پرور نہیں پھنس سکے گا، وہی اسیر ہوں گے جو اسیری کے خواہاں ہوں گے۔

عاشق اسیر محبت ہوتا ہے۔ اسیر ہوں نہیں ہوتا۔  
کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

الغاث بے غرض، سررشتہٗ تسخیر ماست

صيد ما خوانی، بروں از دام باید دانه ریخت

ہمیں تسخیر کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ تو ہماری طرف بغیر کسی غرض سے مائل ہو۔ ہمیں اسیر کرنا چاہتا ہے تو دانہ جال سے باہر ڈال۔

مرزا غالب کے شعر کے بارے میں مولانا حالی کہتے ہیں:  
”بہ وہی مضمون ہے جو مرزا نے اردو میں اس طرح باندھا ہے:

طاعت میں تار ہے نہ ئے دانگیں کی لاگ  
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

بلکہ ایمانم بہ غیب است استوار

از دھان دوست خواہم کام را

شعرا، مکر معشوق کی طرح دہن معشوق کو اس کی تنگی کے باعث، کا عدم کہہ دیتے ہیں گویا وہ اتنا تنگ ہوتا ہے کہ نظر نہیں آتا غیب ہوتا ہے۔ غیب اللہ تعالیٰ کی ذات بھی ہے۔ اس سے لوگ اپنی آرزوؤں کے پورا ہونے کی امید رکھتے ہیں۔

انہی مناجات کے پیش نظر مرزا غالب کہتے ہیں:

چونکہ میرا غیب پر پختہ ایمان ہے اس لیے میں دہن معشوق کو غیب سمجھتے ہوئے اس سے اپنی آرزو برآری کی خواہش کرتا ہوں۔

ما کجا، او کو، چہ سودا در سر است

ذره های آفتاب آشام را



لغت: ”آفتابِ آشام“ دھوپ یا آفتاب کو پی جانے والا مرزا غالب کا مصرعہ ہے:

پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

یوں تو ذرے فضا میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن نظر نہیں آتے البتہ دھوپ میں آجائیں تو

نمایاں ہو جاتے ہیں۔ گویا آفتاب ہی سے ان کی ہستی قائم ہے۔

اس پس منظر میں مرزا غالب نے متصوفانہ انداز میں انسان اور خالق

کائنات کے باہمی ربط کو ظاہر کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم کہاں اور وہ کہاں ان آفتاب کے فیض سے وجود پانے والے ذروں

کے سر میں کیا سودا سما گیا ہے کہ اس کے عشق کا دعویٰ کرتے ہیں۔

زحمتِ عام است دائمِ خاص را

عشرتِ خاص است ہر دمِ عام را

خواص، ہمیشہ عام مصیبتوں میں مبتلا رہتے ہیں اور عام کو عیش و عشرت کے خاص سامان

میسر آتے ہیں۔

دلستان در خشم و غالب بوسہ جو

شوقِ خناسدِ همی ہنگام را

محبوب غمے میں ہے اور غالب کو دیکھو وہ بوسہ طلب کر رہا ہے۔ ہاں شوق موقع محل

نہیں دیکھتا۔



## غزل نمبر (۱۹)

در ہجر، طرب بیش کند تاب و ہم را

مہتاب کفِ مار سیاہ است شمم را

فراق میں خوشی کا ساز و سامان میری بےقراری اور تڑپ کو اور بھی زیادہ کر دیتا ہے۔

پس چاندنی (جو خوشی اور طرب کا منظر ہے) میری رات کے حق میں ایک سیاہ ناگ کے پھن کا

حکم رکھتی ہے۔

آوخ کہ چمن بستم و گردوں عوض گل

در دامنِ من ریختہ پائیِ ظلم را

افسوس! میں چمن کی تلاش میں تھا اور آسمان نے پھولوں کے عوض، میرے دامن میں

پائے طلب ڈال دیے، یعنی قسمت میں پھول نہیں تھے، پھولوں کی تلاش ہی لگھی تھی۔

ساز و قدح نغہ و صہما، ہمہ آتش

یابی ز سمندر، رہ بزمِ طربم را

لغت: ”سمندر“ ایک کیزا ہے جو آگ میں رہتا ہے۔ گویا اس کی طبیعت آتشیں ہے۔

میرا ساز، پیالہ نغہ اور شراب سب کے سب سر تا پا آگ ہیں۔ اگر آپ لوگ میری بزم

طرب کا سراغ لگانا چاہیں تو وہ آپ کو سمندر کی وساطت سے ملے گا۔

یعنی نغہ و بادہ بظاہر سامانِ طرب ہیں۔ لیکن یہ تو میری آتش غم کو اور بھی بھڑکاتے ہیں۔



اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

جو مئے و نغمہ کو اندوہ رہا کہتے ہیں

یہ آتش غم ہی ہمارا سرمایہ حیات ہے جس طرح سمندر آگ میں رہ کر زندگی حاصل کرتا ہے اسی طرح ہم بھی غم کے شعلوں میں پھلتے پھولتے ہیں۔

در دل ز تمنای قدم بوس تو شورِ یست

شوقِ چہ نمک دادہ مذاقِ ادبم را

لغت: ”شور“ یہ لفظ مختلف معنی دیتا ہے۔ غلغلہ و آواز بلند عشق و جنوں، نمک و نمکین۔

اسما کے اخیر بطور لاحقہ آئے تو فاعلی معنی پیدا کرتا ہے جیسے صلح شور، یعنی صلاح استعمال

کرنے والا۔

شاعر نے شعر میں شور کا لفظ، جہوم جذبات شوق کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اور چونکہ شعر کے دوسرے مصرعے میں نمک کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے شور کا ایک معنوی پہلو لذت بھی ہے۔

”مذاقِ ادب“ سے مقصود ذوقِ احترام، یا لذتِ احترام ہے کہتا ہے کہ میرے دل میں حسن کا یہ احترام ہے اور اسی احترام کے باعث مجھے تیرے پاؤں کو چومنے کی تمنا ہے اور اس تمنانے میرے دل میں جذبات کا ایک ایسا جوش و خروش پیدا کر دیا ہے کہ ذوقِ احترام میں نمکینی کی لذت بھردی ہے۔

مقصود یہ ہے کہ دلِ احترام حسن میں ڈوبا ہوا ہے اور اس سے لذت اندوز ہو رہا ہے۔

از لذتِ بیداد تو فارغ نتوان زیست

دریابِ عیار گلہ بی سبہم را

لغت: ”عیار“ سونے چاندی کی پرکھ یا پرکھنے کے آلے کو کہتے ہیں اور اسی اعتبار سے اس کا ایک مفہوم، خالص یا کھرا بھی ہے۔ ”گلہ بے سب“ گلہ بے جا، یہ ایسا گلہ جس کا کوئی سبب نہ ہو، جب معشوق ستم ڈھاتا ہے تو شکایت ہوتی۔ جب وہ ستم نہیں کرتا تو لب پر شکایت کا آنا، گلہ بے جا ہوگا۔

غالب کی نظر میں یہ گلہ بے سبب یا گلہ بے جا نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ تو میرے گلہ بے سبب کو اچھی طرح بھانپنے کی کوشش کر اور دیکھ کہ یہ گلہ بے جا نہیں مجھے تیرے ستم اٹھانے میں لذت ملتی ہے کہ اس کے بغیر ایک لمحہ کے لیے بھی جیا نہیں جاسکتا۔ یہ گلہ، گلہ نہیں تقاضائے جفا ہے۔

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں

ہے تقاضائے جفا شکوہ بیداد نہیں

ترسم کہ دھد نالہ جگر را بدریدن

قطع نظر از جیب بدوزیم لبم را

لغت: ”جیب“ گیر بیان۔

ڈرتا ہوں کہ فریاد کروں کا تو جگر پھٹ جائے گا۔ اس لیے چاک گریباں کو سینے کی بجائے میں نے لبوں کو سی لیا ہے۔ یعنی ضبط سے کام لیتا ہوں کیونکہ ضبط کرنے ہی میں میرا فائدہ ہے۔

صرف ہے ضبط آہ میں میرا، و گرنہ میں

طعم ہوں ایک ہی نفس جا نگداز کا

از نالہ بہ مبضم بنہ ای دوست سرانگشت

مانند بی اندر ستخوان جوی سہم را



لغت: پہلے مصرعے میں از کا حرف اضافی ہے یعنی اضافت کا مفہوم دیتا ہے چنانچہ اس مفہوم کے تحت پہلے مصرعے کی تشریح ہوگی:

اے دوست، سرانگشت نالہ بہ نبض من بند

”تب“ حرارت عشق سوز محبت

یعنی میری فریاد و نغماں سے میری نبض کو ٹٹول

جس طرح نئے یعنی بانسری کی فریاد سے اس کے سینہ کی حرارت کا سراغ ملتا ہے، اسی طرح سے میرے نالہ و فریاد سے میری ہڈیوں میں چھپے ہوئے تپ عشق کا اندازہ کر لے۔

ساقی بہ نمی کز قدح بادہ چکانی

بر خلد بخند اں لب کوثر ظلم را

لغت: ”لب کوثر طلب“ وہ لب جو شراب کو کوثر کے لیے ترستے ہیں۔ اے ساقی، اس ایک آدھ قطرہ شراب سے جو تو نہایت بے پروا انداز میں زمین پر گرا دیتا ہے، میرے لبوں کو یوں تکلف کر دے کہ جیسے وہ جنت کی نعمتوں پر تحقیر سے ہنس رہے ہیں۔

در من هوس بادہ طبعی است کہ غالب

پیکانہ بہ جمشید رساند نسیم را

میری شراب نوشی کی شدید خواہش میری طینت میں شامل ہے۔ یہ پیکانہ نئے ہی تو ہے جس سے میرا سلسلہ نسب جمشید سے جا ملتا ہے۔



## غزل نمبر (۲۰)

بر نمی آید ز چشم از جوش حیرانی مرا

شد نگہ زنار تسبیح سلیمانی مرا

دامن افشاندنم بجیب و ماندہ در بندتم

وحشی کو تا برون آرد ز عریانی مرا

میں نے اپنا دامن جھٹک کر اپنے گریباں پر ڈال لیا اور چاک گریباں کو ڈھانپ لیا۔ لیکن ابھی جسم کی عریانی کو ڈھانپنے کی فکر میں ہوں۔ وحشت جنوں کہاں ہے جو آکر میری عریانی سے مجھے باہر لے آئے۔

انسان میں جب تک بلند اخلاقی اور روحانی صفات پیدا نہ ہوں اس کی زندگی، ایک عریاں جسم کی طرح ہوتی ہے۔ ایک ذی ہوش انسان اپنی اس عریانی کے احساس سے باہر نہیں آ سکتا، ہاں دیوانگی ہی اس احساس کو ختم کر دیتی ہے۔ مرزا غالب اپنے شعر میں اسی وحشت جنوں کو تلاش کر رہے ہیں۔

اُن کا یہ اردو شعر اسی خیال کا آئینہ دار ہے:

ڈھانپنا کفن نے داغ عیوب برہنگی

میں ورنہ ہر لباس میں تنگ وجود تھا

وہ کہ پیش از من بہ پابوس کسی خواہد رسید

سجدہ شوقی کہ می بالد بہ پیشانی مرا



کیا اچھا ہو کہ میرا سجدہ شوق جو میری پیشانی میں پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اور دمہ دم  
بڑھتا جا رہا ہے، مجھ سے پہلے کسی کی پاؤں کا شرف حاصل کر لے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنے  
والہانہ جذبہ پاؤں کا اظہار کیا ہے۔ لطیف نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ محبوب کے پاؤں تک بھی اس کی  
اپنی رسانی نہیں ہوتی تاہم اس کا شوق بے تاب تصویر میں محبوب کے پاؤں چوم رہا ہے۔

ہم چنین بیگانہ زنی با من، دل و جان کسی

بدگمان گردم اگر دانم کہ میدانی!

تو کسی اور کا دل و جان ہے، میرے ساتھ یونہی بیگانہ داری رہنا بہتر ہے کیونکہ اگر مجھے  
یہ معلوم ہو جائے کہ تو مجھے جانتا ہے اور آشنا ہے تو میں بدگمان ہو جاؤں، یعنی سمجھوں گا کہ تو در پردہ  
مجھ پر مہرباں ہے ظاہر میں تغافل برت رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات سراسر غلط ہے۔

با ہمہ خرسندی از وی شکوہا دارم ہمی

تا نداند صید پرش هائی پنهانی مرا

لغت: ”پرش ہائے پنهانی“ پوشیدہ التفات اور توجہ میں اپنے محبوب سے خوش ہوں  
لیکن اس کے باوجود مجھے اس سے گلے شکوے بھی ہیں تاکہ کہیں وہ یہ نہ خیال کر لے کہ میں اس کی  
در پردہ نوازشوں کا شکار ہو چکا ہوں۔

برنیا یم با روانی های طبع خویشتم

موج آب گوهر من کردہ طوفانی مرا

لغت: ”طوفانی“ طوفان میں گھرا ہوا شخص۔ اس لفظ کے آخر میں ”ی“ قاعلی ہے۔

سادہ ترجمہ۔ میں اپنی طبیعت کی روانیوں سے پٹ نہیں سکتا۔ میں اپنے موتی کی چمک  
کی لہروں کے طوفان میں گھر گیا ہوں۔

فارسی کا ایک مصرعہ ہے: اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی، جو ضرب المثل ہو گیا ہے۔  
جس کا مطلب ہے کہ انسان کی ذہانیت اس کے لیے وبال ہو جاتی ہے۔ مرزا غالب نے اسی  
خیال کو اپنے اسلوب بیان میں سمویا ہے۔

لفظ گوہر کا ایک مفہوم اصل کا بھی ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے شاعر نے اسے اپنی طبع  
کے لیے استعمال کیا ہے۔ طبیعت کی چمک کو آب کہا ہے اور یہ چمک اتنی زیادہ ہے کہ اس سے  
روشنی کی لہریں ابھر رہی ہیں۔ گویا لہروں کا ایک طوفان پھا ہے۔ موج آب گوہر کی رعایت سے  
اس نے اپنی روشنی طبع کو، روانی طبع سے، تعبیر کیا ہے، گویا شاعر اپنی شاعرانہ طبیعت کی روانیوں  
میں غرق ہے۔

اُس کے ذہن سے دقیق افکار ابھر رہے ہیں۔ اور وہ خود ہی اس افکار میں کھویا  
ہوا ہے۔

تابہ راحت مُردم ویکرہ بخاکم نامدی

دوزخی گردیدہ اندوہ پشیمانی مرا

جب سے میں نے تیری راہ محبت میں جان دی تو ایک بار بھی میری خاک پر نہ آیا۔ اس  
پشیمانی کا غم میرے لیے دوزخ بن گیا ہے۔

خویش را چون موج گوهر گرچہ گرد آورده ام

دل پر است از ذوق انداز پر افشانی مرا

لغت: ”پرافشانی“ پر پھڑ پھڑانے کی حالت، اضطراب اور پریشانی کی حالت،



اگر چہ میں نے موتی کی چمک کی طرح اپنے آپ کو سمیٹ کے رکھا ہے پھر بھی دل اضطراب سے لبریز ہے۔

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جان دہم

گر بہ موج افتد گمان چین پیشانی مرا

مولانا حالی نے اس شعر کی کتنی سادہ شرح کر دی لکھتے ہیں: ”میں کیا ہی پیا سا ہوں لیکن اگر دریا کی موج پر مجھ کو یہ شبہ گزرے کہ دریا نے مجھے دیکھ کر اپنی پیشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت سے ساحل دریا پر جان دے دوں گا مگر حلق تر نہ کروں گا۔“

یہ شعر جذباتی محاکات کی ایک عمدہ مثال ہے اور غالب کے دل و دماغ کا آئینہ دار ہے۔

با سراج الدین احمد چارہ جو تسلیم نیست

ورنہ غالب نیست آہنگ غزلخوانی مرا

سراج الدین احمد کے سامنے سوائے تسلیم کے اور کوئی چارہ نہیں ورنہ غالب، میرا غزل خوانی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔



## غزل نمبر (۲۱)

از وہم قطر گیسٹ کہ در خود گمیم ما

اما چو وا ریم، همان قلزمیم ما

لغت: ”قطرگی“ میں ”ی“ مصدری ہے یعنی قطرہ ہونا مرزا کا ایک اردو شعر ہے۔

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر

یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

یعنی قطرہ، لہر اور حباب کی کوئی حیثیت نہیں، یہ سب سمندر ہی سے ابھرے ہیں اور ان کا وجود، کثرت موبہوم ہے۔

چنانچہ فارسی شعر کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ہم اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ہم قطرہ ہیں اور قطرے کا بھی کوئی وجود ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خودی میں ڈوب گئے ہیں ورنہ غور کیا جائے تو ہم وہی سمندر ہیں۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

در خاک از هوای گل و شمع فارغیم

از توسن تو طالب نقش سمیم ما



ہم خاک ہیں اور گل و شمع سے (جو زندگی کی بزم آرائیوں کی زینت ہوتے ہیں۔ بے نیاز ہیں ہم تو بحیثیت خاک کے صرف اس بات کے طالب ہیں کہ تیرے گھوڑے کی سموں کے سن ہی ہم پر پڑ جائیں۔

تمکین ما ز چرخ سبکسر پیاد رفت

خوش دستگاہ انجمن انجمیم ما

ہماری عظمت اس بے وقار آسمان کے ہاتھوں برباد ہو گئی ورنہ ہم تو ستاروں کی انجمن کا سرمایہ تھے۔

مردم بکینہ، محنت خون ہم اند و بس

خون می خوریم چون ہم ازین مردمیم ما

لوگ کینہ ورزی سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور بس۔ اور ہم یہ دیکھ کر اپنا خون پی رہے ہیں کہ ہم بھی انہی لوگوں میں سے ہیں، یعنی ان لوگوں کے کردار نے ہمیں بھی ذلیل کر دیا ہے۔

از حد گزشت شملہ و دستار و ریش شیخ

حیران این درازی یال و دیمیم ما

لغت: ”یال“ گھوڑے کی گردن کے بال۔

شیخ کی دستار، شملہ اور داڑھی حد سے بڑھ گئی ہے ہم اس کی گردن کے بال اور دم کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔ یہ شعر تمسخر آمیز ہے۔

دست ز ما بشوی مسیحا کہ زیر خاک

آب از تھب نصیب صدائی قمیم ما

اے مسیحا! تو اپنا ہاتھ ہم سے اٹھالے (اور یہ قم کہنا چھوڑ دے) کیونکہ ہم قبر میں پڑے تیرے قم کی آواز کی جیت کی گرمی سے پانی پانی ہو رہے ہیں۔

یعنی مسیحا ہمیں بڑی گرجوٹی سے قم کہہ کر بیدار اور زندہ کرنا چاہتا ہے اور ہم اس آواز قم کی بے اثری سے شرمندہ ہیں اور پانی پانی ہو رہے ہیں۔

پنھان بہ عالم ایم، ز بس عین عالمیم

چون قطره در روانی دریا گمیم ما

ہم اس کائنات میں گم ہیں کیونکہ ہم خود کائنات ہیں۔ جس طرح قطرہ سمندر میں گم ہوتا ہے کہ وہ خود سمندر ہے۔

مارا مدد ز فیض ظھوری است در سخن

چون جام بادہ، راتبہ خوار خمیم ما

ہم شاعری میں ظہوری سے فیض یاب ہیں۔ ہم جام شراب کی طرح خم کے وظیفہ خوار ہیں۔ ظہوری اُن چند فارسی شعراء میں سے تھا جن سے غالب کو بطور شاعر عقیدت تھی۔ چنانچہ اس کا ذکر وہ اکثر جگہ اپنے کلام میں کرتا ہے۔

غالب ز ہند نیست نوائی کہ می کشم

گوئی ز اصفہان و ہرات و قمیم ما



غالب یہ نوائے شعر، ہند کی نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اصفہان و ہرات اور قم کی سرزمین کے رہنے والے ہیں۔  
یہ تینوں شہر، ایران کے مشہور شہروں میں سے ہیں اور مختلف ادوار میں ایرانی سلطنتوں کے پایہ تخت اور ادبی مرکز رہے ہیں۔



### غزل نمبر (۲۲)

بہ نیم افگندہ نمی را چارہ رنج خمار ما  
قدح بر خویش می لرزد، ز دستِ رعشہ دایر ما  
ہم نے اپنے خمار کی تکلیف کو دور کرنے کے لیے جو چارہ کیا ہے (اور وہ شراب نوشی ہے) اس سے شراب خطرے میں پڑ گئی ہے۔ (خمار کے باعث) ہمارے لرزتے ہوئے ہاتھ سے جام نے خود بخود لرز رہا ہے۔

خوشا جانی کہ اندوھی فرو گیر سراپائش

ز نومیدی توان پرسید لطف انتظار ما

سادہ ترجمہ:-

کتنی خوش نصیب ہے وہ روح جس میں غم سر تا پا سا گیا ہو۔ ناامیدی سے پوچھا جاسکتا ہے کہ ہمارے انتظار میں کتنا لطف ہے۔

مرزا غالب کا تصور غم بہت صحت مندانہ ہے۔ انتہائے غم کی کیفیت انسان کو فراغت بخشی ہے اور سکون عطا کرتی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ جب روح انتہائی غم میں ڈوب جائے اور مایوسی کا عالم طاری ہو تو انسان کسی کے آنے اور نہ آنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس وقت انتظار بذات خود ایک پر لطف تجربہ بن جاتا ہے جو ناامیدی ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

نشستن بر سرِ راہِ تحیرِ عالمی دارد

کہ ہر کس می رود از خویش میگردد دو چارِ ما

لغت:- ”راہِ تحیر“ مقام حیرت ہے جہاں انسان یکسر کھو جاتا ہے اور اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

”از خویش رفتن“ اپنے آپ سے بیگانہ ہو جانا۔ بے خود ہو جانا۔ ہم راہ حیرت میں بیٹھے ہیں اور اس عالم میں ہونا بھی عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ جو شخص بھی اپنے آپ سے بیگانہ ہو کر یہاں سے گزرتا ہے اس کی ہم سے ضرور ملاقات ہو جاتی ہے۔  
تمام درد مند لوگ باطنی طور پر ایک دوسرے کے آشنا ہوتے ہیں۔

چون بوی گل جنون تازیم از مستی، چرمی پرسی

کسستن دارد از صد جا عنانِ اختیارِ ما

لغت:- ”جنون تاز“ وحشت جنوں میں آزادانہ گھومنے والا۔ ”کسستن دارد“ ٹوٹنے کی حالت میں ہے (اب ٹوٹی کہ ٹوٹی) لگام جب پرانی اور فرسودہ یا کمزور ہو اور جگہ جگہ سے ٹوٹنے والی ہو تو اس سے گھوڑے روک تھام نہیں ہو سکتی۔ ایسی لگام نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ گھوڑا جس طرف چاہے بے دھڑک جاسکتا ہے۔ اس استعارے کے ذریعے مرزا غالب اپنی مستی عشق کا ذکر



کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم مستی عشق میں بوئے گل کی طرح آزدانہ جس طرف چاہیں چلے جاتے ہیں۔ ہماری عنان اختیار تو سو جگہ سے ٹوٹنے والی ہے، یعنی ایک بے اختیاری کا عالم طاری ہے۔ عشق کی سرمستی جدھر چاہتی ہے ہمیں کشاں کشاں لیے جارہی ہے۔

فروز دھر قدر رنگ گل افزاید تب و تابش

کباب آتشِ خولیش است پنداری بھار ما

جس قدر پھول کا رنگ نکھرتا جاتا ہے، اسی قدر اس کی تب و تاب بڑھتی جاتی ہے، یعنی اس کا اپنا رنگ اس کے اندرونی سوز کا سامان ہوتا ہے۔ ہماری بہار گویا اپنی آگ ہی میں جل رہی ہے۔

یعنی ہمارا سوز دل کسی خارجی شے کا شرمندہ احساس نہیں۔

حریفان شورشِ عشق ترا بی پردہ دیدندی

بدامان گر نہ گشتی موسم گل پردہ دار ما

لغت: ”حریفان“ یا رلوگ۔ اگر موسم گل اپنے دامن سے ہماری پردہ پوشی نہ کرتا تو یا رلوگ تیرے عشق کی پیدا کردہ وحشت کو بے پردہ دیکھ لیتے۔ یعنی پھولوں کا موسم تھا اس لیے لوگوں نے ہماری وحشت کو بہار کی طرف منسوب کیا ورنہ لوگ سمجھ جاتے کہ ہماری دیوانگی تیری محبت کی وجہ سے ہے۔ مرزا غالب نے یہی بات ایک اردو شعر میں کس سادگی اور خوبصورتی سے بیان کی ہے:

چاک مت کر جیب بے ایام گل

کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

هنوز از مستی چشم تو می باله تماشای

بموج بادہ ماند پر تو شمع مزار ما

یہ ابھی تک تیری آنکھوں کی مستی سے سرشار ہے (پھولی نہیں ساتی) دیکھ کہ ہماری شمع مزار کی لوموج شراب معلوم ہوتی ہے۔ یعنی تیری مست آنکھوں سے شمع مزار کی سی افسردہ شے جگمگا رہی ہے۔

گویا مزار پر محبوب کی آمد نے رونق کا سما پیدا کر دیا ہے۔

بدین تمکین حریف دستبرد ناله نتوان شد

بود سنگ فلاخن مرصدا را کو ہزار ما

لغت: ”فلاخن“ پتھر پھینکنے کا ایک آلہ جسے اردو میں گوپھن یا گوپھیا کہتے ہیں۔ انجیل متیق کے حصہ زبور میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد گوپھیا چلانے کے بڑے دھنی تھے۔ سنگ فلاخن وہ پتھر ہے جو فلاخن میں رکھ کر پھینکا جاتا ہے۔

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہم انتہائی متانت اور تمکنت کے باوجود فریاد کو ضبط نہیں کر سکتے، چنانچہ اس بات کو یوں بیان کیا کہ اس متانت کے ساتھ ہم نالہ و فریاد کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس نالہ و شیون کے آگے تو ہماری پہاڑ جیسی تمکین و متانت ایسی ہے جسے فلاخن (یعنی گوپھیا) اٹھا کے دور پھینک دیتا ہے۔

خوشا آوارگی گر در نورد شوق بر بندو

بتار دامن شیرازہ مشقت غبار ما

محبوب کی آوارگی بھی کتنی اچھی ہے اگر وہ اپنے سفر شوق کو طے کرتے وقت، اپنے دامن



کے تار سے ہمارے منحنی بھر غبار کی شیرازہ بندی بھی کرتا جائے۔ یعنی محبوب جب آوارہ خرام بن کر نکلے تو ہماری خاک پر اپنے دامن کو جھٹکتا ہوا جائے اور جو منحنی بھر غبار ہماری تربت سے اٹھے، اسے اپنے دامن کی لپیٹ میں لے کر آگے بڑھے، ہمارے لیے یہی بہت بڑی سعادت ہوگی۔

بدین یک آسمان دردانہ می بینی، نمی بینی

کہ ماہ نو شد از سودن کفِ گوهر شمارِ ما

اس آسمان میں موتی دانوں (ستاروں) پر تیری نظر پڑی ہے اور تو یہ نہیں دیکھتا کہ ہمارا موتی گننے والا ہاتھ کس طرح گھس گھس کر نئے چاند کی طری لاغراور خیدہ ہو گیا ہے۔

یعنی محبوب کی نظر تاروں بھرے آسمان میں الجھی ہوئی ہے اور وہ عاشقوں کی اختر شمار سے بے خبر ہے۔

نہال شمع را بالیدن از کاھیدن است اینجا

گداز جو ہر ہستی است غالب آبیاری ما

لغت: ”نہال شمع“ اس سے مراد ابھرا ہوا شعلہ شمع ہے۔

”آبیاری“ آبیاری کرنے والا۔

نہال شمع کا پھلنا پھولنا اس کے کم ہونے سے ہوتا ہے۔ اے غالب زندگی! زندگی کے جو ہر گداز ہو کر ہماری آبیاری کرتے ہیں۔ جس طرح شمع گھلتی ہے تو اس کے گھلنے سے اس کی زندگی فروغ پاتی ہے اسی طرح انسانی زندگی کے گھٹنے ہی سے زندگی کی نشوونما ہوتی ہے۔ میری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورت خرابی کی۔



## غزل نمبر (۲۳)

پایانِ محبت یاد می آرم زمانی را

کہ دل عہد وفا نا بستہ دادم دستانی را

مرزا غالب اس شعر میں اپنی نادانی محبت پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں: اب جبکہ معاملات محبت انتہا کو پہنچ چکے ہیں اور محبوب کی بے وفائیاں اور اس کے جو رستم کی کوئی حد نہیں رہی، مجھے ابتدائے محبت کا زمانہ یاد آ رہا ہے کہ میں نے اس وقت محبوب سے کوئی پیمان وفا باندھے بغیر دل کیوں دے دیا تھا۔

عاشق کی نادانی یہ نہیں کہ اس نے دل دینے سے پہلے محبوب سے وفا کی کوئی شرط کیوں نہیں باندھی، کیونکہ دل دینا اختیاری بات نہیں۔ بلکہ ایسا سوچنا ہی نادانی اور حماقت ہے کہ اگر پیمان وفا باندھا بھی ہوتا تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا۔

فسونی کو کہ بر حال غریبی دل بدر آرد

بداندیشی باندوہ عزیزان شادمانی را

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ”بداندیشی باندوہ عزیزان شادمان“ سے مراد ایسا بداندیش شخص ہے جو عزیزوں کے غم پر خوش ہوتا ہو۔ یہ ساری عبارت محبوب کی صفت ہے۔ اس شعر کے آخر میں ”را“ کا لفظ جو بطور دیف آیا ہے۔ اضافی یعنی اضافت کا مفہوم دیتا ہے۔ یعنی دل بداندیش۔

کوئی ایسا فسوں ہے کہ جسے عزیزوں کے غم پر خوش ہونے والے بداندیش انسان کے دل پر پھونکا جائے تاکہ وہ کسی غریب کے حال کو دیکھ کر درد سے بھر آئے۔



اجازت داد پیشش یک دو حرف از درد دل گفتم

پس از دیری کہ بر خود عرضه دادم داستانی را

ایک طویل مدت تک میں اپنی داستان اپنے آپ ہی سے کہتا رہا اور اس کے بعد اس میں مجھے صرف اتنی اجازت دی کہ اپنے درد دل کی دو ایک باتیں اس سے کہوں۔

جهان هیچ است باوی لا جرم زینہا چه اندیشد

گرفتم کز فغانم دل زهم پاشد جہانی را

لغت: ”دل زہم پاشد“ یعنی دل ٹوٹ جائے اور اس کے ٹکڑے ایک دوسرے سے الگ ہو کر بکھر جائیں۔

’جہانے‘ میں ’ے‘ کثرت کا مفہوم دے رہا ہے۔ مراد ہے ایک دنیا، دنیا بھر پہلے مصرعے میں ’جہاں‘ کا لفظ جہاں والوں کے لیے آیا ہے۔ اسی لیے شاعر نے ان کے لیے ضمیر جمع استعمال کیا ہے۔ اور ’زہما‘ کہا ہے یعنی ان سے یا ’دنیا والوں سے‘ شاعر کہتا ہے کہ میں نے مان لیا کہ میری فریاد سے ایک دنیا کا دل درہم برہم ہو جائے گا لیکن میرے محبوب کی نظر میں جہاں یا جہاں والوں کی حیثیت بچ ہے۔ وہ انہیں کچھ نہیں سمجھتا، اس لیے وہ اُن سے کیا گھبرائے گا۔

میری فریاد سے دنیا والوں کے دل لرز جائیں تو لرز جائیں ان کے دل پر تو کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ندارم تاب ضبط راز و می ترسم ز رسوائی

مگر جویم ز بھر ہمزبانی، بی زبانی را

مجھ میں راز کو ضبط کرنے کی تاب نہیں اور ڈرتا ہوں کہ بات کروں گا تو رسوا ہو جاؤں گا۔ البتہ ایک صورت ہے کہ کوئی ایسا شخص مل جائے جسے اپنا ہمزبان بتالوں اور بے زبان ہو کر باتیں سنتا چلا جائے اور کسی سے نہ کہہ سکے۔

کشاد شستش از سستی ندارد و نشین تیری

مگر بر من گمارد آسمان زورین کمائی را

لغت: ”کشاد شست“ نشانے کے لیے کمان میں تیر کو رکھ کر اسے کھینچتا۔ ”زورین کمان“ ایسا تیر انداز جس کی کمان میں زور ہو۔

محبوب ایک ست سا (بے پروا سا) تیر انداز ہے وہ ایسا نشانہ نہیں لگاتا کہ سیدھا دل پر جا کر لگے۔ ہاں آسمان ہی کوئی سخت کماں انسان تلاش کر کے مجھ پر تیر اندازی کرنے کے لیے مقرر کر سکتا ہے۔

بیا در گلشن بنختم کہ در ہر گوشہ بنمائیم

ز جوش لالہ و گل در حنا پای خزانہ را

لغت: ”پا در حنا بودن“ پاؤں میں مہندی لگا کے بیٹھنا۔ خزاں بہار کی ضد ہے بہار رنگین پھولوں سے لدی ہوتی ہے اور خزاں ان رنگینیوں سے عاری ہوتی ہے۔ شاعر کے گلشن بخت میں بہار نہیں۔ خزاں ہے۔

بہار کے آنے تک خزاں گویا لالہ و گل کے نمودار ہونے کے جوش کو سینے میں لیے پڑی رہتی ہے، ایسے ہی جیسے کوئی حسینہ پاؤں میں مہندی لگائے پڑی ہو کہ کچھ وقت کے بعد حنا کا رنگ نکھرے گا۔



اس پس منظر میں مرزا غالب فرماتے ہیں کہ میرے گلشن بخت میں، خزاں لالہ و گل کو اس طرح لیے ہوئے بیٹھی ہے جس طرح کوئی حسینہ پاؤں میں حنا باندھے پڑی ہو، یعنی میرے گلشن کی زینت بہار میں ہے خزاں ہے اور میں اسی کو سامان رنگینی بنائے ہوئے ہوں اور اس امید میں ہوں کہ کبھی تو بہار آئے گی۔

کمال درد دل اصل است در ترکیب انسانی

بخون آغشته اند، اندر بن ہر موی جانی را

انسان کی زندگی کی ترکیب اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں انتہائی درد دل بنیادی شے ہے۔ چنانچہ انسان کے ہر بن موی میں ایک ایسی جان پوشیدہ ہے جو خون سے لت پت ہے۔ انسانیت کا کمال یہ ہے کہ اس میں انتہائی احساس درد ہو اور اس احساس درد کا یہ عالم ہو کہ جیسے ہر بن موی میں ایک (نئی) جان ہے جو خون میں پڑی رہی ہے۔

خورم خوف از تو بی حد، لیکن از زاری چه کم گردد

اگر شد زھر آب و برد اجزای فغانی را

میں تجھ سے بے حد خوف زدہ ہوں۔ لیکن میری اس حالت زار سے کیا کمی واقع ہو سکتی ہے کہ خوف سے پتا پانی ہو جاتا ہے اور اس میں میری فریاد کے تمام اجزاء بہہ جاتے ہیں۔ یعنی اس خوف کے عالم میں فریاد بھی لب پر نہیں آ سکتی۔

بہ شھر از دوست بعد از روزگار یا فتم غالب

ز عنوان خطی کز راہ دور آمد نشانی را

اے غالب! ایک طویل عرصے کے بعد مجھے شہر میں دوست کا نشان، ایک ایسے خط کے عنوان سے مل گیا جو بہت دور سے آیا تھا۔



### غزل نمبر (۲۴)

از تست اگر ساختہ پرداختہ ما

کفری نبود مطلب بی ساختہ ما

لغت: ”ساختہ پرداختہ“ دو مختلف لفظوں کا مرکب ہے اور ایک مفہوم دیتا ہے۔ ”ساختہ“ اور ”پرداختہ“ دونوں ضدیں ہیں، یعنی دونوں کے دو دو معنی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ”ساختہ“ کے ایک معنی بناوٹی ہیں اور دوسرے آراستہ اور آمادہ۔ اسی طرح پرداختہ کا ایک مفہوم فارغ شدہ اور دوسرا مشغول شدہ موخر الذکر مفہوم سے کنایۂ آراستہ اور پیراستہ کے معنی لیے جاتے ہیں۔ شعر میں شاعر نے ساختہ کو مجہول اور پرداختہ کو آراستہ کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، مراد ”برا بھلا“۔

کہتا ہے کہ اگر ہمارا برا بھلا جو کچھ ہے وہ تیری بدولت ہے۔ تو اگر ہم کسی غلط چیز کا تجھ سے مطالبہ کریں تو وہ کفر کی بات نہیں ہوگی۔



پروردہ نازیم بہ رحمت کدہ عجز

بر پای تو باشد سر افراختہ ما

عاجزوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ارباب عجز گو یا رحمت کدہ عجز میں رہتے ہیں اور اپنے عجز پر ناز کرتے ہیں۔ شاعر نے ایسے لوگوں کو رحمت کدہ عجز کے ناز پروردہ کہا ہے۔

کہتا ہے کہ ہم رحمت کدہ عجز کے ناز پروردہ ہیں اور اس سے ہمارا سر بلند ہے اور ہماری سر بلندی کی وجہ یہی ہے کہ ہمارا سر تیرے پاؤں میں پڑا ہے۔

در عشق تو بر ماست دیت اہل نظر را

ابروی تو تنگی بخیال آختہ ما

لغت: ”دیت“ خوں بہا۔ ”تنگ آختہ“ کھنچی ہوئی تلوار۔

تیرا ابرو ہمارے تصور میں ایک کھنچی ہوئی تلوار کی طرح ہے جس سے سب اہل نظر کا خون ہو رہا ہے۔ اس تصور کے باعث ان سب کا خون ہمارے سر ہے اور اُن کا خوں بہا ہم پہ واجب ہو گیا ہے۔

حیرانی ما آئینہ شہرت یار است

شد جادہ بہ کولیش نفس باختہ ما

لغت: ”نفس باختہ“ حیرانی کے باعث اکھڑا ہوا سانس۔ ہماری حیرانی شہرت یار کا باعث (آئینہ) بن گئی ہے۔ ہمارا اکھڑا ہوا سانس اس کے کوچے میں پگھلنے لگی ہو گیا ہے۔

جس طرح پگھلنے والی ہر ہر وکورا سے کی نشاندہی کرتی ہے اسی طرح عاشق کی حیرانی

سے لوگ اس کے محبوب کی دل آویزی حسن کا سراغ لگا کر ادھر کو چل پڑتے ہیں جس سے اس کی شہرت ہو رہی ہے۔

غالب مدّم افسون اقامت کہ بلائی است

دیوانہ از بند برون تاختہ ما

جب کسی دیوانے کا جوش جنوں حد سے بڑھ جائے تو اسے زنجیریں پہنا کر قید کر لیتے ہیں تاکہ وہ ایک جگہ ٹھہرا رہے۔ لیکن جب وہی دیوانہ زنجیریں نزا کر بھاگ نکلے تو اسے کسی بھی تدبیر سے قابو نہیں کیا جاسکتا۔ مرزا غالب فرماتے ہیں: اے غالب! ہمارے دیوانے کو، جو اپنے آپ کو قید و بند سے آزاد کرا کے بھاگ نکلا ہے، کسی افسون و سحر سے مقید کر کے ایک جگہ مقیم نہیں کیا جاسکتا۔



### غزل نمبر (۲۵)

خوش وقت اسیری کہ بر آمد ہوس ما

شد روز نخستین سبد گل، قفس ما

لغت: ”سبد گل“ پھولوں کی ٹوکری۔ رواج تھا کہ جب کسی کو پھولوں کا تحفہ پیش کرنا ہوتا تو پھولوں کو ٹوکری میں سجا کر لے جاتے تھے۔ (سب سے خوش رنگ پھول کو ٹوکری کے اوپر رکھتے تھے جو ”گل سرسبد“ کہلاتا تھا۔)



مرزا غالب کے اس شعر کا پس منظر ہبوطِ آدم ہے، جب وہ فردوس سے نکل کر اس عالم رنگ و بو میں آگیا اور اس کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ انسان کی ہوس اس کو یہاں لے آئی۔ حافظ کہتا ہے:

من ملک بودم و فردوس برین جاہم بود

آدم آورد درین دیر خراب آبادم

مرزا کہتے ہیں:

ہماری اسیری کا وقت بھی کیا اچھا تھا جب ہوس بروے کار آئی اور پہلے ہی دن پھولوں کی ٹوکری ہمارا قفس بن کر رہ گئی۔ اس شعر کو پڑھ کر ذہن مرزا صاحب کے اس شعر کی طرف جاتا ہے:

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

مہتاب نمکسار بود بادۂ ما را

ای بی مزہ بی روی تو بزمِ هوس ما

چاندنی ہماری شراب کے لیے طشتِ نمک کا کام دیتی ہے۔ تیرے حسین چہرے کے

بغیر ہماری بزمِ نشاط بے مزہ رہتی ہے۔

گویا محبوب کا درخشاں چہرہ چاندنی رات ہے جو عاشق کی بزمِ نہ نوشی کو چمکا دیتا ہے۔

حیرت زدہ جلوۂ نیرنگ خیالیم

آئینہ مدارید بہ پیشِ نفسِ ما

آئینے کے سامنے سانس لیں تو وہ سانس سے مکدر ہو جاتا ہے۔ آئینے کو شعراء حیران یا حیرت زدہ بھی باندھتے ہیں اس لیے کہ وہ گویا ٹکنکی باندھے ہمیں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہم خیال کی نیرنگیوں کے جلووں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو رہے گئے ہیں یعنی ان جلووں میں کھو گئے۔

آوازۂ شرع از سر منصور بلند است

از شب روی ماست شکوہ عَسّسِ ما

لغت: ”شبِ روی“ چوری کے لیے راتوں کو پھرنا اسی لیے ”شبِ رو“ کے الفاظ چور کے لیے آتے ہیں۔  
”آوازۂ“ بمعنی شہرت۔

منصور نے ”انا الحق“ کہا اور شرع کی رو سے انھیں دارِ پچ کھینچا گیا۔ گویا منصور اور اس کے جرم سے شریعت کی شان بلند ہوئی تھی۔  
”عَسّس“ کو تو ال کو کہتے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ ہماری ”شبِ روی“ یعنی ارتکابِ جرمِ عسّس کی شان و شوکت کو قائم کرتا ہے۔ دیکھ لو منصور ہی کی بدولت شریعت کی شان بلند ہوئی تھی۔

وقت است کہ خون جگر از درد بجوشد

چندان کہ چکد از مرثۂ دادِ رسِ ما

وہ وقت آن پہنچا ہے کہ ہمارا خون جگر درد سے اس قدر جوش میں آجائے کہ ہمارے دادِ رس کی پلکوں سے ٹپکنے لگے۔



در دهر فرورفته لذت نتوان بود

بر قند، نہ بر شہد نشیند مگس ما

لغت: ”مگس“ = مکھی ہے۔ ”فرورفته لذت“ = لذت میں غرق۔

مکھی ہر بیٹھی چیز پر بیٹھی ہے۔ لیکن جو مکھی شہد پر بیٹھتی ہے وہ وہیں کی ہو رہتی ہے۔ یہ گویا لذت میں ڈوب جانا ہے زندگی سے لذت اندوز ہونا اور ہے اور لذتوں میں غرق ہو کر وہیں کا ہو رہنا اور بات ہے۔

کہتا ہے کہ ہم سے دنیا کی لذتوں میں غرق نہیں ہوا جاتا۔ ہماری مکھی قند، یعنی مصری کی ڈلی پر بیٹھتی ہے، شہد پر نہیں بیٹھتی۔

قند پر بیٹھنے والی مکھی متحاسن چوستی ہے اور جب چاہتی ہے اڑ جاتی ہے۔ برعکس اس کے شہد پر بیٹھنے والی مکھی شہد ہی میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ غالب ہی کا ایک مطلع ہے:

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گذرد

خوشا روانی عمری کہ در سفر گذرد

ای بی خبر از نیستی و ذوق فراغش

در پیرہن ما نبود دُخار و خُس ما

لغت: ”فراغ“ سکون قلب ”فراغش“ میں ضمیر ”ش“ کا مرجع نیستی ہے۔

”دُخار و خُس“ جس کا لفظ جب خاشاک کے ساتھ آتا ہے تو اس سے کوڑا کرکٹ مراد لیتے ہیں اور دُخار کے ساتھ آئے تو کانٹے اور تنکے مراد ہوتے ہیں۔ ”دُخار“ فارسی میں تنکر اور اندیشہ کا مفہوم دیتا ہے۔ یہاں مرزا غالب نے دُخار و خُس کو دُخار کا ہم معنی استعمال کیا ہے اور

یہ مفہوم فراغ کی ضد ہے۔

صوفیہ کے نزدیک نیستی، خودی کے احساس سے یکسر عاری ہو جانا ہے۔ اس سے روح کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ”ہستی“ انسان کے صلب کو بے قرار رکھتی ہے جیسے پیراہن میں کوئی کاٹنا ہو اور پیہم خلش کا باعث ہو۔ شاعر کہتا ہے کہ تو نیستی اور اس سے حاصل ہونے والے سکون قلب سے بے خبر ہے۔ ہمیں دیکھ کہ ہمارے پیراہن میں ایسا کوئی کاٹنا نہیں۔

طول سفر شوق چہ پرسی کہ درین راہ

چون گرد فرو ریخت صدا، از جرس ما

لغت: ”چہ پرسی“ میں چہ، استفہام انکاری ہے، یعنی تو کیا پوچھتا ہے! مطلب ہے مت پوچھ۔

سفر شوق کہیں ختم نہیں ہوتا۔ ایک منزل کے بعد دوسری منزل سامنے آتی ہے۔ اور دوسری کے بعد تیسری ابھر آتی ہے اور اس طرح سے سفر کی درازی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے

مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اس سفر شوق کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ راہ و منزل یہاں تک کہ جرس کی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔ شاعر نے اس ساری کیفیت کو یوں بیان کیا: سفر شوق کی درازی کے بارے میں مت پوچھ۔ اس سفر میں تو گھنٹی کی آواز، جرس سے یوں جھڑگئی ہے جس طرح گرد کسی شے سے جھڑ جاتی ہے۔

حوران بھشتی کہ ندارند گلابی

بر خویش فشامند گدازِ نفس ما



لغت: ”گداز نفس“ سانس کے حرارت قلب سے پگھل جانے کو گداز نفس کہا گیا ہے اور وہ سانس چونکہ شاعر کا سانس ہے اس لیے معطر بھی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ حورانِ بہشتی کے پاس گلاب نہیں اس لیے میرے سانس کے گداز کو بطور عطر کے استعمال کرتی ہیں۔ شعر میں صرف تعلق ہے۔



## غزل نمبر (۲۶)

شکستِ رنگ تا رسوا نہ سازد بی قراران را

جگر خون است از بیمِ نگاہتِ رازداران را

لغت: ”بے قراران“ = عاشقانِ بے قرار۔ ”شکستِ رنگ“ = چہرے کا رنگ اڑنا۔

حسن سے متاثر ہو کر عاشقان بے قرار کے چہروں کا رنگ اڑا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ اس راز سے واقف ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں وہ راز کو فاش نہ کر دیں اور عاشقوں کے رنگِ شکستہ کی وجہ بیان نہ کر دیں معشوق گھور گھور کر انھیں دیکھ رہا ہے اور وہ بے چارے اس کی نگاہِ خشم آلود سے دبے ہوئے ضبط کیے بیٹھے ہیں اور اس ضبط کا یہ عالم ہے کہ ان کا جگر خون ہو رہا ہے۔

ز پیکانِ های ناوک در دلِ گرمِ نشانِ بُود

بہ ریگستانِ چہ جوئیِ قطرہِ های آبِ باران را

”پیکان“ تیر کی انی کو کہتے ہیں۔ ”دلِ گرم“ وہ دل ہے جس میں سوزِ محبت ہو۔ شاعر

نے تیر کے چمکتے ہوئے پیکان کو بارش کے قطرے اور اپنے دلِ گرم کو ریگستان کہا ہے اور یہ دونوں نادر استعارے ہیں۔

کہتا ہے کہ تیرے تیر کے پیکان کا میرے دلِ گرم میں کوئی نشان نہیں ملتا۔ میرے قلب کی حرارت سے تو ان کا وہی حشر ہوتا ہے جو پتے ہوئے ریگستان میں بارش کے قطرؤں کا ہوتا ہے۔

بود پیوستہ پشتِ صبر کوہِ از گراں جانی

چہ افسوں خواندہٗ درگوشِ دلِ امیدواران را

لغت: ”پشت بر کوہِ بودن“۔ بہت بڑا سہارا لیے ہوئے ہونا۔ ”گراں جانی“۔ سخت جانی۔ لیکن گراں کے معنی صرف سخت اور محسوس ہی کے نہیں۔ بلکہ گراں، قیمتی اور بھاری کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے، محبت میں صبر کرنے اور امیدیں لگائے رکھنے والوں کو ”گراں جان“ کہا ہے جو بے حد بلیغ بات ہے۔ یہ لوگ بھاری بھر کم ہیں انھیں محبت ہے ناز ہے، صبران کی پشت پناہ ہے اور وہ امیدوں پہ بیٹے جا رہے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ تو نے امیدواروں کے گوشِ دل میں کیا افسوں پھونک دیے کہ اپنی گراں جانی سے صبر کیے ہوئے ہیں اور یہ ایک ایسا سہارا ہے جیسے کوئی پہاڑ سے پیٹھ لگائے ہوئے بیٹھا ہو۔

مرزا غالب کے حسبِ ذیل شعروں میں بھی اسی جذبے کا اظہار پایا جاتا ہے:

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا

افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

امید دانہ و بالید و آشیان گد شد

در انتظارِ ہما دامِ چیدنم بگر



کفِ خاکیم از ما بر خیزد جز غبار آن جا

فزون از صرصری نبود قیامت خاکساران را

اس شعر کی ردیف ”را“ برائے کامفہوم دیتی ہے۔ قیامت کے دن مردے جی اٹھیں گے اور ہر شے میں ایک جان تازہ آجائے گی۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ ہم تو مٹی بھر خاک ہیں، قیامت آئیگی تو کیا ہوگا۔ ہمارے لیے تو قیامت ایک صرصر یعنی تند ہوا کا جھونکا ہے۔ جو آئے گا اور ہماری مٹی بھر خاک کو غبار کی صورت میں اڑا دے گا اس کے سوا اور کیا ہوگا۔

بہ ترکِ جاہ گو تا گردش ایام بر خیزد

کہ گلخن تاب دائم در نظر دارد بھاران را

لغت: ”گلخن“۔ آتشدان اور ”گلخن تاب“ حمام گرم کرنے والے (یعنی حمامی) کو کہتے ہیں۔ ترجمہ: گردش ایام سے کہہ دے کہ وہ ترک جاہ کرے کیونکہ حمام والا ہمیشہ بہار ہی کو پیش نظر رکھتا ہے۔

در آبی خود بہ بازی گاہ اہل حسن تا بنی

بروی شعلہ، گرم مشق جولان، فی سواران را

لغت: ”نے سوار“ بچے جو چھڑی کو گھوڑا بنا کر سواری کرتے ہیں، ایسے بچوں کو ”سوار“ کہتے ہیں، مراد معصوم کم سن بچے ”جولان“ = اچھلتے کودتے تیز تیز چلنا۔ ”بازی گاہ“ کھیل کود کی جگہ۔

اہل حسن کے تیور بچپن ہی سے چکھے ہوتے ہیں۔ ان کے معصومانہ مشاغل میں بھی بلا کی شوخیاں ہوتی ہیں جنہیں شاعر نے یوں بیان کیا ہے کہ وہ گویا شعلوں سے کھیلے ہیں۔ کہتا ہے: ذرا

بے خودی کے عالم میں، اہل حسن کی بزم ادا و ناز میں آ اور دیکھ کہ وہاں معصوم حسن کیسے شعلوں پہ رقص کر رہا ہوتا ہے۔

”نے سوار“ کا لفظ شعر میں بہت سوزوں آیا ہے۔ شعلوں سے کھیلنا ”نے سوار“ یعنی معصوم بچے ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ”بے خود“ کا لفظ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ حسن کی سرمستیوں کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان پر خود بھی بے خودی کی کیفیت طاری ہو۔

نگشت از سجدہ حق جہہ زہاد نورانی

چنان کا فروخت تاب بادہ روی بادہ خواراں را

لغت: ”زہاد“ زاہد کی جمع ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حق پرستوں کے چہرے ایمان کے نور سے چمک اٹھتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ زاہدوں کی پیشانیاں اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ، ریز ہونے سے اتنی نورانی نہیں ہوتیں جس قدر میٹھو اوروں کے چہرے شراب سے تابناک ہو جاتے ہیں۔ اس شعر میں ظاہر پرست زاہدوں پر طنز کی گئی ہے۔

در بے آگاہی کافر دگی گردد سر و برگش

ز مستی بھرہ جز غفلت نہ باشد ہوشیاراں را

لغت: ”سر و برگ“ ساز و سامان، سرمایہ۔ شاعر ”آگاہی“ کا لفظ علمی بصیرت کے لیے لایا ہے اور ذی علم حضرات کو ”ہوشیاراں“ کے لقب سے یاد کیا ہے۔

صحیح علم اور آگاہی سے صرف بصیرت ہی نہیں بلکہ قلب کی روشنی بھی حاصل ہوتی ہے۔ ایسی آگاہی کو عرفان کہتے ہیں۔ عرفان ایک ایسی مستی ہے جس سے قلب کے در پے کھلتے ہیں۔ برعکس اس کے اہل علم کی مستی محض بیہوشی ہے جس کا نتیجہ غفلت ہے۔



کہتا ہے: افسوس ہے اس آگاہی پر جو افسردگی کا باعث بن جائے۔ صاحب ہوش لوگوں کی مستی محض بیہوشی ہوتی ہے۔ ان کے علم کا نشہ انہیں اپنے آپ سے غافل بنا سکتا ہے۔ وہ حافی کیفیت عطا نہیں کر سکتا۔

ز غیرت میکدازد در خجالت گاہ تا شرم

ز بون دیدن بدست شیشہ بازان کو ہساران را

لغت: ”شیشہ بازان“ = باز مگر جو شیشہ سر پر رکھ کر ناچتے ہیں۔ کنایہٴ دغا اور مکار کو بھی کہتے ہیں۔

شیشہ، پتھر یا چٹان اور پہاڑ کے مقابلے میں بڑی نازک چیز ہے۔ مرزا غالب نے شخصے کی رعایت سے شیشہ بازوں کا لفظ ایسے لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے جو کمزور ہونے کے باوجود اپنی فریب کاریوں سے بڑے بڑے توئمند، ٹھوس اور باوقار انسانوں پر غالب آ جاتے ہیں اور انھیں عاجز اور زبون حال کر دیتے ہیں۔ مرزا غالب ایسے لوگوں کی حالت زار کا تصور کرتے ہیں اور اس سے اتنا متاثر ہوتے ہیں کہ غیرت سے گداز ہو جاتے ہیں، یعنی پانی پانی ہو جاتے ہیں۔

برنجم غالب از ذوقِ سخن خوش بودی ار بودی

مرا لخصی شکیب و پارہٴ انصاف یاران را

مرزا غالب کو اپنے ذوقِ سخن کی بلندی پر ناز تھا اور ساتھ ہی وہ اپنے دوستوں اور حریفوں کی کم ذوقی اور ناقدری سے شامی بھی تھے۔

کہتے ہیں۔ غالب مجھے اپنے ذوقِ سخن سے دکھ ہوتا ہے (کہ قدرت نے مجھے اس قدر

بلند ذوق عطا کیا ہے) کتنا اچھا ہوتا کہ میرے دوستوں میں انصاف کا کچھ مادہ ہوتا اور وہ میرے ہنر کی قدر کرتے، یا پھر مجھ میں ہی تھوڑا سا برداشت اور تحمل کا مادہ زیادہ ہوتا۔



## غزل نمبر (۲۷)

سپرم دوزخ و آن داغھائی سینہ تابش را

سرابی بود در رہِ تھنہٴ برقِ عتابش را

لغت: ”سراب“ وہ چمکتی ہوئی ریت جو دور سے پانی معلوم ہوتی ہے اور پیاسے مسافر ادھر کو لپکتے ہیں۔

کہتا ہے کہ میں نے دوزخ اور دوزخ کی آگ کے جلادینے والے شعلوں میں غوطہ لگا کر (ٹپ کر کے) دیکھا جو اس محبوب کی برقِ عتاب کے شیدائیوں (پیاسوں) کے لیے محض سراب کی حیثیت رکھتے تھے۔

یعنی محبوب کے غصے کی گرمی کے مقابلے میں دوزخ کی آگ نیچ ہے۔

ز پیدائی حجاب جلوہ سامانِ گردشِ نازم

کفِ صہباست گوئی پنبہ مینایِ شرباش را

لغت: ”پیدائی“ ظاہر ہونا اور ”حجاب“ پیدائی کی ضد یعنی پردہ۔ فلسفہ الہیات میں پیدائی اور حجاب، شہود و غیب ہے۔

”کف“ جھاگ کو کہتے ہیں ”کف صہبا“ وہ جھاگ ہے جو جوشِ مے کے باعث



صراحی سے کہ منہ پر ابھر آتا ہے۔

صراحی کے منہ کو روئی سے بند کرتے تھے۔ شاعر کی نظر میں یہ روئی، جو شراب کو چھپانے کے لیے استعمال ہوئی ہے، شراب کا جھاگ معلوم ہوتی ہے یعنی شراب صراحہ کے پردے میں چھپنے کے باوجود ظاہر ہوئی جا رہی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

حسن نے ظاہر ہو کے بھی ایک حجاب کا انداز اختیار کیا ہے لیکن وہ ایسا حجاب ہے کہ جس سے جلوے ابھر رہے ہیں اور میں حسن کی اس ادا پر نازاں ہوں۔ گویا اس کے میناے شراب کی روئی کف صہبا معلوم ہوتی ہے۔

مرزا غالب نے اپنے اس اردو شعر میں بھی اسی خیال کو ادا کیا ہے۔

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں  
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

ندانم تاچہ برق فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم

تصور کردہ ام بکستن بند نقابش را

محبوب کے حسن کو برملا دیکھنا تو درکنار اس کے بے نقاب چہرے کے تصور سے بھی عاشق کے ہوش جاتے رہتے ہیں۔ اس کیفیت کو شاعر نے برق فتنہ کا نام دیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ میں نے اس کے چہرے کے بند نقاب کو کھولنے کا تصور کیا ہے۔ نہ جانے میرے ہوش پر کبھی برق فتنہ آکر گرے گی۔

دم صبح بھار این مایہ مدھوشی نمی ارزد

صبا بر مغز دھر افشانند گوئی رخت خوابش را

لغت: ”دم صبح بھار“ دم وقت ہے، مراد ہے صبح بھاری کیفیت۔

کہتا ہے کہ صبح بھار کا وقت تو کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس سے انسان پر مدھوشی طاری ہو جائے یوں مفلوم ہوتا ہے کہ صبا نے اپنے بستر خواب کو دنیا کے دماغ پر جھاڑ دیا ہے۔ (جس سے دنیا والوں پر خیندگی سی مدھوشی طاری ہو گئی ہے)۔

سوادش داغ حیرانی، غبارش عرض ویرانی

جہان را دیدم و گردیدم آباد و خرابش را

لغت: ”سواد“ کے کئی ایک معنی ہیں: سیاہی رنگ، حوالی شہر یا آبادی شہر اور علمی استعداد۔

یہاں مرزا غالب نے اسے آبادی جہاں کے لیے استعمال کیا ہے۔ آبادی کی ضد ویرانی ہے جس کے لیے شاعر ”غبار“ کا لفظ لایا ہے۔

”سوادش“ اور ”غبارش“ دونوں میں ش کے ضمیر کا مرجع ”جہاں“ ہے جو دوسرے مصرعے میں آیا ہے۔

”سواد“ کے لفظ کی ذو معنویت کے اعتبار سے مرزا غالب نے سواد جہاں کو داغ حیرانی کہا ہے۔ ویران جگہ سے غبار اٹھتا ہے اس لیے اسے جہاں کی ویرانی کی علامت قرار دیا ہے۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس جہاں کی آبادی داغ حیرانی ہے۔ اس کا غبار ”عرض ویرانی“ ہے، یعنی اس غبار سے ویرانی ہی ویرانی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے جہاں کو دیکھا ہے اور اس کے آباد اور ویران دونوں کو لوٹا دیا، یعنی یکسر بدل دیا۔

ز تاب تشنگی جان را نوید آبرو بخشم

کمند جذبہ دریا شناسم موج آبش را



لغت: ”تاب تشنگی“ = پیاس کی تڑپ۔

میں پیاس کی تڑپ سے اپنی جان کو آبرو بخشتا ہوں۔ سمندر کے پانی کی لہریں میری نظروں میں وہ مکند ہیں جس کے ذریعے وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔

کسی شے کی انتہائی خواہش اور اس کے حصول کا بے پناہ جذبہ اور ولولہ انسانی سعی و عمل کا سرچشمہ ہے۔ اس انتہائی خواہش کے لیے شاعر نے تشنگی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اگر راہ رو حیات کے دل میں یہ جذبہ موجزن ہو تو منزل مقصود خود اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے سمندر کی لہریں پیاس کے لیے مکند بن جاتی ہیں اور وہ کشاں کشاں ادھر کو جاتا ہے۔

زمن کز بی خودی در وصل رنگ از بوی نشنا سم

بھر یک شیوہ نازش بازی خواہد جوابش را

لغت: ”ش“ کے ضمیر کا مرجع محبوب ہے۔ ”ہر یک شیوہ نازش“ = اس کے (یعنی محبوب کے) ناز و ادا کا ہر انداز۔

وصل میں میرا یہ حال ہے کہ میں بے خودی اور محویت کے عالم میں رنگ اور بو میں امتیاز نہیں کر سکتا اور ادھر محبوب کے ناز و انداز کی یہ کیفیت ہے کہ وہ مجھ سے اپنے ہر تیور کا جواب طلب کرتا ہے، یعنی محبوب یہ چاہتا ہے کہ میں اُس کی ہر ادا کی داد دوں۔

سوار تو سن ناز است و برخاکم گزر دارد

بہال ای آرزو چندان کہ دریابی رکابش را

لغت: ”بالیدن“ = پھلنا پھولنا، بڑھنا اور فروغ حاصل کرنا، بال، ”بالیدن“ سے فعل

اگر ہے۔

محبوب اسب ناز پہ سوار ہے اور میری خاک پر سے گزر رہا ہے۔ اے میری آرزو (آرزوے پابوسی) تو اتنی تیز ہو جا کہ بڑھ کر اس کی رکاب کو پا لے (اور چوم لے)۔

شکایت نامہ گفتم در نوردم روان گردو

ہمان در راہ قاصد ریخت رشکم پیچ و تابش را

میں نے شکایت نامہ لکھا، اسے تہ کیا تاکہ روانہ کر دیا جائے۔ وہیں میرے رشک کے جذبے نے اپنا پیچ و تاب، قاصد کی راہ میں ڈال دیا۔

یعنی، محبوب کا خط قاصد کے سپرد کرتے ہوئے مجھے سخت رشک آیا، پھر اسی رشک کا پیچ و تاب حائل ہو گیا اور میں خط نہ بھیج سکا۔

مرزا غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

پنوں بہ قاصد بسپرم پیغام را

رشک نگزارد کہ گویم نام را

ندانم تا چسان از عہدہ دروش برون آیم

ز شادی جان بھا گفتم متاع کم میابش را

لغت: ”از عہدہ چیزے برون آمدن“ کسی چیز سے عہدہ برآ ہونا۔

”متاع کم میاب“ جو چیز کم مقدار میں نہیں مل سکتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کے درد محبت سے کیسے عہدہ برآ ہو سکوں گا۔ میں نے یونہی خوشی کے عالم میں اپنی جان کو اس کے متاع درد کی قیمت کہہ دیا، حالانکہ وہ ایسی متاع ہے جو کم مقدار میں دستیاب ہی نہیں ہوتی۔

یعنی درد محبت جنس کثیر ہے کوئی شخص تھوڑا سا درد مول لینا چاہے تو میسر نہیں آ سکتا۔ میں



نے یونہی اپنی جان دے کر اُسے خریدنا چاہا۔ جان کی دردِ محبت کے سامنے کیا حیثیت ہے۔

زخوہاں جلوہ ، و زما بی خودان جان رونما خواہد

خریدارِ راست ز انجم تا بہ شبنم آفتابش را

لغت: ”رونما“۔ وہ تجھ ہے جو دلہن کے منہ دکھانے پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسے رونمائی

بھی کہتے ہیں۔

یہ عام خیال ہے کہ کائنات کی ہر شے حسنِ ازلی کی گرویدہ ہے لیکن مرزا غالب نے اس خیال کو بے حد خوبصورت اور بلیغ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:

اس کی ذاتِ حسینوں سے جلوہ اور ہم عاشقوں (بے خودوں) سے جان بطور رونمائی طلب کرتی ہے۔ ستاروں سے لے کر شبنم تک ہر شے اس کی خریدار ہے۔

یوں انجم سے کر شبنم تک سے مقصود ہر وہ شے ہے جو آسمان اور زمین پر ہے لیکن شاعر انجم اور شبنم کے الفاظ کو بڑے فنکارانہ انداز میں لایا ہے۔ شبنم کے قطرے پر۔ تو خورشید کے سامنے آکر فنا ہو جاتے ہیں اور ستارے تو اس کے سامنے آنے کی تاب ہی نہیں لاسکتے۔ یہ شعر جذباتی منظر کشی کی (جسے ہم انگریزی زبان میں Imagery کہتے ہیں)۔ ایک حسین مثال ہے۔

خیالِ صیدِ دامِ تیج و تابِ شوق بود لقا

من از مستی غلطِ کردم بشوخی اضطرابش را

لغت: ”غلط کردن“۔ اشتباہ کردن یعنی کسی چیز کو غلطی سے کچھ اور سمجھ لینا۔ اس کا یعنی

میرے محبوب کا خیال میرے جذبہ شوق کی بے تابیوں کے جال میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے محویت کے عالم میں اس اضطراب (یعنی بے تابیوں) کو اپنے شوق کی شوخی سمجھ لیا، یعنی میں دل کے

اضطراب کو جذبہ شوق کا نتیجہ سمجھا، حالانکہ یہ اضطراب اور یہ بے تابیاں محبوب کے خیال یا تصور کا نتیجہ تھیں۔

اس میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ یہ سارا اشتباہ یا غلط فہمی اس لیے ہوئی کہ خیالِ یار سے مجھ پر ایک محویت کا عالم طاری ہو گیا تھا۔

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب

رگ جان کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را

اے غالب! میں مولانا ظہوری کے اسلوبِ نظم و نثر کے اثر سے زندہ ہوں۔ میں نے اس کی کتاب کے اوراق کے شیرازے کو اپنی رگ جاں بنالیا ہے۔



## غزل نمبر (۲۸)

دامِ محرم صہبا بود پیالہ ما

بگردِ مہر تنید است خطِ حالہ ما

لغت ”ہالہ“۔ وہ سفید سادارہ جو کبھی کبھی چاند یا سورج کے گرد نمودار ہوتا ہے۔ ہالہ ماہ کو

علامتِ باراں اور ہالہ مہر کو علامتِ جنگ و جدال خیال کیا جاتا ہے۔

”محرم“ = محرم میں بار پانے والا آشنایا واقف کار۔

یہاں مرزا غالب نے پیالے کو ”محرم صہبا“ کہا ہے۔ گویا وہ پیالہ ایسا ہے کہ ہمیشہ



شراب سے آشنا ہے یعنی لبریز شراب، پیالہ شراب سے بھرا ہے، شراب سورج کی طرح چمک رہی ہے اور اس کے گرد پیالے کا کنارہ سورج کے ہالے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ مرزا غالب جام سے کے لیے ایک نہایت خوبصورت استعارہ لائے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہماری شراب ایک آفتاب درخشاں ہے اور لب جام ایک ہالہ ہے جو اس آفتاب کے گرد ابھرا ہوا ہے۔

زہمی زگر مئی خویت، نفس گران مایہ

گداز نالہ ما، آبیار نالہ ما

معشوق کی طبیعت کی گرمی اور تند خوئی سے عاشق کا سانس سینے میں پکھل کر رہ جاتا ہے لیکن اس سے فریادیں دیتی نہیں ہیں۔ ایک فریاد کے بعد دوسری فریاد لب پر آتی ہے۔ گویا ایک نالہ پکھلتا ہے تو اس کے گداز سے دوسرے نالے کی آبیاری ہوتی ہے۔ محبوب کی اس گرمی خو سے پے بہ پے فریاد کرنے کو شاعر نے نفس یعنی سانس کا گراں مایہ ہونا کہا ہے، یعنی سانس پھلتا پھولتا ہے اور بھاری بھرکم ہوتا جاتا ہے۔

چمن طراز جنونیم و دشت و کوہ از ماست

بہ مھر داغ شقائق بود قبالہ ما

لغت: ”شقائق“ لالے کے پھول (سرخ)۔ لالے کے پھول کے اندر ایک سیہ داغ ہوتا ہے جسے شاعر نے مہر سے تشبیہ دی ہے۔ ”قبالہ“ = بیعت نامہ یا ضمانت نامہ۔ شاعر نے داغ لالہ کو مہر قرار دیا ہے قبالے پر لگی ہوئی ہے ”چمن طراز“ چمن کی آرائش کرنے والا۔

شاعر کہتا ہے کہ ہم جنون کے چمن کی آرائش کرنے والے ہیں اور یہ پہاڑ اور میدان ہمارے ہیں۔ اس کے لیے لالے کے داغ کو دیکھو کہ وہ ایک مہر ہے جو اس بات کی تصدیق

کرتی ہے کہ دشت و کوہ ہماری ملکیت ہیں۔ مراد یہ ہے کہ کوہ و دشت کی رونق ہمارے ہی دم سے ہے۔ کہ ہم جوش جنوں میں وہاں گھومتے رہتے ہیں۔ گویا قدرت نے انھیں ہمارے حق میں وقف کر دیا ہے۔

بدل زبور تو دندان فشرده ایم و خوشیم

ز استخوان اثری نیست در نوالہ ما

لغت: ”بدل دندان افشردن“ کوئی ناگوار کام کرنا۔ ہم اپنے دل کو دانتوں سے چبائے چلے جاتے ہیں اور خوش ہیں۔ ہمارے ان نوالوں میں ہڈی کا کوئی نشان نہیں۔ یعنی محبت کی تلخیوں کو بڑی خوشی سے سہتے جا رہے ہیں۔

تو زود مستی و ما راز دار خوئی تو ایم

شراب در کش و پیانہ کن حوالہ ما

لغت: ”زود مست“۔ جو تھوڑی سی پی کر جلدی ہی بدست ہو جائے۔ یعنی تو جلد ہی بدست ہو جاتا ہے اور ہم تیری اس خو سے واقف ہیں، اس لیے شراب پی اور پیانہ ہمارے ہاتھ میں دے دے (تاکہ ہم تجھے شراب اندازے سے پلا سکیں)

درازی شب ہجران ز حد گذشت بیا

فدای روی تو عمر ہزار سالہ ما

شب فراق حد سے زیادہ طویل ہو گئی ہے۔ ہماری ہزار سالہ زندگی تیرے دیدار پر قربان، اسب آجا۔



شاعر نے ”عمر ہزار سالہ“ کے الفاظ بڑی فنکارانہ مہارت سے استعمال کیے ہیں۔ ان سے ایک تو محبوب کے وصال کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس نعمت کے عوض ہزار سال کی عمر قربان کی جاسکتی ہے دوسرے شب فراق کی طوالت کا احساس ہوتا ہے کہ جدائی کی یہ رات کاٹنے کاٹنے سالہا سال گزر گئے۔

جنون بہ بادیہ پرواز گلستان بخشید

سواد دیدہ آهوست داغ لالہ ما

لغت: ”سواد دیدہ“ آنکھ کی پٹلی یا سیاہی اور ”داغ لالہ“ دونوں سیاہ ہوتے ہیں۔ اسی رعایت سے شاعر نے ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی ہے۔

ہرن کی وحشت مشہور ہے یہ وحشت اس کی آنکھوں سے نکلتی ہے اور پھر ہرن جنگل میں مجنوںوں کی طرح گھومتا بھی ہے۔ اس پس منظر کو مد نظر رکھ کر دیکھیے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں کہ ہماری وحشت جنون نے، بیابان کو گلستان کی پرواز بخش دی یعنی جنگل باغ کی طرح لہلہانے لگا ہے۔ چنانچہ جنگل میں گھومنے والے آہو کے سیاہی ہمارے اس لہلہاتے گلستاں کے لالہ کا داغ ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ہماری وحشت جنوں سے جنگل میں گلستاں کی سی بہار ہے اور یہاں ہرن کی آنکھ کی سیاہی بھی ہمیں داغ لالہ نظر آتی ہے۔

ز سعی ہرزہ بہ بی حاصلی علم کشتیم

چو باد بید پدید آمد از امالہ ما

لغت: ”امالہ“ لغت میں ایک چیز کو دوسری چیز کی طرف لے جانے اور صرف و نحو کی اصطلاح میں ”الف“ کو ”ے“ سے بدلنے کو کہتے ہیں، جیسے ”رکاب“ سے ”رکیب“ اور ”باد“

سے ”بید“

”بید“ ایک درخت ہے جس پر پھل نہیں لگتا۔

علم کشتن = مشہور ہونا، نمایا ہونا۔

ہم اپنی بے سود کوششوں کے باعث اپنی محرومیوں میں نمایاں ہو گئے ہیں۔ ہمارے عمل امالہ میں ’باد نے‘ بید کی صورت اختیار کر لی۔ مرزا غالب نے اپنی سعی لا حاصل کے لیے باد سے بید کے امالہ ہونے کا استعارہ استعمال کیا ہے جو بہت نادر ہے باد یعنی ہوا کی حرکت بھی بے مقصد ہوتی ہے اور بید بھی بے ثمر ہوتا ہے۔

ہمین گداختن است آبروی ما غالب

گھر چہ ناز فرد شد بہ پیش ژالہ ما

اے غالب! محبت کا سوز و گداز ہی ہماری آبرو ہے ہمارے ژالے (اولے) کے مقابل گوہر کیا ناز کر سکتا ہے۔ موتی اور اولہ دونوں میں آب و تاب ہوتی ہے لیکن موتی پر گرمی کا کوئی اثر نہیں ہوتا، برعکس اس کے ژالہ ذرا سی حرارت سے بھی پکھل جاتا ہے۔ سوز و گداز ہی سے تو زندگی کی آبرو ہے۔





## غزل نمبر (۲۹)

نہفت شوخی بی پردہ شور بجکش را

ز بادہ تندہ ایس بادہ برد رنگش را

لغت: ”شور جنگ: لگاؤٹ ظاہر انداز دشمنی۔

محبوب کی بے باک شوخیوں سے اس کا ظاہری لگاؤٹ کا انداز دب کر رہ گیا۔ اس شراب کی تندہ اور تیزی سے اس شراب کا رنگ مات ہو گیا۔

شراب میں اصل شے اُس کی تیزی اور تندہ ہوتی ہے۔ رنگ ایک بناوٹی چیز ہے۔ اسی طری محبوب کی بے باک شوخیاں بتاتی ہیں کہ اس کا اظہار عداوت مصنوعی ہے۔

کدام آئینہ با روی او مقابل شد

کہ بیقراری جوہر نبرد رنگش را

”جوہر آئینہ“ آئینے کی چمک کو کہتے ہیں قدیم زمانے میں جب آئینہ فولاد کا ہوتا تھا تو برسات کی نمی سے اسے رنگ لگ جاتا تھا، چنانچہ اسے صیقل کر کے جلا دیتے تھے۔

شاعر کہتا ہے کہ کون سا آئینہ تیرے رو برو آیا کہ تیرے چہرے (کے حسن) سے اس کا جوہر تڑپ نہ اٹھا ہو۔ اور اس تڑپ سے اس کا رنگ نہ جاتا رہا ہو۔ صوفیہ قلب انسانی کو

آئینے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس آئینے کی حسن ازلی سے جلا ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں کوئی دل ایسا نہیں کہ اس پر حسن ازلی کا عکس نہ پڑا ہو اور وہ چمک نہ اٹھا ہو۔

چو غنچہ جوش صفای تنش ز بالیدن

دریدہ بر تن نازک قبای تنش را

کلی جب جوش شباب پہ آتی ہے تو اس کی قبا چاک ہو جاتی ہے۔ ”صفا“ حسن کا ایک وصف ہے جسے ہم لطافت کہہ سکتے ہیں۔ شاعر محبوب کے جوش شباب کا نہیں بلکہ اس کی صفائے بدن کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کلی کی طرح میرے محبوب کا جوش صفائے بدن اس قدر ابھرا کہ باوجودیکہ وہ بہت نازک بدن تھا، اس کی قبا بے تنگ چاک ہو کر رہ گئی۔

ز گرمی نفس دل در اہتر از آمد

شرارہ شہر پرواز گشت سکش را

لغت: ”اہتر از“ اس کے لغوی معنی اونٹ کا مستی میں آکر رقص کرنا۔ عام مفہوم کیف و مستی ہے۔

”شہر“ وہ بڑا پر ہے جس کے بل پر پرندہ اڑتا ہے۔

پہلے مصرعے میں ”نفس“ کے لفظ میں ”ش“ کا ضمیر دل کا مضاف الیہ ہے اور ”او“ کا مفہوم دیتا ہے۔ پہلے مصرعے کی ترکیب لفظی یہ ہے۔ ”از گرمی نفس دل اور اہتر از آمد“ شاعر نے گرمی نفس کو شرارہ اور محبوب دل سخت کو سنگ کہا ہے۔

پتھر کھرائیں تو ان میں سے چنگاریاں نکلتی ہیں جس سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ پتھر میں شرر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن پتھر ان چنگاریوں سے متاثر نہیں ہوتا شاعر کہتا ہے کہ میرے نفس



آتشین نے اس کے دل پر اثر کیا اور وہ جھومنے لگا۔ دیکھو اس کے پتھر کی ایک چنگاری نے دل کو پر لگا دیے اور وہ کیف و سرور میں پرواز کرنے لگا۔

نظارۂ خطِ پشتِ لبش ز خویشم بُرد

زبادہ نشہ فزون دادہ اند بگلش را

لغت:- ”بگل“ وہی اردو کا لفظ بھنگ ہے۔

شاعر نے سبزۂ خط کے لیے بھنگ کا استعارہ استعمال کیا ہے۔

شراب اور بھنگ دونوں نشہ آور چیزیں ہیں۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے پشت لب پر سبزۂ خط کو دیکھ کر مجھ پر بے خودی طاری ہو گئی۔ اس کی بھنگ میں شراب سے بڑھ کر نشہ موجود ہے۔

چہ نغمہ ہا کہ بہ مرگم سرود پنداری

ز رشتہ کفتم تار بود چنگش را

لغت:- ”چنگ“ ایک ساز کا نام ہے جس میں تار ہوتے ہیں۔ ”پنداری“ تو خیال کرے، گویا معلوم ہوتا ہے۔

میرے مرنے پر اس (محبوب نے کیا کیا نغمے گائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساز (چنگ) میرے کفن کے دھاگے کے تھے۔

شعر میں ”چہ“ کا استفہام بڑا موزوں ہے۔ سیاق و سباق کے اعتبار سے بالخصوص کفن کے لفظ سے ”کیا کیا نغموں“ سے مراد المناک نغمے ہوں گے لیکن اس کے بعیدی معنی طربناک بھی ہو سکتے ہیں کہ محبوب کو عاشق کی موت پر کتنی خوشی ہوئی ہے۔

بہ حشر وعدہ دیدار کردہ، بی تابم

شباب من بسر آرد مگر درگلش را

لغت:- ”درنگ“۔ دیر۔ تاخیر شعر میں یہ لفظ شباب کی ضد کا مفہوم دے رہا ہے۔ ”مگر“= شاید ہو سکتا ہے۔

کہتا ہے کہ محبوب نے قیامت کے روز اپنے دیدار دکھانے کا وعدہ کیا ہے اور میں شوق دیدار کے لیے سخت بے تاب ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میری بے تابی (جلدی) ہی اس کی تاخیر کو ختم کر دے۔ یعنی میں بے تابیوں کے ہاتھوں جان دے دوں اور پھر اس کے دیدار سے فیض یاب ہو جاؤں۔

اس شعر میں یہ بھی ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے کہ میری بے تائیاں ایسا حشر برپا کریں کہ وہ ایفائے عہد پر مجبور ہو جائے۔

جگر نشانہ نھم، بر خود اعتماد نیست

مباد دل بہ تپش رد کند خدگلش را

مجھے اپنے پر اعتماد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا دل تڑپ اور سوز کے عالم میں اُس کے تیرا رد کر دے، اس لیے میں نے اپنے جگر کو اس کے تیر کا ہدف بنانے کے لیے تیار رکھا ہے۔

اس شعر میں ”مباد“ کا لفظ بے حد بلیغ واقع ہوا ہے۔ یہ کلمہ دعا یہ ہے۔ اس کا مفہوم یہی ہے کہ عاشق یہ نہیں چاہتا کہ محبوب کا تیر کسی طرح بھی چوک جائے یا خطا ہو جائے، کیونکہ اس کے جذبہ عشق کا تو یہ عالم ہے کہ:

خود اٹھالتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

مقصود شاعر یہی ہے کہ دل اور جگر دونوں تیر کھانے پر آمادہ ہیں۔ اس شعر سے ذہن



مرزا غالب کے حسب ذیل شعر کی طرف جاتا ہے۔

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے ہوئے ہیں  
وہ دن گئے کہ دل سے اپنا جگر جدا تھا

کشیدہ ایم بدیوانگی ز شوخی دوست  
بگونہ گو نہ ادا ناز رنگ رنگش را

ہم نے محبت کی دیوانگی کے عالم میں شوخی محبوب کی طرح طرح کی اداؤں پر سوسا نواز  
میں ناز اٹھائے ہیں۔

اس شعر میں دو ترکیبیں آئی ہیں۔ ”گونہ گو نہ ادا“ اور ”ناز رنگ رنگ“ دونوں میں  
تکرار الفاظ بڑی تہ دار چیز ہوتی ہے اور اُس سے معنویت کے کئی ایک پہلو ابھرتے ہیں۔ مرزا  
غالب نے اس شعر میں تکرار سے نہ صرف شعری بلاغت بلکہ موسیقیت بھی پیدا کی ہے۔  
علاوہ بریں اس شعر میں شوخی بیان بھی آگئی ہے اور اس شوخی بیان میں شوخی دوست کی  
رعنائیاں جھلکتی ہیں۔

ز ظرف غالب آشفته گر نہ ای آگاہ

بیاز ما بہ می میند ہوش و هنگش را

لغت: ”ہوش و ہنگ“ ہنگ وقار و ہوشیاری کا مفہوم دیتا ہے اور ہوش کا مترادف ہے۔  
کہتا ہے اگر تو، غالب کے حوصلے اور ظرف سے واقف نہیں ہے تو اس کے ہوش کو تند و  
تیز شراب پلا کر آزما، یعنی دیکھ کہ وہ کتنی شراب پی سکتا ہے۔ اور پی کر ہوش کو نہیں کھو دیتا۔ شاعر  
نے پہلے مصرعے میں اپنے لیے ”غالب آشفته“ کہا ہے اور آشفگی ہوش و خرد کی ضد ہے۔ چنانچہ وہ

کہنا چاہتا ہے کہ میری آشفگی پر نہ جا۔ میرا اصل رنگ دیکھنا ہو تو شراب تند پلا اور پھر دیکھ کہ  
میرے ہوش و خرد کے جوہر کیسے کھلتے ہیں۔  
مرزا غالب کا یہ مصرع دیکھیے۔

بے می نکلند در کف من خامہ روائی  
کہ می کے بغیر میرے ہاتھ میں قلم نہیں چلتا۔



### غزل نمبر (۳۰)

رازِ خویت از بد آموز تو می جوئیم ما

از تو می گوئیم گر با غیر می گوئیم ما

لغت: ”بد آموز“ جو دوسروں کو غلط سبق سکھائے۔ گمراہ کرنے والا شخص۔

ہم تیری طبیعت کے راز کو تیرے بد آموز (یعنی رقیب) سے معلوم کر لیتے ہیں چنانچہ  
ہم اگر غیر (یعنی رقیب) سے کوئی بات کرتے ہیں تو تیرے بارے میں کرتے ہیں۔ (تاکہ اس  
کی رائے تیرے متعلق معلوم ہو سکے)۔

حشر مشتاقان همان بر صورتِ مرگان بود

مرز خاکِ خوشن چون سبزہ می روئیم ما



شاعر نے عاشقوں کے لیے مشتاقوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی دیدار محبوب کے مشتاق ہیں۔ دیدار محبوب کے لیے مڑگاں کا اٹھنا لازمی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ مشتاقوں کا حشر بھی مڑگاں کی طرح ہوتا ہے۔ ہم لوگ سبزے کی طرح ہی خاک سے اُگ آتے ہیں۔

رازِ عاشق از شکستِ رنگ رسوا می شود

با وجودِ سخت جانیِ ها تنک روئیم ما

لغت: ”شکست رنگ“ رنگ کا اڑنا۔

”تنک رو“ ایسا شخص جس کا چہرہ جلدی سے بے قابو ہو کر بدل جائے۔ شاعر ”تنک رو“ کا لفظ سخت جان کے مقابل میں لایا ہے۔ عاشق یوں تو سخت جان ہوتا ہے لیکن چہرے کا رنگ فوراً اڑ جاتا ہے اور اس کی محبت کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ عاشق کا راز رنگ کے اڑنے سے فاش ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ (عاشق) باوجود سخت جان ہونے کے نرم رو واقع ہوئے ہیں۔

زینِ بھار آئینِ نگاہانِ بو کہ پزیرد یکی

عمرِ ها شد رخِ بخونِ دیدہ می شوئیم ما

لغت: ”بھار آئین نگاہاں“ آرائش کو کہتے ہیں کہ ”بھار آئین“ سے مراد بھار کو آراستہ کرنے والے۔ بھار آئین نگاہاں وہ حسین لوگ جو اپنی نظروں سے بھار کو زینت بخشنے ہیں۔ ہم مدتوں سے اپنے چہرے کو آنکھوں کے خون سے دھوتے چلے آ رہے ہیں۔ خدا کرے یہ ان حسین نگاہوں والوں میں سے جن کی نظریں بھاروں کی آرائش ہیں کوئی ہمیں بھی قبول کر لے۔ ہمارا چہرہ بھی تو سرخی خون سے رشک بھاراں ہو رہا ہے۔

تا چھا مجموعہ لطف بھاران بودہ ای

تا بہ زانو سودہ پایِ ما و می پوئیم ما

سبحان اللہ! کتنا خوبصورت شعر ہے۔ مرزا غالب نے محبوب کو مجموعہ لطف بھاراں کہا ہے، یعنی بھاروں کی لذتوں کا سرچشمہ کہ جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتیں اور یہ مفہوم ”تا چھا“ کے الفاظ نے پیدا کیا ہے۔ ”تا چھا“ کا مطلب صرف کتنا یا کیسا ہی نہیں بلکہ ”لا انتہا“ ہے چنانچہ کہتا ہے کہ تو لطف بھاراں کا وہ ختم نہ ہونے والا سرچشمہ ہے کہ جسے دیکھتے دیکھے ہمارے پاؤں زانو تک گھس گئے ہیں۔ اور ابھی تک ہم چلے جا رہے ہیں۔

زحمتِ احبابِ نتوان داد غالب بیش ازین

ھر چه می گوئیم بھر خویش می گوئیم ما

اے غالب! اس سے زیادہ ہم احباب کو کیا زحمت دیں، اب تو ہم جو کچھ کہتے ہیں اپنے لیے کہتے ہیں۔

یعنی دوستوں سے کب تک دادِ سخن کی توقع کریں گے۔ اب خود ہی شعر کہتے ہیں اور خود ہی اس کی داد بھی دیتے ہیں۔





## غزل نمبر (۳۱)

ای روی تو بہ جلوہ در آوردہ رنگ را

نقش تو تازہ کردہ بساطِ فرنگ را

لغت: ”فرنگ“۔ فرانس، اٹلی کے لیے بالخصوص اور یورپ کے لیے بالعموم استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ حسن و رعنائی کی علامت کے طور پر بھی آتا ہے۔ یہاں بساطِ فرنگ سے مقصود بساطِ حسن ہی ہے۔

تیرے (حسین) چہرے سے رنگِ حسن چمک اٹھا اور رعنائیوں کے نقش تازہ ہو گئے۔

از نالہ خیزی دلِ سخت تو در ہم

در عطشِ شرِ مفلکِ مغزِ سنگ را

لغت: ”تب“ = پیچ و تاب۔

”عطش“ = چھینک۔ مسلسل چھینکوں کا آنا ایک عارضہ بھی ہے جسے عربی میں ”عطاس“ کہتے ہیں پتھر سے جو چنگاریاں نکلتی ہیں۔ شاعر نے انھیں عطشِ شر کہا ہے گویا وہ آتشیں چھینکیں ہیں جو مغزِ سنگ سے نکل رہی ہے۔

شاعر نے محبوب کے دلِ سخت کو سنگ یعنی پتھر کہا ہے۔ اس پتھر سے دل پر غمِ حبیب کا اثر ہوا ہے۔ اور وہ فریاد کر رہا ہے جسے دیکھ کر عاشق کا دل بھی بے قرار ہو رہا ہے اور پیچ و تاب میں ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے:

میں تیرے دلِ سخت کی آہ و فریاد سے پیچ و تاب میں ہوں۔ (خدا کے لیے) اس مغزِ سنگ یعنی اپنے پتھر سے دل کو شررِ باریوں پر مجبور نہ کر۔

از عمرِ نوح عرض برد انتظار و تو

در عرضِ شوق تاب نیاری درنگ را

تیرا انتظار تو نوح کی عمر کو بھی کم کر دیتا ہے اور تیری حالت ہے کہ تو اظہارِ شوق کے معاملے میں ذرا سی بھی تاخیر گوار نہیں کرتا۔

یعنی تیرے انتظار کا عرصہ اتنا طویل ہے کہ اُس کے مقابل عمرِ نوح کم معلوم ہوتی ہے، اور جب انتظار ختم ہو جائے اور اظہارِ شوق کا وقت آتا ہے تو تجھ میں اتنی بھی تاب نہیں کہ اُسے ذرا آرام سے سن لے۔

داغم کہ در ہوائِ سر دامنِ کیست

در خونِ من ز نازِ فرو بردہ چنگ را

لغت: ”چنگ“ = پنچہ، ہاتھ۔

میں رشک سے جل کر داغ ہو گیا ہوں کہ وہ شخص جس کا پنچہ بڑے ناز سے میرے خون میں پڑا ہے، کسی اور کے دامن کو ہاتھ میں لینے کی فکر میں ہے۔





## غزل نمبر (۳۲)

سوزد ز بسکہ تابِ جمالش نقاب را

دانم کہ درمیان نہ پسندد حجاب را

چونکہ اس کے حسن و جمال کی چمک سے اس کا نقاب جل اٹھتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ یہ بات گوارا ہی نہیں کرتا کہ اس کے اور دیکھنے والوں کے درمیان کوئی حجاب حائل ہو۔

پیراہن از کتان و دمام ز سادگی

نفریں کند پردہ دری ماہتاب را

لغت: ”کتان“ کتان اور کتان دونوں طرح درست ہے۔ ایک نازک اور باریک سا کپڑا ہوتا ہے جو اسی کے پودے کے چھلکے سے بنتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ کتان ایک پودے کا نام ہے جس کے ریشے لے کر یہ کپڑا بناتے ہیں شعراء کا عقیدہ ہے کہ کتان کا کپڑا چاندنی کی تاب نہ لا کر پھٹ جاتا ہے۔ شعر میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے، یعنی یہ ”صنعت تہج“ ہے۔

کہتا ہے کہ محبوب کا لباس کتان کا ہے اور وہ سادگی دیکھو کہ وہ لگا تار چاندنی کو کوستا ہے کہ اُس نے میری پردہ دری کر دی ہے (حالانکہ نازک اور باریک لباس سے اس کا رنگ بدن خود بخود نمایاں ہو رہا ہے۔ اس شعر میں لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ لباس کتان کا پھٹنا (جو محض ایک عقیدہ ہے) چاندنی کے باعث نہیں بلکہ جوش شباب کی وجہ سے ہے۔

تا خود شمی بہ ہمدی ما بسر برد

در چشم بخت غیر رہا کرد خواب را

اس خیال سے کہ وہ (محبوب) ایک رات ہماری صحبت میں گزارے اس نے رقیب کی چشم نصیب میں نیند ڈال دی ہے یعنی رقیب کے نصیب کو سلا دیا ہے۔ گویا عاشق کے ساتھ معشوق کا شب بسر کرنا رقیب کی بدبختی کی دلیل ہے۔

نارفتہ، دم ز وعدہ باز آمدن زند

تا در وصال یاد دہد اضطراب را

عاشق اپنے محبوب کے وصال سے فیض یاب ہے اور اسے ایک گونہ آسودگی حاصل ہے۔ لیکن محبوب کی شوخی ادا دیکھے کہ وہ عاشق کی اس آسودہ حالت کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے اور ایک اضطراب کی کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے جو وصال سے پہلے انتظار میں تھی۔ چنانچہ محبوب اٹھ کر جاتا تو نہیں، لیکن ظاہر یہ کہتا ہے کہ اچھا میں چلا، میں وعدہ کرتا ہوں کہ لوٹ کر آ جاؤں گا۔ اس سے مقصود جانا آنا نہیں، بلکہ وصال کے عالم میں اضطراب کی کیفیت پیدا کرنا جسے دیکھ کر محبوب کو خوشی ہوتی ہے۔

در دل خزد بہ لایہ و از جاں بدر کشد

دیرینہ شکوہ ستم بی حساب را

مرزا غالب نے اس شعر میں حسن کی اثر انگیزی کے ایک لطیف پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حسن کا انداز محبوبانہ کس طرح عاشق کے دل سے وہ شکوہ شکایتیں (جو وہ ہمیشہ بظاہر کرتا رہتا ہے۔) دھو ڈالتا ہے۔

کہتا ہے وہ (محبوب) بڑے انداز محبوبی سے دل میں سما جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ تمام پرانے گلے شکوے جو اس ستم ہائے لاقعداد سے ہماری روح میں دبے ہوتے ہیں، دھو کر دیتا



ہے۔ اس شعر سے مولانا حالی کا یہ شعر یاد آتا ہے:

آتے ہی اُن کے بھول گئیں کلغین تمام  
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسمان نہ تھا

جرات نگر کہ ہرزہ بہ پیش آمدِ سوال

گیرم بہ بوسہ ز آن لب نازک جواب را

ذرا میری جرات دیکھو کہ یونہی بے فائدہ سوال کرنے سے پہلے ہی میں اس لب نازک کا بوسہ لے لیتا ہوں اور جواب حاصل کر لیتا ہوں۔ درحقیقت وہ سوال بوسے ہی کا تھا، سو اس کا عملی جواب بھی مل گیا۔

نازم فروغ بادہ ز عکسِ جمالِ دوست

گوئی فشرودہ اند بجام آفتاب را

لغت: جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا، فارسی میں بالعموم جمع غائب کا صیغہ جب بلا فاعل آئے تو وہ ماضی مجہول کا مفہوم دیتا ہے۔ ”فشرودہ اند“ کا مفہوم یہاں آنکھوں نے نہ چوڑ کر ڈالائیں بلکہ نہ چوڑ کر ڈال دیا گیا ہے۔

کہتا ہے جمالِ دوست کے عکس سے شراب چمک اُنھی ہے اور میں اس پر ناز کرتا ہوں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پیالے میں دھوپ کا رس نہ چوڑ کر ڈال دیا گیا ہے۔

سوزد ز گرمی اش می و او همچنان بہ لھو

ریزد ز آگینہ بہ ساغر شراب را

وہ بڑے لالہ لیا نہ پن سے شراب کو صراحی سے ساغر میں اٹھیلتا چلا جا رہا ہے اسے یہ احساس ہی نہیں کہ شراب اس کی تاب جلوہ کی حرارت سے جل رہی ہے۔

آبش دھم ببادہ و او ہر دم از تمیز

نوشد می و ز جام فرو ریزد آب را

میں اسے شراب میں پانی ملا کر دیتا ہوں اور وہ ہر بار بڑی ہی مہارت سے پانی اور شراب میں امتیاز کر لیتا ہے، چنانچہ شراب پی جاتا ہے اور پانی گرا دیتا ہے۔

آسودہ باد خاطر غالب کہ، خوی دوست

آمیختن ببادہ صافی گلاب را

غالب کی عادت ہے کہ وہ ہمیشہ شراب ناب میں گلاب ملا کر پیتا ہے۔ اللہ کرے اس کا دل آسودہ ہو۔

آسودگی ایک تو اس لیے حاصل ہوگی کہ یہ عادت اچھی ہے۔ دوسرے اس لیے کہ

شراب و گلاب کی آمیزش بھی آدمی کو آسودگی بخشتی ہے۔





## غزل نمبر (۳۲)

نوید الفات شوق دادم از بلا جان را

کمند جذبہ طوفان شمر دم موج طوفان را

لغت: ”بلا“ = آلام و مصائب ”نوید“ خوش خبری ”الفات شوق“ = شوق کی توجہ یعنی شوق کی تیزی یا ابھار۔

محبت میں مصائب کا سامنا ہو تو مرزا غالب کا شوق بجائے دب جانے کے اور بھی تیز ہو جاتا ہے، گویا مصائب سے اس کی جان یا روح کو بے انتہا خوشی ہوتی ہے اور مصائب کے طوفان کی آمد ایک خوش خبری ہے۔

چنانچہ دوسرے مصرعے میں اسی جذبے کے لیے اس نے طوفان ہی کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ کہتا ہے کہ مصائب کے طوفان کی ہر لہر میری نظر میں ایک کمند ہے جس کے ذریعے طوفان کو اپنی طرف کھینچا جاسکتا ہے۔

مرزا غالب کا یہ اردو شعر بھی دیکھیے:

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے

خانہ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا

یعنی طوفان کی آمد پر دل کیسے کیسے خوشی کے نعرے لگانے لگا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ

جیسے ہمارا گھر، گھر نہیں بلکہ طوفان کے پانی سے ابھرنے والی آوازوں کا ساز ہے۔

پرستارم جگر در باخت، یا رب در دل اندازش

ز بی تابی بہ زخم سرگون کردہ، نمکدان را

لغت: ”پرستار“ = تیمار دار

میرا تیمار دار (میری حالت سے گھبرا کر) اپنا جگر گنوا بیٹھا ہے۔ اے خدا! اس کے دل میں یہ بات ڈال دے کہ وہ گھبراہٹ اور بیتابی میں نمکدان کو میرے زخموں کی طرف جھکا دے، یعنی میرا تیمار دار میری حالت زار کی تاب نہیں لاسکتا اور گھبرایا ہوا ہے۔ کاش وہ اس گھبراہٹ میں بے ساختہ میرے زخموں پر نمک پاشی کر دے تاکہ میرے زخم زیادہ خراب ہو جائیں اور مجھے زیادہ لذت نصیب ہو۔

چنان گرم است بزم از جلوہ ساقی کہ پنداری

گداز جوهر نظارہ در جام است مستان را

لغت: ”مستان را“ میں را اضافی ہے یعنی اضافت کے لیے آیا ہے چنانچہ ”گداز جوہر نظارہ در جام است مستان را“ سے مراد ہے: گداز جوہر نظارہ در جام مستان است۔

ساقی کے جلوہوں سے محفل اپنی گرم ہو گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مستوں کے جام میں شراب نہیں بلکہ جلوہ ساقی کے نظارے کے جوہر گداز ہو کر پڑے ہیں مراد یہ ہے کہ رندے خوار شراب سے بڑھ کر جلوہ ساقی سے سرشار ہو رہے ہیں۔

ندارم شکوہ از غم با هجوم شوق خرسندم

ز جا داشت جوش دل همانا داغ ہجران را

مجھے غم سے کوئی شکایت نہیں۔ میں تو شوق کی فراوانیوں سے شاد ماں ہوں کہ اس جوش شوق نے میرے دل سے داغ فراق کو لیکھت دھو ڈالا ہے۔



تھا از نامہ آہنگ دریدن ریخت در گوشت

ز پشت ناخم نسترده نقش روئی عنوان را

شعر کا سادہ ترجمہ یہ ہے۔

قضا نے (ابھی) میرے پشت ناخن سے خط کے پتے کے نقش بھی نہیں کھرچے تھے کہ اس نے میرے کان میں خط کے پھاڑ ڈالنے کی آواز ڈال دی، یعنی میں نے ابھی خط کو کھولا ہی نہیں تھا کہ اسے پھاڑ دینے کا خیال آ گیا۔

مرزا غالب کے معشوق نے خط پر پتا کچھ اس طرح لکھا تھا کہ اسے کھرچ کے مٹا دیں مناسب تھا۔ لیکن مٹانے سے پہلے مکتوب الیہ یعنی مرزا کے دل میں یہ خیال آیا کہ جب عنوان یعنی پتے کی بد عنوان کا یہ عالم ہے تو خط کا نفس مضمون معلوم۔ بہتر ہے اسے پھاڑ ہی دیا جائے گویا جس گستاخانہ (ظالمانہ) انداز سے محبوب نے پتا لکھا تھا اس سے معلوم ہو گیا ہے کہ خط میں کیا لکھا ہوگا۔

ہے تن چسپید بازم از نم خونناہ پیراھن

خراس سینہ سطر بخیمہ شد چاک گریبان را

عاشق نے وحشت میں گریباں کو چاک کیا، لیکن اس پر بھی اس کی وحشت کم نہ ہوئی۔ عاشق سینے کو ناخنوں سے کھرچنے لگا خون بہا اور اس کی نمی سے پیراہن جسم سے چمٹ گیا جس سے گریباں کا چاک بھی ایک طرح غائب ہو گیا۔ گویا سینے کی خراش نے نیچے کا کام کیا وہ خراش نیچے کی لکیر بن گئی۔

مقصود یہ ہے کہ گریباں چاک کرنے سے بھی کچھ نہ بنا وحشت بدستور قائم رہی اور جس گریباں کو چاک کیا تھا اسے دوبارہ چاک کرنے کی صورت پیدا ہو گئی۔

ہے جرم تاب ضبط نالہ با من داوری دارد

ز شوخی می شمارد زیر لہر، دزدیدن افغان را

لغت: "افغان" = نفاں۔ افغان، نفاں کی اصلی صورت ہے الف سا قبط ہو کر نفاں رہ گیا۔ "نفاں را زیر لب دزدیدن" یعنی فریاد کو لبوں ہی میں دبالیٹا، ضبط کرتا۔ میں ضبط فریاد کرتا ہوں اور وہ میرے تاب ضبط کو ایک ایک جرم سمجھ کر میری خطا کا سوا حذہ کرتا ہے وہ فریاد کو زیر لب چھپا لینے کو (یعنی ضبط کرنے کو) گستاخی خیال کرتا ہے۔

هنوز آئینہ مای پذیرد عکس صورت ها

چوناصح خندہ زد، اندر دل افشردیم دندان را

لغت: دندان در دل افشردن = انتہائی قلق میں ڈوب جانا۔

کیا کریں ہمارا آئینہ (آئینہ دل) ابھی تک مختلف صورتوں کے عکس کو قبول کر لیتا ہے۔ چنانچہ جب ہمارا ناصح ہماری حالت پر ہنستا ہے تو ہمیں انتہائی قلق ہوتا ہے۔

تکلف بر طرف، لب تھنہ بوس و کنار ستم

ز راھم باز چین دام نوازشھای پنھان را

صاف بات تو یہ ہے کہ ہم بوس و کنار کے پیاسے ہیں ہمارے راستے سے ان چھپی چھپی نوازشوں اور مہربانیوں کے دام اٹھا دو۔

محبت بر ملا ہی کی جائے تو عاشق کے دل کو تسکین ہوتی ہے۔

ہے مستی گر بہ جنت بگزی زخار نفرتی

سرابی در رہ ہستی تشنہ دیدار جانان را



اگر تو مستی کے عالم میں (جو جنت کی فضا سے پیدا ہوتی ہے) جنت سے گزرے تو خبردار اس کا قریب نہ کھالینا جنت تو دیدارِ جانان کے پیاسوں کے لیے ایک سراب ہے یعنی جنت: نشانِ راہ ہے منزل نہیں ہے

چمن سامانِ مہی دارم کہ دارد وقت گل چیدن

خرامی کز ادایِ خویش پر گل کردہ دامان را

لغت: ”چمن سامان“ جس کا سرمایہ حسن چمن ہے۔ وہ محبوب جو سرتاپا خود چمن ہے۔

یعنی میرا ایک ایسا سرتاپا چمن معشوق ہے کہ جو پھول چنتے وقت اس انداز سے چلتا ہے کہ اس کے خرام کی ہر ادا اس کے دامن کو پھولوں سے بھر دیتی ہے، یعنی اس کی ہر ادا پھولوں سے بھری ادا ہے۔

بہ اندازِ صبوحی چون بہ گلشن ترکتاز آری

پریدن های رنگِ گل شفقِ گردد گلستان را

لغت: ”صبوحی“ صبح کی شراب

جب تو صبح کی شراب پی کر گلشن میں تیز خرامی کرتا ہے تو پھولوں کے رنگ اڑا کر باغ پر شفق بن کر چھا جاتے ہیں۔

کبابِ نو بھار اندرِ تنورِ لالہ می سوزد

چہ فیض از میزبانِ لالہ ابالی پیشہ، مہمان را

مرزا غالب نے لالے کی سرفخی کو تنور کہا ہے اور اسے ایک میزبان لالہ ابالی قرار دیا ہے کہ

جسے کسی مہمان کی پروا نہیں ہے۔ وہ اپنی آگ کے شعلے فروزاں کیے ہوئے ہیں کوئی جلتا نہ تو جلتے۔

اور بہار کو چمن کا مہمان بنایا ہے۔ بہار آتی ہے تو چمن جگمگا اٹھتا ہے لیکن بقول شاعر اگر کا یہ جگمگا اٹھنا گویا آگ میں جلنا ہے۔

یعنی بہار میں شگفتگی کہاں؟ وہ تو گویا شعلوں میں جل رہی ہے۔

چہ دودِ دل، چہ موجِ رنگِ درہر پردہ ازہستی

خیالمِ شانہ باشد طرہِ خوابِ پریشان را

لغت: ”دودِ دل“ دل کا دھواں یعنی غم کی فریادیں۔

”موجِ رنگ“ رنگ کی لہریں یعنی خوشیوں کا ہجوم یا طوفان۔

زندگی خوشیوں سے لبریز ہو یا فریادوں سے انسانی ذہن کی خیال آرائیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک خواب پریشاں ہے جسے انسان کا خیال آراستہ کرتا رہتا ہے اور اپنے دل کی تسلی کی خاطر اس کی مختلف تعبیریں کرتا ہے اس کیفیت کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے کہ دودِ دل ہو یا موجِ رنگ، زندگی کا ہر پہلو (یعنی غم اور شادی) ایک خواب پریشاں ہے جس کی زلفوں کو آراستہ کرنے کے لیے میرا خیال ایک شانے کا کام دیتا ہے۔

بہ شبِ ہا پاس ناموست ز خویشم بدگمان دارد

ز شورِ نالہ میریزم نمک در دیدہ دربان را

راتوں کو تیری عزت و ناموس کا پاس (پاسبانی) کرتے ہوئے میں اپنے آپ سے بدگماں ہو جاتا ہوں۔ میں اپنی فریادوں کی تیزی کا نمک دربان کی آنکھوں میں ڈال دیتا ہوں کہ اسے یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کون فریاد کر رہا ہے۔



ز مستی محو پا کو بی بود هر گرد باد این جا

رواج خانقاہست از کف خاکم بیابان را

لغت: ”گرد باد“ بگولا گرد باد“ میں گاف مکور ہے۔ عام طور پر لوگ اس کا غلط تلفظ کرتے ہیں اور گاف کو مفتوح پڑتے ہیں اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ بگولے میں گرد غبار ہوتا ہے لوگ ”گرد باد“ سے مراد وہ ہوا لیتے ہیں جو گرد آلود ہوا سی طرح ”گرد آب“ یعنی مہنور کو بھی گرداب بالفتح پڑھتے ہیں حالانکہ دونوں جگہ گرد کا مفہوم گول کا ہے۔

خانقاہوں میں درویش (قلندر) حال اور وجد کی حالت میں رقص کرتے ہیں۔ اس شعر کے مفہوم کی طرف آنے سے پہلے تصور کیجئے کہ مرزا غالب بیاباں نوردی کرتے کرتے وہیں خاک ہو چکے ہیں لیکن ان کی اس کف خاک میں وہی بے تائیاں ہیں جو ان کی زندگی میں تھیں۔ پہلے وہ بیاباں نورد تھے مگر اب ان کی خاک غبار بن کر گھوم رہی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ بیاباں میں جو بگولا بھی رقص کر رہا ہے انہی کی کف خاک سے ابھرا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

یہاں (یعنی بیاباں میں) ہر بگولا مستی کے عالم میں رقصاں ہے۔ میری کف خاک سے بیاباں میں خانقاہ کا سماں (رسم و رواج) نظر آتا ہے۔

خلیدن های منقارِ ہما در استخوان غالب

پس از عمری بیادِ داد کاوش های مژگان را

تصور کیجئے کہ عاشق مرچکا ہے اور اسے مرے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے قبر ویران پڑی ہے اور اس کی ہڈیاں ادھر سے ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ ہما (ہڈیاں کھاتا ہے) آتا ہے اور ان ہڈیوں پر چونچ مارتا ہے اس کی چونچ کی جھین سے عاشق کو (جس کا جذبہ عشق ابھی زندہ اور تازہ ہے) وہ وقت یاد آتا ہے کہ جب کسی کی لمبی لمبی اور تیز مژگان اس کے تنگ دریشہ میں چھتی تھیں۔

مرزا غالب نے عشق کے جذبہ غیر فانی کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے اور ایک نہایت ہی حسین محاکاتی فضا پیدا کی ہے جس سے ان کے احساسات کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔



### غزل نمبر (۳۳)

بہ خلوت مژدہ نزدیک یار است پھلو را

فریب امتحانِ پاکبازی دادہ ام او را

خلوت میں میرے پہلو کو محبوب کے نزدیک ہونے کی خوش خبری ملتی ہے۔ میں نے اسے اپنی پاکبازی کے آزمانے کا فریب دیا ہے۔ یعنی میرا محبوب پاکبازی کے فریب میں آکر میرے قریب تر ہو گیا ہے۔

ز محو پردہ محملِ مگو، فرہاد را میرم

کہ می خاید بذوقِ فتنہ شادروان مشکو را

لغت: ”مشکو“ = محل، قصر شاہی یا حرم شاہی۔ ”می خاید“ = چباتا ہے۔ شادروان = پردہ یا سائبان۔

تمیں عامری (مجنون) کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ لیلیٰ کے محل کی تلاش میں محو رہتا اور اسی تلاش میں صحرا نوردی کرتا رہتا تھا۔ فرہاد، شیریں کے محل کی دیواریں چباتا تھا کہ کہیں شیریں نظر آجائے۔



کہتا ہے پردہ محفل میں ٹھونسنے والے (مجنوں) کی بات نہ کر۔ میں تو فرہاد سے بھی آگے ہوں جو عشق کی دیوانگی کے عالم میں محفل سرے شیریں کی دیواروں کو چباتا تھا۔

جہان از بادہ و شاہد بدان ماند کہ پنداری

بہ دنیا از پس آدم، فرستادند مینو را

لغت: ”مینو“ جنت۔ یہ دنیا شراب اور حسینوں کے باعث یوں دکھائی دیتی ہے کہ جیسے آدم کے بعد جنت کو یہاں بھیج دیا گیا ہے۔

زمن رنجیدہ، با اغیار در ناز است و می خواهد

بہ جنبش های ابرو از گرہ پروازد ابرو را

لغت: ”از گرہ ابرو“ پروازد ابرو سے شکن دور کر دے۔

غصے میں ابرو پہ بل پڑ جاتے ہیں اور جب کسی کو محبت اور ناز سے دیکھا جائے تو وہ بل (جیسے جھڑ جاتے ہیں) دور ہو جاتے ہیں۔

معتوق، عاشق سے برہم ہے اور رقیب سے ناز و انداز سے پیش آتا ہے۔ اتفاق سے عاشق اور رقیب ایک جگہ موجود ہیں۔ وہ چاہتا ہے بیک وقت دونوں سے الگ الگ اپنے رویے کا اظہار کرے شاعر کہتا ہے کہ وہ مجھ سے برہم ہے اور غیروں پر مہربان ہے چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ (پہلے ابرو پر گرہ ڈالے اور عاشق کو گھور کے دیکھے) اور پھر ابروؤں کی جنبش سے ابروؤں سے شکن دور کر دے۔

مرزا غالب نے حسن کی اس دہری ادا کو بڑے لطیف اور خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

بہ زور شند خوئی، خستگان را رام خود کردن

بہ آتش بردن است از موی تاب پچش مورا

خستہ دلوں کو طبیعت کی تندی کے ساتھ اپنا رام کر لینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بال کے پچ و تاب (تل) اُسے جلا کر نکالنا چاہے۔

نباشد دیدہ تاحق بین، مدہ دستوری اشکش

چو گوهر سنج، کو پیش از گھر سنج تر ازو را

لغت: ”گوهر سنج“ موتیوں کو پرکھنے والا۔ تر از و سنجیدن ”کوئی چیز تو لے سے پہلے یہ دیکھنا کہ تر از و سیدھا ہے کہ نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جب تک آنکھیں حق میں نہ ہوں انھیں آنسو بہانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ موتیوں کو تو لے والا پہلے اچھی طرح تر از و کی سیدھ دیکھ لیتا ہے۔

چونشیند بہ محفل، بگذرانم در دل تنگش

کہ رنجہ غیر ازو چوبی سبب در ہم کشد رو را

جب وہ محفل میں بیٹھتا ہے تو میں اسے اپنے دل تنگ (یعنی دل افسردہ) میں سے گزارتا ہوں تاکہ جب وہ اس سے (بظاہر) بے سبب ناک بھوں چڑھائے تو رقیب اس کی یہ صورت دیکھ کر رنجیدہ خاطر ہو جائے۔

اگر داند کہ در نسبت مرا با کیست ہم چششی

کشد در دیدہ ہر گردی کہ از رہ خیزد آتورا

لغت: ”ہم چششی“ = شریک یا حریف ہونا۔



اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ عاشقی کی نسبت سے میرا ہم چشم کون ہے تو وہ راستے سے جو گرد و غبار اٹھے وہ ہرن کی آنکھوں میں ڈال دے۔ آہو یعنی ہرن ایک وحشت زدہ جانور ہے اور جنگل میں آوارہ گھومتا ہے۔ یہ چیز اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتی ہے اس اعتبار سے مرزا غالب کا اسے اپنا ہم چشم کہنا بڑا موزوں ہے۔

بھاران گو برد مشاطہ کوہ و بیابان شو

گل از لخت دل عاشق زبید آن سر کو را

بہار سے کہد و کہد کوہ و بیابان کی مشاطگی کرے (یعنی انھیں جا کر ٹھنکی عطا کرے) اس کے (یعنی محبوب کے) کوچے کے لیے تو عاشقوں کے لخت دل کے پھول موزوں ہیں۔ گویا معشوق کے کوچے کی بہار عاشقوں کے خون شدہ دلوں کے رنگین پھولوں ہی سے ہوتی ہے۔

نشان دور است غالب در خن این شیوہ بس نبود

بدین زورین کمال می آزمایم دست و بازو را

شاعری کا مقام (ہدف) بہت دور ہے۔ یہ اسلوب اس کے لیے کافی نہیں ہے میں تو صرف ایک سخت کمال لے کر اپنے دست و بازو کو آزمائے رہا ہوں۔



حسرت وصل از چہ رو، چون بخیال سرخوشیم

ابر اگر بایستد بر لب جوست کشت ما

جب ہم خیال دوست ہی میں سرمست و سرشار ہیں۔ تو پھر وصل کی حسرت کیسی۔ اگر ابر تقم جاتا ہے (اور نہیں برستا) تو نہ برے، ہماری کھیتی مٹی کے کنارے پر ہے۔ (وہاں سے

## غزل نمبر (۳۵)

بادہ مشکبوی ما، بید و کنار کشت ما

کوثر و سلسبیل ما، طوبی ما، بھشت ما

ہماری شراب مشکبوی ہی ہمارے لیے کوثر اور سلسبیل ہے اور بید و کنار کشت ہی ہمارے لیے طوبی اور باغ بہشت ہیں۔

بسکہ غم تو بودہ است تعبیه در سرشت ما

نسخہ فتنہ می برد، چرخ ز سرنوشت ما

چونکہ تیرا غم ہماری طینت میں سمایا ہوا ہے اس لیے آسمان جفا پرور ہماری قسمت سے نسخہ فتنہ (نقل کر کے) لے جاتا ہے۔

یعنی عاشق کا غم آسمان کا عطا کیا ہوا نہیں ہے، محبوب کا دیا ہوا ہے۔ یہ تو ہمارے رگ و ریشے میں سمایا ہوا ہے۔

آسمان کی طرف اسے منسوب کرنا غلط ہے بلکہ آسمان تو خود اس غم سے دوستوں کو غم دینے کے طریقے سیکھتا ہے۔



سیراب ہو لیں گے)۔

نور خرد در آگهی خواہش تن پدید کرد

صرف زقوم دوزخ است نامیہ در بہشت ما

عقل و خرد نے ہم میں خود آگاہی پیدا کی اور اس خود آگاہی یعنی شعور خودی نے ہم میں نفسانی خواہشات کو جنم دیا۔ ہمارے بہشت کی قوت نامیہ زقوم دوزخ پیدا کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ حضرت آدم کے شعور خودی نے ان میں خواہش حیوانی پیدا کی اور وہ جنت سے نکالے گئے اور خاک ارضی میں بھیج دیے گئے گو یا وہ فضائے خلد میں ان کی نشوونما ان کے لیے سامان دوزخ بن گئی۔

این ہمہ از عتاب تو ایمنی عدو چراست

ای بہ بدی و ناخوشی خوی تو سر نوشت ما

ہماری زندگی میں جو بد حالی اور ناخوشی تیری تندی خو سے ملتی ہے، اسے تو ہم اپنا مقدر سمجھ لیتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا رقیب تمہارے خشم و عتاب سے اتنا محفوظ کیوں ہے۔

بی خطر از خودی بر آ، لب بہ انا الصنم کشا

شیوہ گیر و دار نیست در کنش کنش ما

لغت: ”انا الصنم = میں صنم ہوں“ کنش = دستور العمل، طریق، رسم۔ کنش = پارسیوں کا معبد (یہاں صرف معبد مراد ہے)۔

خودی کو بلا خوف و خطر ترک کر دے اور انا الصنم کا نعرہ لگا۔ ہماری عبادت گاہ کے

دستور کے مطابق یہاں کسی طرح کی باز پرس یا گرفت نہیں۔ (جو چاہے آزادہ روش اختیار کر لے)۔

بادہ اگر بود حرام، بزلہ خلاف شرع نیست

دل ننھی بہ خوب ما، طعنہ مزین بہ زشت ما

مولانا حالی اس شعر کی شرح یوں لکھتے ہیں: ”زہا، کی طرف خطاب ہے جو شراب خواری اور رندانہ بذلہ نجی دونوں کو برا سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اگر شراب حرام ہے تو بذلہ نجی تو خلاف شرع نہیں۔ اگر تو شراب کو جو ہماری نفیس چیز ہے، پسند نہیں کرتا تو بذلہ نجی، جو ہماری ادنیٰ درجے کی چیز ہے، اس پر طعن مت کر۔“ مرزا غالب نے شراب کے لیے ”خوب“ اور بذلہ نجی کے لیے ”زشت“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو لطف سے خالی نہیں۔ یہ مرزا غالب کا خاص انداز فکر ہے۔

گفت بحکم حسرتی غالب خستہ این غزل

شاد بہ هیچ می شود طبع وفا سرشت ما

بقول مولانا حالی کے یہ غزل مرزا صاحب نے مرزا مصطفیٰ خاں شیفہ، حسرتی کے مکان پر ایک مشاعرے میں پڑھی تھی۔ مقطع میں انھوں نے مصرع کو تضمین کیا تھا۔ چنانچہ مولانا حالی اس غزل کی شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اب اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم سے جو اس طرح پر غزل لکھنے کی فرمائش کی گئی، ہماری طبع و فاسرشت، دوست کے اتنے ہی التفات سے شاد شاد ہو جاتی ہے۔“





## غزل (نمبر ۳۶)

دل تاب ضبط ناله ندارد خدای را

از ما مجوی گریہ بی های های را

لغت: ”خدای را“ کے الفاظ میں ”را“ قسمیہ ہے۔

”خدائی را“ کا مفہوم ”خدا کے لئے“ ہے۔ دوسرے مصرعے میں ”مجوی“ میں یاے مشیج ہے یعنی اس کی آواز کو لباً کیا گیا ہے جو فارسی کے اساتذہ کے نزدیک جائز اور فصیح ہے۔

ہمارے دل کو ضبط فریاد کی تاب نہیں ہے۔ خدا کے لیے ہم سے ایسے رونے کی، جس میں ہائے ہائے کی آواز نہ ہو وقوع نہ رکھ۔

آید بچشم روشنی ذرہ آفتاب

بر ہر زمین کہ طرح کنی نقش پای را

جہاں بھی تیرا نقش قدم پڑتا ہے وہاں کے ہر ذرے کی چمک دھوپ کی طرح جگمگاتی ہے۔

مشتاقی عرض جلوہ خویش است حسن دوست

از قرب، مژدہ دہ نگہ نارسائی را

اس شعر کا پس منظر اہل تصوف کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا حسین ہے اور حسن کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنا جلوہ دکھائے۔ اسی جذبے کے ماتحت یہ کائنات معرض وجود میں آئی تھی۔ حسن ازلی نے اپنا

جلوہ دکھلایا اور بھرچھپ گیا لیکن کائنات کا ہر ذرہ ابھی تک اس کی تلاش میں سرگرداں ہے شاعر کا عقیدہ ہے کہ حسن اپنا جلوہ دکھانے کے لیے بیتاب ہے اس لیے وہ ہماری نگاہوں کے قریب ہے چنانچہ کہتا ہے کہ حسن دوست اپنے جلوے کی نمائش (رض جلوہ) کا مشتاق ہے اس لیے تو اپنی نگاہوں کو جنھیں تو نارسا کہتا ہے اس کے قرب کی خوشخبری سنا دے۔

حسن ازلی باوجود پنہاں ہونے کے ہر جگہ نمایاں ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

آشفگی بر اوج فنا، بال می زند

ای شعلہ داغ گرد و نگہدار جای را

لغت: ”بال زند“۔ پرواز کردن۔ اڑنا۔ ”جائی نگہداشتن“ = اپنی جگہ کا خیال رکھنا، اپنی جگہ پر قائم رہنا۔

شعلہ ابھرا ہوا ہوتا ہے، گویا وہ بلندی پرواز کرنا چاہتا ہے پھر شعلے میں ایک آشفگی سی بھی ہوتی ہے اس کے برعکس ”داغ“ دہلی ہوئی آگ کی علامت ہے جو ایک جگہ برقرار رہتی ہے۔

شاعر نے آشفگی محبت کے لیے شعلے کا استعارہ استعمال کیا ہے وہ جذبہ محبت جب جوش میں آکر نمایاں ہو جائے۔ شاعر کے نزدیک یہ آشفگی جذبہ محبت کو ختم کر دیتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر ضبط کیا جائے تو جذبہ محبت کی گرمی ایک داغ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن یہ داغ پائدار ہوتا ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

آشفگی فنا کی بلندیوں پر پر مارتی ہے اے شعلہ (آشفگی) تو داغ ہو جا اور پھر اس مقام پر قائم رہ۔



واماندگی است بی پر وادی خیال

شوق تو جادہ کرد رگ خواب پای را

لغت: ”واماندگی“ تھک کر رہ جانا ”پے پر“ زہر خواب پا“ انتہائی تھکن میں انسان کے پاؤں گویا سو جاتے ہیں، یہ خواب پا ہے ”پائے خفتہ“ وہ پاؤں جو سو جاتے ہیں۔

سفر شوق کی تھکن نے وادی خیال کو طے کرنا شروع کر دیا۔ تیرے شوق نے پائے خفتہ کی رگ ہی کو پگھل ڈالی (جادہ) بنالیا۔

یعنی جب سفر عشق میں چلتے چلتے پاؤں تھک کر چور ہو گئے تو ہم خیال کی منزلیں طے کرنے لگے۔

سر منزل رسائی اندیشہ خودیم

در ما گم است جلوہ پی رہنمائی را

کوئی راہ طے کرنی ہو تو اس کے لیے منزل مقصود کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور منزل پر پہنچنے کے لیے رہنما درکار ہے۔

”جلوہ پے رہنما“ کے الفاظ میں ”را“ اضافت کا ہے۔ مراد ہے جلوہ پے رہنما“ یعنی رہنما کے پاؤں کا جلوہ۔

کہتا ہے کہ ہمارے فکر کی رسائی کی منزل کیا ہے؟ وہ منزل ہم خود ہی ہیں ہمارے رہنما کی صورت ہم ہی خود میں گم ہے۔

یعنی ہم کسی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں، یہ کسی رہنما کو معلوم نہیں۔ یہ ہم خود ہی جانتے ہیں اور خود ہی اپنے رہنما ہیں۔

از پیچ و تاب آرزستوہند سرکشاں

انگشت زہنہار شمر ہر لوالی را

لغت: ”انگشت زہنہار“ = زہنہار کا مطلب پناہ ہے۔ جب کوئی شخص مخالف کے مقابلے میں ہار کر پناہ مانگنا چاہتا ہے تو وہ انگلی کھڑی کر دیتا ہے جسے ”انگشت زہنہار“ کہتے ہیں۔ ”لوا“۔ جھنڈا ”ستوہ“ مغلوب، عاجز۔

سرکش لوگ اپنے حرص و آرز کے پیچ و تاب کے باعث عاجز ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی سرکشی کا جھنڈا، جھنڈا نہیں ہوتا بلکہ ”انگشت زہنہار“ ہوتی ہے جو وہ عاجز ہو کر اٹھاتے ہیں۔

حسن بتان ز جلوہ ناز تو رنگ داشت

بی خود بہ بوی بادہ کشیدیم لای را

دوسرے حسینوں کے حسن میں اگر رنگینی کی جھلک تھی تو وہ تیرے جلوہ حسن کی بدولت تھی۔ ہم بوسے شراب سے بے خود ہو کر یونہی تلچھٹ (لا) ہی پیتے رہے۔

شاعر نے اپنے محبوب کے حسن کو شراب ناب کہا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے حسینوں کے حسن کو درو شراب یعنی تلچھٹ کا نام دیا ہے۔ عاشق اس شراب ناب کی بوسے اتنا سرمست تھا کہ اس کے تصور میں تلچھٹ کو شراب سمجھ کر پیتا رہا۔

دینا والے، مادی حسن کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ سارے مظاہر حسن درحقیقت حسن ازلی کے پرتو ہیں۔

گوید تغافل تو کہ رد کردہ تو ام

از پشت چشم می نگریم، پشت پائی را



تیر انداز تغافل بتا رہا ہے کہ میں تیرا رد کیا ہوا ہوں۔ میں پشت چشم سے اپنی پشت پا کو دیکھتا ہوں یعنی میں سامنے دیکھنے کی بجائے پیچھے کو دیکھتا ہوں اور لوٹ جانے کا تصور کرتا ہوں اور یہ تیری بے التفاتی کا نتیجہ ہے۔

یا رب بہ بال تیغ کہ پرواز می کند  
نگ است دوش فرق بلندی گرای را

لغت: ”پرواز می کند“ کا فاعل فرق ہے جو دوسرے مصرعے میں آیا ہے ”بلندی گرائے“ جس کا رجحان بلندی کی طرف ہو۔ سر بلند۔ اے خدا میرا سر بلند کسی کی تلوار کے پروں کے سہارے پرواز کر رہا ہے کہ کندھے پر ٹھہرتے ہوئے اسے غار آتی ہے۔ یعنی محبوب تلوار لیے ہمارے قتل کو آ رہا ہے اور میرا سر اس فخر سے بلند ہو رہا ہے کہ اسے کندھوں پہ پڑے رہنا گوارا نہیں۔ معشوق کا تیغ بدست ہونا مژدہ شہادت ہے جو عاشق کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ اس سے اسے احساس سر بلندی نصیب ہوا ہے۔

گر چشم اشک از دست و گریزند آہ از دست

با کیست دآوری دل درد آزمای را

لغت: ”دل درد آزمای“ = شاعر نے ذومعنی بات کی ہے اس سے مراد وہ دل ہے جو درد مند ہے لیکن درد مند اور دل درد آزمای میں فرق ہے۔ دل درد آزمای وہ دل ہے جو ہر نئے درد کو سینے سے لگاتا ہے اور آزماتا ہے اور شدید سے شدید تر درد کی جستجو میں رہتا ہے۔

مرزا غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو درد بھی ہے، محبوب ہی کا عطا کیا ہوا ہے، پھر شکایت کس بات کی۔

چنانچہ کہتے ہیں اگر آنکھ ہے تو اس کے آنسو اسی کی طرف سے ہیں اور سینہ ہے تو اس کی آہیں اسی کی عنایت ہیں۔ پھر یہ ہمارا دل درد آزمای کس کے خلاف داد رسی چاہتا ہے۔

مردم ز فرط ذوق و تسلی نمی شوم

یا رب کجا برم لب خنجر ستای را

مجھے دوست کے خنجر نے بے حد مزہ دیا ہے۔ میں نے اس کی تعریف میں جان دے دی لیکن تسلی نہیں ہوئی۔

اے خدا اس لب خنجر ستا کو کہاں لے جاؤں کہ جہاں مجھے اطمینان حاصل ہو۔

غالب بریدم از ہمہ خواہم کہ زین سپس

کنجی گزینم و بہ پرستم خدای را

اے غالب میں نے سب سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے بعد کسی ایک گوشے کو جن لوں اور وہاں بیٹھ کر ایک خدا کی پوجا کروں۔





## غزل نمبر (۳۷)

تا دوخت چارہ گر، جگر چار چارہ را

از بجیہ خندہ بر دم تیغ است چارہ را

جب سے چارہ گرنے ہمارے جگر کو، جس کے چار کٹڑے ہو چکے ہیں، سیاہ ہے، اس چارے سے جو بجیہ ہوا ہے وہ تلوار کی دھار پر ہنس رہا ہے۔

وہ زخم ہی کیا ہے جس کی چارہ گری ہو سکے۔ چنانچہ خود بجیہ (جس کی صورت خندہ دندان نما کی سی ہوتی ہے) دم تیغ یعنی تلوار کی دھار پر خندہ زن ہے کہ کوئی ایسا زخم نہ لگا سکی جو کار گر ثابت ہوتا۔

با اضطراب دل ز ہر اندیشہ فارغ

آسائشی است جنبش این گاہوارہ را

ہم اپنے دل کے اضطراب کی بدولت دنیا کے ہر طرح کے تفکرات سے فارغ ہیں اس گاہوارے کی جنبش گویا ایک آسائش ہے۔

گہوارے کا ہلنا بچے کو سکون دیتا ہے۔ شاعر نے اضطراب دل کے لیے جنبش گہوارہ کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ اس میں ندرت فکر و بیان پوشیدہ ہے۔ اس میں ایک محاکاتی کیفیت ہے اس سے ایک لطیف تجربہ مجسم ہو کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔

چون شعلہ ہم ز روی تو پیدا است خوی تو

تا کی بہ تاب بادہ فریبی نظارہ را

تیرے چہرے کی سرخی سے، شعلے کی طرح، تیری، خوی تندی اور گرمی ظاہر ہوتی ہے۔ لوگ کب تک تیرے حسن کے نظارے سے یہ دھوکا کھائیں گے کہ یہ سرخی شراب کے نشے کی وجہ سے ہے۔

سرگرم مہر شد دل چرخ ستیزہ خو

چندان کہ داغ کرد جبین ستارہ را

چرخ ستارہ کا دل محبت سے اس قدر گرم ہو گیا ہے کہ کہ ستاروں کی جبین جل کر رہ گئی۔ گویا آسمان محبت پر اتر آئے تو وہ محبت بھی ستم ڈھاتی ہے۔ ستارے کیا ہیں، اسی محبت کے داغ ہیں۔

دانی کہ ریگ بادِ غم روان چراست

ایجا گستہ اند، عنان شمارہ را

تو جانتا ہے کہ بیابان غم کی ریت رواں کیوں ہے۔ اس جگہ شمار کی باگ ڈور ٹوٹ گئی ہے، یہاں غم کے طوفان کی کوئی روک تھام نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی معینہ دت ہے۔

قدیم زمانے میں وقت کا اندازہ شیوہ ساعت سے کیا جاتا تھا۔ دو شیشے (بوتلیں) ایک دوسرے کے اوپر ہوتی تھیں اور ان کے منہ ملے ہوتے تھے۔ اوپر کی شیشی میں ریت ہوتی تھی جو ایک معین وقت میں لڑھک کر نیچے کی شیشی میں آ جاتی تھی۔ پھر اُس بھری ہوئی شیشی کو اوپر کر دیتے تھے اور ریت اسی طرح روانی سے گر کر نیچے کی شیشی میں آ جاتی تھی۔ مرزا غالب نے غم کی رو کو ریگ رواں کہا ہے جس کی روانی کی کوئی حد نہیں۔

گیتی ز گریہ ام تہ و بالا است، بعد ازین

جویند در میانہ دریا کنارہ را



دینا میرے طوفان، مگر یہ سے تہ دہالا ہو چکی ہے۔ اس کے بعد کنارے کو سمندر کے وسط میں تلاش کیا جائے گا، یعنی سمندر اور ساحل میں کوئی فرق نہیں رہا۔

ای لذتِ جفائی تو در خاک بعد مرگ

با جان سرشته، حسرتِ عمر دوبارہ را

تیری جفا میں وہ لذت ہے کہ مرنے کے بعد جب ہم خاک میں دفن ہوں گے تو ہماری روح میں دوبارہ زندگی حاصل کرنے کی حسرت کی آمیزش کر دی جائے گی۔  
یعنی مرکز یہ خواہش ہوگی کہ ہمیں دوبارہ زندگی مل جائے تاکہ ہم تمہارے جو دوستم کے مزے اٹھا سکیں۔

جوہرِ دمید زائے دل خستہ تاکجا

دزد بہ خود ز بیمِ نگاہت، اشارہ را

آئینے کا جو ہر پھوٹ نکلا ہے آخر یہ بے چارہ دل خستہ کب تک تیری خشکیوں نگاہوں کے اشاروں سے خوف زدہ ہو کر اپنے آپ میں سموتا چلا جائے۔  
یعنی حسن کی خشم آلود نظروں سے آئینہ بھی سہا ہوا ہے۔

خونم ستادہ بود بدرودِ فردگی

دل داد پائی مردی تیغت گزارہ را

لغت: ”گزارہ“ = وہ چیز جو حد سے گزر جائے۔ انتہائی حالت۔ میرا خون افسردگی سے ٹھہر گیا تھا۔ اس میں روانی نہ رہی تھی اور اس میں بہنے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی۔ آخر دل نے

تیری تموار کو انتہائی قوت و استقامت عطا کر دی یعنی تیری تموار ہی سے ہمارا خون بہہ نکلا اور نہ وہ ایک طرح منجمد ہو چکا تھا۔

شمع از فروغِ چہرہ ساقی در انجمن

چون گل بسر ز دستِ زمستی نظارہ را

بزم میں چہرہ ساقی کی تابناکیاں دیکھ کر شمع بھی مست ہو گئی اور مستی میں اُسے اس کے حسن کے نظارے کو پھول کی طرح سر پر جگہ دی، یعنی شمع جو محفل میں سرچشمہ روشنی تھی، خود ساقی کے حسن کی گرویدہ ہو کر رہ گئی۔ گویا اس کا نور ساقی کے چہرہ درخشاں کے سامنے دب گیا۔

بگر نخست تا ستم از جانب کہ بود

با شیشہ داوری پی داد است خارہ را

لغت: ”خارہ“ = سخت پتھر۔ تو دیکھ پہلے پہل ستم کس کی جانب سے ہوا تھا۔ ایک سخت پتھر یونہی شیشے کے خلاف داد رسی کر رہا ہے۔  
یعنی ہمارا نازک دل توڑنے والا تو وہ سنگدل خود ہے ہم پر یونہی طعنہ زن ہو رہا ہے۔

داغم ز بخت گر ہمہ اوج اثر گرفت

آہ از مہر ریخت بہ فرمِ شرارہ را

میں اپنے بخت کے ہاتھوں جل گیا کہ جس کو اثر انگیزی میں یہ بلندی نصیب ہوئی کہ میری آہ آسمان پر پہنچ کر لوٹ آئی اور شرارہ بن کر میرے سر پر گری۔

مرزا غالب نے آہوں کی بے اثری کو طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یعنی آہ کا اثر تو کیا



ہوتا۔ وہ خود آگ بن کر لوٹی اور ہمیں کوجلا گئی۔

غالب مر از گریہ نوید شہادتِ ست

کاین سبھ رنگ داد بہ خون استخارہ را

لغت: "سبھ" = تسبیح۔ "استخارہ" = لغت میں (خدا سے) خیر طلب کرنے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں کسی کام کے انجام کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا استخارہ کہلاتا ہے۔ اس کے کئی ایک طریقے ہیں۔ عام طریقہ یہ ہے کہ دعائے قنوت یا کوئی اور دعا پڑھ کے سو جاتے ہیں۔ پھر جو کچھ خواب میں دکھائی دیتا ہے اور اسی سے نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ اہل تشیع کے یہاں یہ دستور ہے کہ دعائیں مانگ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ایک تسبیح اٹھا کر اس کا تقریباً تہائی حصہ مٹھی میں لے لیتے ہیں اور پھر باقی دانے دودو کر کے تسبیح کے امام تک گنتے جاتے ہیں۔ اگر باقی ایک دانہ رہ جائے تو علامت خیر تصور کرتے ہیں اور دو رہ جائیں، دوسرے لفظوں میں پورے پورے دودو گنے جائیں، تو یہ علامت شر ہوتی ہے۔

مرزا غالب نے آنسوؤں کے تار کو سبھ یعنی تسبیح کا نام دیا ہے اور چونکہ وہ خون کے آنسو ہیں اس لیے اس گریہ کو شہادت کی علامت یا خوشخبری کہا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

اے غالب! میرا گریہ (رونا) میرے لیے شہادت کی بشارت ہے۔ اس تسبیح (یعنی آنسوؤں کے تار) نے خون سے استخارہ کو رنگین بنا دیا ہے۔ عاشق انک ہائے خون کی تسبیح لیے استخارہ کر رہا ہے۔ اور استخارے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس کی شہادت واقع ہو گئی یعنی وہ رو رو کر جان دے دے گا۔



## غزل (نمبر ۳۸)

قضا آئینہ دار عجز خواہد نازِ شاہی را

شکستی در نہادستی ادای کج کلاہی را

لغت: "شکستی" کے لغوی معنی ٹوٹنے کے ہیں۔ اس کا ایک مفہوم شکن کا بھی ہے۔ چنانچہ "شکست زلف" سے مراد شکن زلف ہے۔ شعر میں شکست کا لفظ ذومعنی ہے اس سے اداے کج کلاہی کی شان کا ٹوٹنا بھی مقصود ہے اور کلاہ کج یعنی ٹیڑھی ٹوپی کی شکن بھی۔ "کج کلاہی" ناز و غرور کی علامت ہوتی ہے۔ اسی شان کج کلاہی میں ایک انداز شکست بھی ہوتا ہے یعنی اس میں شکن بھی ہوتی ہے اور ناز و انداز کا پہلو بھی۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ناز شاہی کے مقدر میں عجز و نیاز لکھا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کج کلاہی کی ادا کی طینت میں شکست مضمر ہے۔

طبعی نیست ہر جا اختلاط، از وی حذر خوشتر

کم از سو زندہ آتش نیست آب گرم ماہی را

دو چیزوں کا باہمی اختلاط ہر وقت فطری امر نہیں ہوتا۔ اس سے بچنا ہی لازم ہے۔ دیکھ لو، مچھلی کے لیے گرم پانی جلادینے والی آگ کی طرح ہوتا ہے۔ پانی مچھلی کی زندگی ہے لیکن یہی پانی اگر گرم ہو تو پانی اور مچھلی کا ملاپ غیر طبعی ہو جائے گا۔

ز رختِ خوابم آتش پارہ ہارفت است میدان

تھم در لرزہ افکند است باد صبحگاہی را



لغت: ”رخت“ = خواب بستر ”آتش پارہ“ = آگ کے ٹکڑے یعنی چنگاریاں۔

باہم حری نے میرے بستر سے چنگاریاں جھاڑ دی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری گرمی عشق نے ہوا کولرز سے میں ڈال دیا ہے۔

نمائند از کثرتِ داغِ غمت آن مایہ جا باقی

کہ داغی در فضائی سینہ اندازد سیاہی را

تیرے غم کے داغوں کی کثرت سے اتنی جگہ بھی باقی نہیں کہ کوئی داغ سینے میں سیاہ نشان ڈال سکے۔

یعنی سینہ داغباغ غم اتنا سیاہ ہو چکا ہے کہ اب مزید سیاہی کی گنجائش نہیں رہی۔ مقصود شاعر یہ ہے کہ محبوب کے غم کے داغوں کے سوا کوئی اور داغ ہمارے سینے میں نہیں سما سکتا۔

شبم تار یک و منزل دور و نقش جادہ ناپیدا

ہلاکم جلوہ برق شراب گاہ گاہی را

پہلے مصرعے میں شاعر نے زندگی کی مشکلات کا تذکرہ یوں کیا ہے کہ میری رات تار یک ہے، منزل دور ہے۔ اور راستے کا نشان نہیں ملتا۔ یہاں اتنا ضرور ہے کہ کبھی کبھی شراب میسر آتی ہے اور اس اندھیری فضا میں ایک چمک پیدا کر جاتی ہے۔

ایک غمزدہ انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایک جامے کا میسر آ جانا جس سے وہ اتنا غم غلط کر سکے ایسا ہی ہے جیسے سیاہ بادلوں میں گھری ہوئی فضا میں بجلی کی چمک ایک لمحے کے لیے اجالا کر جاتی ہے۔

شاعر نے اس کیفیت کو بڑے بلیغ اور موثر محاکاتی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ذرا اس

فارسی روزمرہ کو دیکھئے:

ہلاکم جلوہ برق شراب گاہ گاہی را

”یعنی اس شراب گاہ گاہ کے جلوہ برق کے قربان جاؤں“ سنا خوبصورت انداز بیان ہے۔

چہ رومی سازی ای آئینہ، آہ از سادگی ہایت

بہ من بگذار گفتم شیوہ حیرت نگاہی را

اے آئینہ! تو کیا منہ بنا رہا ہے۔ تیری ان سادگیوں پر افسوس۔ اس شیوہ حیرت نگاہی کے طریق کو مجھ پر چھوڑ دے، یعنی جلوہ حسن کو دیکھ کر آئینہ حیرت زدہ ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ روگ اس کے بس کا نہیں، اسے عاشق پر چھوڑ دینا چاہئے۔

ودیعت بودہ است اندر نھاہ عجز ما نازی

جدا از قطرہ نتوان کرد طوفان دستگاہی را

لغت: ”نھاہ“ فطرت، طینت ”طوفان دستگاہی“ = طوفان کی صلاحیت کا ہونا۔

شاعر نے قطرے کو طوفان دستگاہ کہا ہے کہ وہ اگرچہ بظاہر ایک حقیر سا قطرہ ہے لیکن اس میں سمندر پوشیدہ ہے۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر

ہر قطرہ پکار پکار کر رہا ہے کہ میں سمندر ہوں۔ انسان ایک قطرہ ہے جو بحر حقیقت سے الگ ہو چکا ہے لیکن اس میں سمندر کی سی ساری صلاحیتیں اور وسعتیں موجود ہیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے۔ ہمارے عجز و نیاز کی طینت میں ہی ناز و دیعت کیا گیا ہے۔ قطرے سے طوفان کی وسعتیں جدا نہیں کی جاسکتیں۔



ہمانا کز نوآموزانِ درس رحمتی زاهد!

بہ ذوق دعویٰ از بر کردہ بحث بی گناہی را

لغت: ”نوآموز“= مبتدی جو سبق کو رٹ لیتے ہیں۔

اے زاهد! تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا درس سیکھنے والے مبتدیوں میں سے ہے۔ تو نے یوں  
نہی جوش دعویٰ میں اپنے آپ بے گناہ ہونے کی رٹ لگائی ہے اور خود کو بے گناہ سمجھ لیا ہے۔ یہ تیرا  
خیال خام ہے۔

دلا گر داورِ داری بچشمِ سرمہ آلودش

نخستم بی زبان کن تا بکار آیم گواہی را

کہتے ہیں کہ سرمہ کھالینے سے انسان کا گلاب بند ہو جاتا ہے۔ اور اس کی آواز نہیں نکلتی۔  
محبوب کی چشمِ سرمہ آلود یعنی سرگیں آنکھوں کے التزام سے اپنے بے زبان ہونے کی بات کی  
ہے۔ کہتا ہے کہ اے دل اگر تجھے اس کی چشمِ سرگیں کے خلاف دعویٰ کرنے اور داری کا خیال ہے  
تو پہلے مجھے بے زبان کر لے کہ میں گواہی کے کام آسکوں اور کہہ سکوں کہ ہاں اس کی سرمہ آلود  
آنکھوں کی اثر انگریزی کو دیکھنا ہے تو میری زبان گنگ کو دیکھ لو۔

مقصود یہ ہے کہ محبوب کی سرمہ آلود آنکھوں کے اثر کا تقاضا خموشی ہے۔

مرد در خشمِ گردِ دستانِ تو زد غالب

وکیلش من، نمی داند طریقِ داد خواہی را

اگر غالب نے بے ساختہ ترے دامن پر ہاتھ مارا ہے (اسے پکڑ لیا ہے) تو غصے میں  
مت آ۔ میں اس کی وکالت کرتا ہوں، وہ بے چارہ داد خواہی کے طریق سے نا آشنا ہے۔



## غزل نمبر (۳۹)

لرزہ دارد خطر از ہیبتِ دیرانہ ما

سیل را پائی بہ سنگ آمدہ در خانہ ما

لغت: ”پائے بہ سنگ آمدن“= ٹھوکر کھانا، عاجز ہو جانا۔

ہمارے دیرانے کی ہیبت دیکھ کر، خطر خود کا نپ جاتا ہے۔ سیلاب ہمارے گھر سے ٹکرا  
کر گر پڑتا ہے، یعنی ہم وہ مشکل پسند لوگ ہیں۔ کہ خطرات ہمیں دیکھ کر لرز جاتے ہیں۔

چشم بر تازگی شورِ جنونِ دوختہ است

در خزانِ بیش بود مستیِ دیوانہ ما

بہار آتی ہے تو دیوانے کا جنوں جوش پہ آتا ہے۔ لیکن مرزا غالب کا جنوں شرمندہ بہار  
نہیں۔ وہ خزاں میں بھی تازہ رہتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔  
ہمارے دیوانے کی مستی خزاں میں بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ (بہار کی تازگی کی  
 بجائے) اس کی نظریں جنوں کی تازگی پر لگی ہوتی ہے۔

می باندازہ حرامِ آمدہ، ساقی بر خیز

شیشہ خود بشکن بر سرِ پیانہ ما

ساقی سے خطاب کر کے شاعر کہتا ہے کہ اے ساقی! شراب اعتدال کے ساتھ چینی حرام  
ہے تو اٹھ اور اپنا شیشہ یعنی صراحی ہمارے گلاس پر دے مار۔

اس شعر کے سلسلے میں مولانا حالی فرماتے ہیں ”جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد



سے گزر جاتی ہے تو اس بات کی حد نہیں رہتی کہ اپنے طرف کے موافق اس کی خواہش کی جائے۔ جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے۔ تو پیاسا دریا کو دیکھ کر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جائے۔“

تنگی اش نام بر آوردہ تماشا دارد

در پی مور فرو رفتن کا شائد ما

نفت: ”تنگی اش میں ”ش“ کی ضمیر کا شانے کے لیے آئی ہے ”کا شائد“ = گھر۔

ہمارا گھر تنگ ہونے کے باعث ممتاز ہو گیا ہے۔ ایک چیونٹی کے لیے اس کا زمین میں غرق ہو جانا بھی ایک عجیب نظارہ ہے۔

بہ چراغی نہ رسیدیم درین تیرہ سرا

شمع خاموش بود طالع پروانہ ما

اس تاریک گھر میں ہمیں ایک چراغ بھی میسر نہ آیا۔ ہمارے پروانے کی قسمت میں ایک بجھی ہوئی شمع لکھی ہوئی ہے۔

اس دنیا کے مال و منال پہ جان دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پروانہ بجھی ہوئی شمع پر لپکے۔

دم تیغت تنگ و گردن ما باریک است

آفرین بر تو و بر ہمت مردانہ ما

تمہاری تلوار کی دھار بھی نازک ہے اور ہماری گردن بھی نازک۔ تجھ پر اور ہماری ہمت مردانہ دونوں پر آفریں ہو۔ اس شعر میں محبوب اور عاشق دونوں پر طنز ہے۔ یعنی ہم کون سے سخت جان تھے کہ عشق میں مرکز کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیا اور محبوب نے ہم جیسوں کی جان لے کر کون

ی مردانگی دکھائی ہے۔

دود آہ از جگر چاک دمیدن دارد

زلف خیز است زہی دستگاہ شائد ما

شاعر نے دود آہ کو زلف سیر سے اور اپنے جگر چاک کو شانے سے تشبیہ دی ہے۔ بجائے اس کے کہ محبت میں عاشق کی محبوب کی زلفوں تک رسائی ہوتی اور وہ انھیں اپنے ہاتھوں سے سنوارتا اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ اب اس کا جگر چاک ہے اور اس سے آہیں ابھر رہی ہیں گویا اس کا جگر چاک ایسا شانہ ہے جو اپنے دود آہ کی، جو سیر زلفوں کی طرح ہے، شانہ کشی کر رہا ہے۔ شاعر نے اپنی انتہائی محرومی اور شدت غم کی تصویر کھینچی ہے۔

خوش فرو می رود افسون رقیب در دل

پنبہ گوش تو گردد مگر افسانہ ما

کانوں میں روئی رکھنے سے آواز سنائی نہیں دیتی۔ شاعر نے رقیب کی جھوٹی باتوں کے ظلم کو افسون اور اپنی داستان محبت کو افسانہ کہا ہے۔ محبوب سے کہتا ہے کہ رقیب کی جھوٹی باتیں تو تمہارے دل میں اتر جاتی ہیں اور ہماری سچی داستان محبت شاید تمہارے کانوں میں پہنچ کر روئی (پنبہ گوش) بن جاتی ہے، یعنی بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

مو بر آید ز کف دست اگر دھقان را

نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر آرز دانہ ما

انسان کی ہتھیلی میں بال نہیں اُگتے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر دھقان (کاشت کار) انتہائی



محنت سے کام لے، یہاں تک کہ اس سخت کوشش ہی میں اس کی ہتھیلی میں بال بھی آگ آئیں، تو بھی ہمارے دانے سے کوئی ریشہ نہیں پھوٹے گا۔ اپنی ناکامی کوشش کو بیان کیا ہے۔

دادہ بر تشنگی خویش گواہی غالب

دھن ما بہ زبان خط پیانہ ما

قدیم زمانے میں پیانہ یا جام سے پر خط کھینچے ہوتے تھے جس سے شراب کی مقدار کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ اور اس اندازے سے شراب پینے والوں کو ان کے ظرف اور حوصلے کے مطابق شراب پلائی جاتی تھی۔ لیکن ایک عالی ظرف رند کے لیے یہ حد بندی اسے پیاسا رکھنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ کہتا ہے: اے غالب! ہمارا دھن، خط پیانہ کی زبان سے یہ گواہی دے رہا ہے کہ وہ پیاسا ہے۔

مرزا غالب کا اردو شعر یہ ہے

بیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار

یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

اسی طرح ایک اور جگہ کہتے ہیں:

کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایام کا

یعنی خط جام، شراب خوار کے عجز حوصلہ کی دلیل ہے۔



## غزل نمبر (۴۰)

ای گل از نقش کف پائی تو دامان ترا

گلکشاں کردہ قبا سرو خرامان ترا

تا ز خون کہ ازین پردہ شفق باز دم

رونق صبح بھار است گریبان ترا

تیرے گریبان میں صبح بھار کی سی رونق ہے۔ یہ کس کا خون ہے جو اس پردے (گریبان) سے شفق بن کر پھوٹ رہا ہے۔

شفق سے صبح بھار اور بھی رنگین اور شگفتہ نظر آتی ہے۔ شاعر محبوب کے جسم کی سرخی اور رنگینی کو، جو اس کے گریبان سے پھوٹ کر نکل رہی ہے، شفق کا نام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کس عاشق کے خون کی سرخی ہے جو تیرے گریبان سے نمایاں ہو رہی ہے، یعنی کس محبت کی سرشاری نے تیرے جوہن کو یوں شگفتہ بنا کر رکھا ہے؟

ہر قدر شکوہ کہ در حوصلہ گرد آدہ بود

گوی گردید بہ مستی خم چوگان ترا

لغت: چوگان ”پولو“ کے کھیل کو کہتے ہیں۔ جو ایک گیند (گوے) اور ایک چھڑی کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔

”حوصلہ“ عربی لغت میں پونے کو کہتے ہیں عام مفہوم ظرف و حوصلہ ہے کہتا ہے کہ جس قدر بھی ہم میں شکوہ کا حوصلہ پیدا ہوا تھا۔ وہ تیری تندی طبع کے خم چوگان کے سامنے آکر گیند



بن کر رہ گیا۔ یعنی تیرا سامنا ہوتے ہی سارے شکوے، جو ہمارے دل میں تھے، دب کر رہ گئے۔

جذبہ زخمِ دلم کارگر افتاد، مبار

عطسہ غربال کند، مغز نمکدان ترا

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ عاشق دل پر زخم کھائے ہوئے ہے اور معشوق اپنے جور

و ستم سے اس پر تنگ چھڑک رہا ہے۔

کہتا ہے کہ میرے دل پر زخم کھانے کا جذبہ کمال کو پہنچ چکا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں زخم کی

تیزی سے تجھے چھینک نہ آئے اور تیرے نمکدان کا مغز چھل چھلی نہ ہو جائے

نمد بوی کباب از نفسِ غیر و خوشم

می شناسم اثرِ گرمی پنهان ترا

میں تیری محبت کی پوشیدہ حرارت کو خوب پہچانتا ہوں اور خوش ہوں کہ اس حرارت کا اثر

رقیب پر مطلقاً نہیں ہوا کیونکہ اس کے سانس سے بولے کباب نہیں ابھرتی۔

راحت دائمی ذوق طلب را نازم

گردِ نمناک بود سایہ بیابان ترا

تیری تلاش میں پیہم چلا جا رہا ہوں اور اس تلاش و طلب میں مجھے راحت دائمی نصیب

ہے اور میں اس بات پر نازاں ہوں۔ تیری طلب میں جس بیابان سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہاں کے

گرد و غبار میں ٹھنڈک ہے اور وہی گرد و غبار سایے کا کام دیتی ہے۔

چشم آغشتہ بخون بین و ز خلوت بدر آ

ایک ابہ شفق آلودہ گلستانِ ترا

خلوت سے باہر اور میری خون میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں دیکھ۔ یہ تیرے گلستاں  
(حسن) کے لیے ایک ابہ شفق آلودہ ہے۔

آئی از بزمِ رقیب و سرِ راحت میرم

تا ربایم دل از نازِ پشیمان ترا

تو بزمِ رقیب سے آرہا ہے اور میں تیری راہ میں جان قربان کر رہا ہوں تاکہ اس طرح  
تیرے دل کو، جو اپنی نافرمانیوں پر پشیمان ہو رہا ہے، موہ لوں، یعنی شاید تجھے میری اس قربانی پر  
ندامت ہو۔

چہ غم از سیلی سنگِ ستمش کرد کبود

سبزہ زاری است تم طرفِ خیابانِ ترا

نہ جانے کس غم نے اپنے جور و ستم کی سنگ ریزوں سے میرے جسم کو نیلگوں کر دیا ہے  
کہ وہ تیرے صحنِ گلستان کا سبزہ زار بن گیا ہے۔

فرصت باد کہ سر در سرِ کارت کردیم

آفتاب لبِ بامیم شبستانِ ترا

لغت: "سر در سرِ کارے کردن"۔ کسی کام کی دھن میں جان تک دے دینا۔ "آفتاب  
لبِ بام" = غروب ہونے والا آفتاب۔



ہم نے تیری محبت میں جان پر کھیل جانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اب ہم آفتاب لب  
بام ہیں اور کچھ دیر کے لیے تیرے شہستان ناز پر چمک رہے ہیں۔ اب تجھے کسی طرح کا کوئی  
فکر نہیں۔ اب تو ہے اور زندگی کی شادمانیاں۔

ہر حجابی کہ دھند روی بہ ہنگامہ شوق

پردہ ساز بود زمزمہ سنجان ترا

نعت: ”روئے داؤن“ = ظاہر ہونا۔ واقع ہونا۔

”پردہ = حجاب“ اس کا دوسرا مفہوم ”سر“ ہے شعر میں اسی دوسرے مفہوم میں آیا  
ہے۔ ”زمزمہ سنجان تو“ تیری محبت کے نغمے گانے والا عاشق۔

حجاب کے لفظ کے اعتبار سے، جو مضمون میں آیا ہے، پردے کا مفہوم حجاب ہونا  
چاہیے لیکن شاعر نے اس قریبی معنی کو چھوڑ کر اس کے بعیدی معنی لیے ہیں۔ ایسا کرنا ایک  
شعری صنعت ہے جسے ایہام کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے Ambiguity کہتے ہیں اور  
یہ صنعت شعر میں بڑی معنوی بلاغت پیدا کرتی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ محبت کے ہنگاموں میں جو حجاب بھی سامنے آتا ہے (جس سے  
تیری محبت کی حقیقت کا راز کھلتا ہے)

مرزا غالب کا یہ اردو شعر اسی مفہوم کا آئینہ دار ہے:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یعنی تو ہی ساز کے سروں سے آشنا نہیں ورنہ تو جسے حجاب سمجھتا ہے وہ دراصل

اس ساز کا پردہ (سر) ہے جس سے حقیقت کا سراغ ملتا ہے۔

فارغش ساختہ از حسرت پیکان غالب

حق بود بر جگر ریش تو دندان ترا

نعت: ”پیکان اصل میں تیر کی نوک کو کہتے ہیں، پھر تیر کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ فارغش“  
کی ش کی ضمیر کا مرجع ”جگر ریش“ ہے جو دوسرے مصرعے میں آیا ہے۔

عاشق کے دل میں محبوب کے تیر محبت کھانے کا جو شوق تھا وہ پورا نہ ہوا اور اس کے دل  
میں حسرت رہ گئی۔ اس نے اس دکھ میں دانتوں سے اپنا جگر کاٹ کاٹ کر زخمی کر لیا۔ اس سے اس  
کے زخمی جگر کو پیکان محبوب کھانے کی حسرت سے نجات مل گئی چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

اے غالب! تیرے دانتوں کا تیرے جگر ریش پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اے  
حسرت پیکان کی خلش سے (جو دل میں رہ گئی تھی) فراغت دلائی ہے۔



### غزل نمبر (۳۱)

غمّت در بوتہ دانش گدازد مغز خامان را

لبت تنگ شکر سازد دھان تلخ کامان را

نعت: ”بوتہ“ = دھات کو گھٹانے والی کھٹالی۔

”تنگ“ = باتا۔ مضموم بوری اور ایسے برتن کو بھی کہتے ہیں جو نیچے سے کشادہ ہو اور

اس کی گردن پتلی ہو۔



تیرا غم خام لوگوں کے مغز کو علم کی کنٹھالی میں پٹھلا دیتا ہے اور تیرے غم محبت سے خام لوگ پختہ دماغ ہو جاتے ہیں اور تیرے دہن کی شیرینی سے، تلخ کام یعنی آزرده لوگ مسرت کی لذت سے آشنا ہو جاتے ہیں۔

قضا در کارها اندازه ہر کس نگہ دارد

بقطع وادی غم می گمارد تیز گامان را

قدرت ہر معاملے میں ہر شخص کے ظرف اور حوصلے کو ملحوظ رکھتی ہے (اور اسی اعتبار سے انھیں کام بہرہ دہ کرتی ہے) چنانچہ وادی غم کو طے کرنے کا کام تیز رفتار رہروں کے سپرد کیا جاتا ہے۔

زہستی پاک شوگر مرد را می کاند رین وادی

گرانی ہاست زہت رہرو آلودہ دامان را

لغت: ”مرد راہ“ = سالک

”آلودہ دامن“ = وہ جس کا دامن کسی چیز سے آلودہ ہو، مجازاً گنہگار کو کہتے ہیں۔

یہاں ”رہرو آلودہ دامان“ سے وہ شخص مراد ہے جو زندگی کی راہ میں علائق دینا کا بھاری بوجھ اٹھا کر چلے۔

”ہستی“ سے مقصود یہی علائق زندگی ہیں۔

اگر تو مرد راہ ہے تو اپنے آپ کو علائق دنیا سے پاک کر لے کیونکہ آلودہ دامان مسافر کا رخت سفر اسکے لیے بھاری بوجھ بن جاتا ہے (اگر ایسا کوئی بوجھ نہ ہو تو زندگی کا سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے)۔

ناصر علی سرہندی نے اسی بات کو یوں بیان کیا ہے:

تو رہ از کثرت اسباب بر خود تنگ می سازی

سبک روحان چون بوی گل رہا کردند محمل حا

دماغ فتنہ می نازد، بسامان رسیدن حا

طلوع نشہ گرد راہ باشد خوش خرامان را

لغت: ”سامان رسیدن ہا“ = رسیدن ہے، نشے کے چڑھنے کو کہتے ہیں۔ سامان رسیدن ہا میں شراب کی تندی و تیزی و تلخی سبھی کچھ شامل ہے اسی کو شاعر نے دوسرے مصرعے میں طلوع نشہ کہا ہے۔

”دماغ فتنہ“ = فتنہ سے مراد شر ہے جو خیر کی ضد ہے۔ شر کو یہ دعویٰ ہے کہ اس کا محرکار گر ہے لیکن خیر اس سے بے نیاز گزر جاتا ہے۔ مرزا غالب نے ایسے لوگوں کے لیے خوش خرام کا لفظ استعمال کیا ہے جو ایسی فتنہ خیز راہ سے تیزی کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور فتنے کے پیدا کردہ نشے کو گرد راہ کی طری پیچھے چھوڑ جاتے ہیں

چنانچہ مرزا صاحب کہتے ہیں۔

فتنے کا دماغ اس بات پر نازاں ہے کہ اس کے پاس نشہ انگیزیوں کا پورا پورا ساز و سامان ہے، لیکن خوش خرام لوگ، یعنی ساکان راہ خیر کے لیے ”طلوع نشہ“ اپنی خوش خرامی سے اس گرد راہ کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور اپنا دامن بچا کر بہت آگے نکل جاتے ہیں۔

پی رسوائی ارباب تقویٰ جلوہ سر کن

کستان ہا ماہتابی ساز، شاہم نیک نامان را

لغت: ”وہل مشکلات“ = ”کستان“ = ایک باریک اور نرم و نازک کپڑا ہوتا ہے جس



کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ چاندنی میں پھٹ جاتا ہے۔ ”ماہتابی“ پھٹا ہوا کپڑا ”ماہتابی ساز“ یعنی اسے پھاڑ دے شاعر نے ارباب تقویٰ (پارسا لوگ) کو رسوا کرنے کے لیے نیک کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ انہیں نیک نام کہا ہے یعنی دراصل نیکو کار نہیں صرف نیک مشہور ہیں۔ کہتا ہے کہ ارباب تقویٰ کو رسوا کرنے کے لیے اپنے حسن کا ایک جلوہ دکھا اے میرے شاہ ان نیک نام لوگوں کے کتان جیسے نازک لباس تقویٰ کو پھاڑ دے (تا کہ ان کی صحیح حیثیت نظر آجائے)۔

بعض ناز خوبان را، ز مابی تاب تر دارد

عنان از برق باشد در رهش زرین ستامان را

لغت: ”زرین ستام“ = ستام لگام کو کہتے ہیں زرین ستام وہ شہسوار ہیں جن کے گھوڑوں کی لگا میں سونے کی ہیں، یعنی اصحاب شان و شوکت مراد ہے۔ حسین لوگ جنہیں شاعر نے پہلے مصرعے میں ”خوبان“ لکھا ہے۔

جب وہ ناز و داد دکھاتا ہے تو حسین لوگ ہم سے زیادہ بے تاب ہو جاتے ہیں۔ اس کی راہ میں بڑے بڑے شاہسوار ان حسن کی عنان برق کی ہوتی ہے، یعنی وہ بے تاب ہو کر فی الفور آگے سے گزر جاتے ہیں۔

خرابیم و رضائش در خرابی های ما باشد

ز چشم بد نگھدارد خدا، ما دوست کا مان را

لغت: ”خراب“ = مست، ویران اور تباہ حال تینوں معنوں میں آتا ہے ”دوست کام“ وہ شخص جس کی حالت دوستوں کی خواہش کے عین مطابق ہو یعنی اچھی حالت۔

ہم خود بھی خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی اسی میں ہے کہ ہم خراب حال رہیں۔ خدا

تعالیٰ ہم دوست کاموں کو نظر بد سے محفوظ رکھے، یعنی اللہ کرے ہم خراب حال ہی رہیں کیونکہ اس سے بڑھ کر کوئی بڑی خوش نصیبی نہیں ہو سکتی۔

بسا افتادہ سرمست و بسا افتادہ در طاعت

تو دانی تا بہ لطف از خاک برداری کد امان را

بہت سے تیری راہ محبت میں سرمست پڑے ہیں اور بہت سے بندگی اور اطاعت میں مصروف ہیں۔ اب تو ہی جانتا ہے کہ ان میں سے کن کو تو اپنے لطف و عنایت سے خاک پر سے اٹھا لے گا، یعنی کون تیری نظر میں مقبول ہوگا۔

یہاں نظیری نیشاپوری کا ایک شعر یاد آ گیا کہتا ہے:

دو نیم گشتہ از کفر و دین، نمی دامن

کزین دو پارہ دل، آید ترا بکام کدام

یعنی میرا دل کفر و دین کے باہمی ہنگامہ ہائے نزاع سے دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ نہ جانے دل کے ان دو ٹکڑوں میں سے کون سا تجھے مرغوب ہوگا۔ (کفر والا یا ایمان والا)

ز قاتل مژدہ زخمی گلم در جیب جان ریزد

نشاط انگیز باشد بوی خون، خونین مشامان را

لغت: ”خونین مشام“ جن کے دماغ میں خون کی بوسائی ہو۔ قاتل کی طرف سے اس خوشخبری کا آنا کہ اس کے ہاتھوں محبت کا زخم لگے گا، ہماری روح کے جیب و دامن کو پھولوں سے بھر دیتا ہے۔ کیوں نہ ہو خونین مشام لوگوں کے لیے بے خوں فرحت افزا ہوتی ہے۔



جہان را خاصی دعای است آن مغرور و این عاجز

بیا غالب ز خاصان بگور و بگوار اماں را

دنیا میں خواص بھی ہیں اور عوام بھی۔ خواص مغرور ہیں اور عوام عاجز۔ اے غالب تو ان اصحاب خاص کو بھی نظر انداز کر دے اور عامیوں سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لے۔



### غزل نمبر (۴۲)

نگویم تازہ دارم شیوہ جادو بیابان را

ولی در خویش بیم کار گر جادوی آنان را

میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے جادو بیاں شاعروں کے اسلوب شاعری کو تازہ رکھا ہے، البتہ اُن کے سحر فن سے مسحور ضرور ہوا ہوں۔

ہمانا پیشکارِ بختِ ناسازم بہ تمھائی

ستوہ آورده ام از چارہ جوئی مھر بانان را

میں تمھائی میں اپنے بخت ناسازگار کا خدمت گزار بنا بیٹھا ہوں۔ میں نے اپنے مہربان غم گساروں سے چارہ جوئی کا تقاضا کرتے کرتے انھیں عاجز بنا دیا ہے۔ اور اب میں اپنے بخت ناسازگار کی خدمت میں مصروف ہوں۔

یعنی میرے تمام چارہ ساز احباب میری چارہ سازیوں سے عاجز آچکے ہیں۔ اب میں اکیلا اپنی بدبختی کو سنوارنے میں مصروف ہوں۔

ندارد حاجتِ لعل و گھر حسن خدا دادت

عبث در آب و آتش رائدہ با زار گانان را

کہا جاتا ہے کہ آفتاب کی مسلسل گرمی سے نگر بڑے لعل بن جاتے ہیں۔ لعل کا رنگ بھی آتشیں ہوتا ہے گوہر پانی میں ہوتا ہے اور پھر اس میں آب بھی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے شاعر شعر کے دوسرے مصرعے میں آب و آتش کے الفاظ لایا ہے جو بڑے موزوں ہیں کہتا ہے: تیرے حسن خدا داد کو لعل و گوہر کی حاجت نہیں ہے۔ تو نے سودا گروں کو بے سود آب و آتش میں دھکیل دیا ہے۔ (جہاں وہ موتی اور لعل و جوہر ڈھونڈتے پھرتے ہیں)

چہ بی برگی است جانِ داوَن بہ زخمی زان دمِ خنجر

هلا کستم هستم فراخیِ حائی عیشِ سختِ جانان را

لغت: ”بے برگی“ = بے مانگی۔ یہاں زبوں ہمتی یا کم ہمتی مقصود ہے۔

اس (محبوب) کے خنجر کی دھار سے ایک زخم کھالینے پر جان دے دینا کتنی کم ہمتی ہے۔ میں تو اس بے پناہ وسعت نشاط و مسرت کا شبید ہوں جو سخت جانوں کو نصیب ہوتی ہے (کہ مرے سے زخم پہ زخم کھاتے چلے جاتے ہیں اور سخت جان ہونے کے باعث مرتے بھی نہیں کہیں یہ لذت ختم نہ ہو جائے)۔

عوض دارد گر آزارِ دلمِ آزرده می خواهم

بہ قتلِ خویش دست و ساعدِ نازک میانان را



اگر میرے آزار دل کا کوئی عوض ہے تو وہ یہی کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے قتل میں نازک کمر محبوب کے دست و بازو (کلائی) بھی آزرہ ہوں۔

سرای فتنہ های زہرہ سوز از خویشتن گیرم

رگ اندیشہ نبض کار باشد کار دانان را

نفت: "فتنہ" = محبت کا ہنگامہ۔

"زہرہ" = پتا "فتنہ" ہاے زہرہ سوز "محبت کی زہرہ گداز کیفیتیں۔ مجھے اپنی حالت ہی سے محبت کی زہرہ گداز کیفیات کا سراغ مل جاتا ہے۔ کار فہم لوگ، رگ فکری سے کام کی نبض پہنچان لیتے ہیں۔

بہ لفظ عشق صدرہ کوہ و دریا درمیان گفتن

بیاموزید تا پیشش برید افسانہ خوانان را

نفت: "صدرہ" = لفظی معنی سوراخ ہیں، مراد سوانداز سے شاعر یہ کہتا ہے کہ عشق میں ہزاروں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عشق نام ہے ہزاروں کنھن منزلوں سے گزرنے کا۔ عشق میں کئی ایک مصیبتوں کے پہاڑ طے کرنے پڑتے ہیں اور سمندروں کے طوفانوں سے گزرنا پڑتا ہے عشق سے مقصود ایسی ہی کنھن مشکلات ہیں چنانچہ اس مفہوم کو یوں ادا کیا۔:

لفظ عشق کی شرح بیان کرنے کے لیے ہزار انداز میں عشق کے افسانہ خوانوں کو کوہ و دریا کا تذکرہ کرنا سکھاؤ، پھر اس کے روبرو لے جاؤ۔

نہ بنی برگ زر زرگشت و گل کبریت احمر شد

کند پاییز گوئی کیمیا گر باغبانان را

کبریت گندھک ہے۔ "کبریت احمر" سرخ گندھک جو کیا ہے۔ "پاییز" = خزاں۔

کیا تو نے نہیں دیکھتا کہ انگور کے پتے سونا بن گئے اور گلاب کا سرخ پھول کبریت احمر بن گیا ہے۔ گویا خزاں نے باغبانوں کو کیمیا گر بنا دیا ہے، یعنی خزاں نے اکسیر کا کام کیا کہ جہاں انگور کی نیل تھی اس کے پتے زرد ہو کر سنہری ہو گئے اور سرخ پھول سرخ گندھک دکھائی دینے لگا۔ خزاں کیا آئی گویا کوئی اکسیر گر آ گیا جس نے چیزوں کی ہیبت کو بدل دیا۔

مراد یہ ہے کہ خزاں میں بھی اپنا ایک حسن ہوتا ہے شاعر نے رز اور زر دو لفظ استعمال کیے ہیں جن میں ترکیب حروف کی ضد ہے۔ یہ ایک لفظی صنعت ہے جسے تجنیس خطی کہنا چاہیے۔

مرنج از ناروائی، بی نیازی عالمی دارد

حکایت ہا بود با خویشتن مر بی ز بانان را

دوسروں سے بات نہ کرنا اور خوش رہنا ایک ناروا اسی بات ہے، اس سے بے نیازی بنتی ہے لیکن اس میں بھی ایک شان ہوتی ہے۔

ہم جو بے نیاز ہیں تو اسے ناروا خیال نہ کر، بے نیازی کی بھی ایک شان ہوتی ہے۔ بے زبان لوگ اپنے آپ سے محو گفتگو ہوتے ہیں اور ہزار باتیں کرتے ہیں۔

نگیرد دیگران را حق بہ جرمی کز یکی بخشد

سرت گرم شفیع روز محشر دستانان را

مرزا غالب کے نزدیک دستانی یعنی دوسرے کا دل چرا لینا جرم ہے۔ چنانچہ جہاں دوسرے دستان ہیں وہاں ان کا محبوب بھی دستان ہے۔ سبھی جرم دار ہیں۔ لیکن مرزا غالب کے



محبوب کی دلستانی ایک ایسا جرم ہے جس کی شفاعت خود اس کا حسن کرتا ہے۔ اس کے حسن کا یہ عالم ہے کہ کوئی دل دیے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے وہ قابلِ مواخذہ نہیں۔ قیامت کے دن خدا سے معاف کر دے گا۔ اب خدا کے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر وہ کسی ایک انسان کے خاص جرم سے درگزر کرے گا۔ تو اسی جرم کے دوسرے سزاواروں کو کیوں کر سزا دے گا۔ لازماً ان کے جرم سے بھی اسے درگزر کرنا ہوگا۔ چونکہ یہ عفو جرم مرزا غالب کے محبوب کے باعث ہوا ہے۔ اس لیے اسے شفیق کہا ہے۔ گویا اس کا حسن دوسرے دل چھیننے والوں کی شفاعت کا کام کرے گا۔

چنانچہ کہتا ہے کہ ”خدا کسی ایک شخص کا کوئی جرم معاف کرے تو اسی نوعیت کے جرم کی بنا پر دوسروں کا مواخذہ نہیں کرے گا۔ میں تیرے قربان جاؤں تو قیامت کے دن دوسرے معشوقانِ دلستان کا شفیق ہوگا۔“

ندانم قدر غم تا در نماںد کس بدان غالب

مسرت خیزد از تقلید پیران نو جوانان را

اے غالب! کسی کو غم کی قدر نہیں ہوتی جب تک وہ خود غم میں اسیر نہ ہو۔ بوڑھوں کے تجربے کی پیروی سے نو جوانوں کو خوشی ہوتی ہے۔



## ردیف (ب)

### غزل نمبر (۱)

خیز و بی راہ روی را سر راہی دریاب

شورش افزا نگہ حوصلہ گاہی دریاب

لغت: ”دریاب“ دریافتن مصدر سے فعل امر ہے۔

فارسی زبان میں مصدر کے ساتھ حروف کو یا الفاظ کو پیوست کرنے سے بے شمار محاورے بنتے ہیں۔ بہم شدن۔ فراز کردن۔ آشنا ساختن۔

چنانچہ یافتن سے دریافتن بنا ہے۔ یافتن کے معنی محض کسی چیز کو پالینا ہے۔ دریافتن کا مفہوم کسی نامعلوم چیز کو معلوم کرنا یا کسی معاملے کی تک پہنچنا ہے۔ اس کے بعد اس محاورے کے کئی ایک معنوی پہلو ابھرتے ہیں جیسا کہ اسی غزل میں ”دریاب“ کے لفظ سے جو اس غزل میں بطور ردیف کے آیا ہے واضح ہو جائے گا۔

عالم آئینہ راز است چہ پیدا، چہ نہان

تاب اندیشہ نداری بہ نگاہی دریاب

لغت: ”پیدا و نہان“ ظاہر و باطن۔

اس کائنات کے دو پہلو ہیں۔ ایک ظاہر اور ایک باطن۔ بہر حال یہ عالم ظاہر ہو یا باطن، ایک ایسے آئینے کی طرح ہے جس میں راز حقیقت منعکس ہوتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ



اگر تجھ میں اس کائنات پر غور کرنے کی طاقت نہیں ہے تو کم از کم اس پر ایک نظری ڈال لے کیونکہ یہ عالم اسرار حقیقت کا مظہر ہے۔

گر بہ معنی نہ رسی، جلوہ صورت چہ کم است

خُم زلف و شکن طرف کلاہی دریاب

لغت: معنی و صورت باطن و ظاہر ”شکن کلاہ“ کلاہ کا ایک طرف کو جھکاؤ جس سے کج کلاہی کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر تو حسن کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا تو حسن کا ظاہری جلوہ کسی حالت میں کم نہیں۔ تو محبوب کی زلفوں کے خم اور شان کج کلاہی سے لذت اندوز ہو۔

غم افسردگی ام سوخت، کجائی ای شوق

نقسم را بہ پر افشانی آہی دریاب

لغت: ”پر افشانی“ = پروں کا پھڑ پھڑانا۔ کسی چیز کا شوق (عشق) زندگی میں توانائی پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہو تو زندگی پر افسردگی طاری ہو جاتی ہے اس افسردگی کے عالم میں انسانی سانس، سانس نہیں رہتا، اس میں ایک آہ کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا سانس آہ کے انداز میں پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

اس افسردگی کے غم نے مجھے جلا دیا۔ اے شوق تو کہاں ہے؟ آ اور میرے سانس کو اس عالم بیچ دتا ہے میں سہارا دے (تاکہ یہ افسردگی دور ہو جائے)

بر توانائی ناز تو گواہیم ز عجز

تاب بی جاوہ، بہ جذب پر کاہی دریاب

لغت: ”بے جاوہ“ = ایک قسم کا جوہر یا پتھر ہے جو کمرہ کی طرح تنکے (کاہ) کو کھینچ لیتا ہے۔

ہمارے عجز و نیاز سے تیرے ناز و انداز کی قوت کا پتا چلتا ہے۔ یوں سمجھ لے کہ تیرا ناز حسن ایک کمرہ ہے جو ایک تنکے کو کھینچے چلا جا رہا ہے۔

تا چھا آئینہ حسرت دیدار تو ایم

جلوہ برخود کن و مارا بہ نگاہی دریاب

اگر تو ہمیں اپنا جلوہ نہیں دکھاتا تو نہ سہی، اپنے آپ ہی کو اپنا جلوہ دکھاتا کہ ایک نظر میں تمہیں ہماری حالت کا اندازہ ہو جائے کہ ہم تیرے دیدار کی حسرت میں کس طرح سرتاپا آئینہ بنے بیٹھے ہیں۔

تو در آغوشی و دست و دلم از کار شدہ

تشنہ بی دلو و رن بر سر چاہی دریاب

لغت: ”دلو“ = ڈول ”رن“ رسی ان دو چیزوں کے ذریعے کنویں میں سے پانی نکالا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ (نحن اقرب الیہ من جبل الوریث) اس کے باوجود ہم اسے نہیں پاسکتے۔ یہی بات اس شعر کا پس منظر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تو ہمارے آغوش میں ہے۔ پھر بھی ہمارے ہاتھ اور دل تجھ سے محروم ہیں۔ ہماری محرومی کا اندازہ کر کے یوں سمجھ لے کہ ایک پیاسا کنویں کے کنارے کھڑا ہے اور اس کے پاس نہ ڈول ہے نہ رسی وہ حسرت سے پانی کو دیکھ رہا ہے۔



مرزا بیدل کا شعر ہے:

ہمہ عمر با تو قدحِ زودیم و نہ رفت رنجِ خمار ما  
چہ قیامت کی نمی ز کنار ما بہ کنار ما

داغِ ناکامی حسرت بود آئینہٴ وصل

شبِ روشنِ طلّی، روزِ سیاہی در یاب

جذبہٴ عشق کے بارے میں مرزا غالب کا یہ تصور ہے کہ یہ جذبہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ وصل نصیب ہونے پر بھی اسے تسکین نہیں ہوتی بلکہ اس کی بے تابیاں بڑھ جاتی ہیں۔ ان کا شعر ہے:

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال

موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یعنی اگر تجھے یہ خیال ہے کہ وصال میں شوق کے ولولے کم ہو جاتے ہیں تو پانی میں لہروں کو دیکھ کہ کس طرح ایک دوسرے سے گلے ملنے پر بھی کتنی بے تاب پھرتی ہیں۔ اس فارسی شعر میں مرزا مرحوم نے کم و بیش یہی تصور پیش کیا ہے کہتے ہیں آئینہٴ وصل کی چمک کو نہ دیکھ یہ آئینہٴ وصل بھی حسرتوں کی مایوسیوں اور ناکامیوں کے سیاہ داغ کی طرح ہے۔ وصل کی کوشش تو ایسی ہے کہ انسان ایک روشن رات کو طلب کرے مگر اسے روز سیل جائے۔

فرصت از کفِ مدہ و وقتِ غنیمت پندار

نیمتِ گر صبحِ بھاری شبِ ماہی در یاب

موقع کو ہاتھ سے نہ چھوڑ اور وقت کو غنیمت سمجھ۔ اگر صبح بھاری نہیں تو شب ماہ (چاندنی رات) ہی سے تمتع حاصل کر۔ مرزا غالب کا یہ شعر تو دیکھیے:

کوئی کہے کہ شبِ مدہ میں کیا برائی ہے

بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

صبح بھارا اور شب ماہی میں "مے" پائے تنگیری ہے یعنی کوئی سی صبح بھارا اور کوئی شب ماہ

غالب و کشمکشِ بیم و آمیدش صیحات

یا بہ تنگی بکش و یا بہ نگاہی در یاب

غالب ہو اور یوں امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ افسوس ہے! یا تو تلووار کے ایک وار سے اسے مار ڈال یا ایک بار نگاہِ لطف سے اس کا مداوا کر۔



## غزل نمبر (۲)

گر پس از جورِ بانصاف گراید چہ عجب

از حیا روئی بما گر نہ نماید چہ عجب

مولانا حالی اس شعر کی وضاحت یوں کرتے ہیں:-

"ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہو جائے تو کچھ عجب نہیں۔ یعنی اپنے

پچھلے ظلم یا دکر کے ہم کو منہ نہ دکھائے تو کچھ تعجب نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انصاف بھی کرے گا تو

اس طرح کرے گا کہ ہم اس کے دیکھنے سے محروم رہیں۔"

مزید وضاحت کے لیے مرزا غالب کے یہ شعر دیکھیے:



جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا  
کہتے ہیں ہم تم کو منہ دکھلائیں کیا

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے  
جنائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

بودش از شکوہ خطر، ورنہ سری داشت بمن  
بمزارم اگر از مھر بیاید، چه عجب  
لغت: ”سری بمن داشت“ = اے مجھ سے ایک لگاؤ تھا۔

میرے محبوب کو یہ اندیشہ تھا کہ مجھ سے ملے گا تو میں شکوہ کرونگا (اس لیے وہ ملنے سے  
گریز کرتا تھا) ورنہ وہ میری طرف مائل تھا۔ (اب جو میں مر گیا ہوں اور ایسے اندیشے کا کوئی  
امکان نہیں) اب اگر وہ میرے مزار پر مہربانہ انداز میں آجائے تو کوئی غیب بات نہیں۔

رسم بیان بمیان آمدہ، خود را نازم

گفتہ باشد کہ زبستن چه کشاید، چه عجب

مرزا غالب کے یہاں گہرے فکر اور شدید احساسات کے ساتھ ساتھ مزاح و ظرافت کا  
عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ شعر اسی انداز کا ہے۔

میرے محبوب نے رسمی طور پر عہد وصال کیا ہے اور میں اپنے آپ پر ناز کر رہا ہوں۔  
کوئی عجب نہیں کہ اس کا یہ عہد و بیان محض اس لیے ہو کہ خالی عہد و بیان باندھنے سے کیا ہوتا ہے۔  
(پورا کرنا تو اور بات ہے)

شیوہ ہا دارد و من معتقد خوی وی ام

شوقم از رنجش او گر بفزاید چه عجب

اس کے ناز و انداز کے کئی ایک تیور ہیں، اور میں اس کی عادت کے ان تیوروں کا قائل  
ہوں۔ اگر اس کے مجھ سے روٹھ جانے سے میرا ذوق و شوق محبت اور بھی زیادہ ہو جائے تو کچھ  
عجب نہیں، یعنی محبوب کا روٹھنا دراصل عاشق کی آتش شوق کو بجھکانا ہے۔

چون کشد می، کشدم رشک کہ در پردہ جام

از لب خویش اگر بوسہ رباید چه عجب

شراب پیتے وقت لوگ اپنے بھیکے ہوئے لبوں کو چاٹ لیا کرتے ہیں۔ معشوق بھی  
عالم ے نوشی میں اپنے لبوں کو چاٹتا ہے۔ عاشق یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے لبوں کو خود چوم  
رہا ہے۔ اس پر اسے رشک آتا اور کہتا ہے: جب وہ شراب پیتا ہے تو مجھے رشک آتا ہے۔ میں  
سوچتا ہوں کہ کہیں اس جام کے پردے میں وہ اپنے لبوں کا خود ہی بوسہ نہ لے رہا ہو۔

طرہ درہم و پیراھن چاکش نگرید

اگر از ناز بخود ہم نگراید، چه عجب

اس کی پریشان زلفوں اور پیراھن چاک کو دیکھو۔ (اپنے چاہنے والوں کی طرف توجہ  
دینا تو درکنار) اگر اس عالم ناز و انداز میں اپنی طرف بھی مائل نہ ہو تو کوئی عجیب بات نہ ہوگی۔

ہرز میرم شمر و ز پی تعلیم رقیب

بہ وفا پیشگی ام گر بستاید چه عجب



لغت: ”ہرزہ میر“ = وہ شخص جو بے فائدہ اپنی جان دے دیتا ہے۔  
 ”وفا پیشگی“ = شیوہ وفا، وفاداری۔

مجھے، دانگاں جان دینے والا خیال کرتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ میرے بارے میں یہ رائے قائم کر کے رقیب کو درس وفادارینے کے لیے میری وفاداری کی تعریف کرے تو کوئی عجیب بات نہیں۔

یعنی عاشق کی جاں نثاری کا تذکرہ کرنے سے عاشق کی تعریف کرنا مقصود نہیں بلکہ دور پردہ رقیب کو وفا پراکسانا ہے۔

کار با مطربہ زہرہ نھادی دارم  
 گر بلم نالہ بہ ہنجار سراید چہ عجب

لغت: ”ہنجار“ = لغوی معنی راہ اور طریق کے ہیں مجازاً طرز روش کو کہتے ہیں۔

”زہرہ“ ستارہ ہے، اسے رقاصہ فلک بھی کہا جاتا ہے۔ قدیم الایام میں یونانی اس کی طرف رقص و سرور کو منسوب کرتے تھے۔ ”زہرہ نہاد“ جس کی فطرت زہرہ جیسی ہو، یعنی مغنیہ۔

مجھے ایک زہرہ خصلت مطربہ سے واسطہ پڑا ہے اس لیے اگر میرے لبوں سے نالہ و نفاں بھی نغمہ کے انداز میں، بلند ہو تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہوگی۔

آنکہ چون برق بہ یک جائی نہ گیرد آرام

گلہ اش در دل اگر دیر نپاید چہ عجب

عاشق کے دل میں وارفتگی محبت اور دیوانگی عشق کے باوجود کبھی کبھی معشوق کے خلاف شکایت کا جذبہ ابھر آتا ہے، لیکن وہ دیر پا نہیں ہوتا۔ چنانچہ شاعر اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

وہ محبوب جو برق کی طرح ایک لحظہ بھی کہیں نہیں ٹھہرتا، اگر اس کے بارے میں گلہ اور شکوہ دل میں ابھر بھی آئے تو یہ عجیب بات نہیں ہوگی کہ وہ گلہ اور شکوہ دیر پا نہ ہو اور جلد ہی مٹ جائے۔

باچنین شرم کہ ز ہستی خویش باشد

غالب از رخ بہ رو دوست نساید، چہ عجب

غالب، خدائے مطلق کی ہستی کے مقابلے میں اپنی ہستی کو حقیر سمجھتا ہے اور شرم محسوس کرتا ہے۔ ایسی حقیر ہستی کا معبود مطلق کے آگے سر بسجود ہونا بھی مناسب نہیں۔ چنانچہ کہتا ہے: اس شرم کے باعث جو غالب کو اپنی ہستی سے محسوس ہو رہی ہے۔ اگر وہ محبوب کی راہ کی جھہ سائی نہ کرے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔



## غزل نمبر (۳)

جنوں محل بہ صحرائی تحیر راندہ است امشب

نگہ در چشم و آہم در جگر و اماندہ است امشب

لغت: ”تحیر“ = حیرت۔

عشق و محبت کے انتہائی مقامات میں ایک مقام حیرت ہے۔ مقام حیرت وہ مقام ہے کہ جہاں انسان، محبوب کے تصور میں ایک ہی جگہ ٹھہر جائے یا رک جائے۔ اسی مقام



حیرت کو مرزا غالب نے تحریر کیا ہے اور اس کیفیت کو بڑے خوبصورت اور پر زور اسلوب میں یوں بیان کیا ہے:

ہمارا جنون شوق آج صحرائے تحریر میں محمل رانی کر رہا ہے، (یعنی ہم مقام حیرت میں کھو گئے ہیں۔) میری نگاہ آنکھ ہی میں اور آہ سینے ہی میں تھم کر رہ گئی ہے۔

بہ ذوق وعدہ سامان نشاطی کردہ پندارم

ز فرش گل بروی آتشم بنشانده است امشب

لغت: ”فرش گل“ = پھولوں کا فرش جو خوشی اور نشاط کی نشانی ہے۔ کسی عزیز دوست یا مہمان گرامی کے آنے پر پھول فرش پر بکھیر دیے جاتے ہیں۔ ان بکھرے ہوئے پھولوں کو فرش گل کہا جاتا ہے۔

محبوب نے میرے گھر آنے کا وعدہ کیا ہے اور میں نے اس وعدے کی لذت میں عیش و نشاط کے سامان مہیا کر لیے ہیں۔ ایک طرف انتظار کی بے تابی، دوسری طرف وعدے کے پورا ہونے کی غیر یقینی حالت، مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں آج رات ”فرش گل“ پر نہیں، آگ پر بیٹھا ہوں۔

گلوں کی سرخی کو آگ سے تشبیہ بڑی شوخ تشبیہ ہے۔ انتظار کی بے چینی کا یہ عالم ہے کہ جیسے آتش زیر پا۔ ”از فرش گل بروے آتش“ میں اگر حرف جار ”از“ کے سادہ معنی لیے جائیں تو اس عبارت کا ترجمہ یہ ہوگا: فرش گل سے آگ پر۔ لیکن یہاں ”از“ اضافی ہے یعنی اضافت کے لیے آیا ہے، چنانچہ عبارت یوں بنتی ہے: بروے آتش فرش گل، یعنی فرش گل کی آگ پر یعنی وہ فرش گل جو آگ کی مانند محسوس ہو رہا ہے۔ چنانچہ آتش، فرش گل میں آتش کی اضافت تشبیہی ہے۔ بہر حال ”از“ کے ہر دو مفہوم سے انتظار کی بے انتہا بے چینی مقصود ہے جسے

لمرزا غالب نے بڑی محاکاتی فنکاری سے ادا کیا ہے۔

خیال وحشت از ضعف روان صورت نمی بندد

بیابان برنگہ، دامان ناز افشانده است امشب

لغت: ”خیال وحشت صورت نمی بندد“ وحشت کے تصور کی کوئی صورت نہیں بنتی۔

ضعف روان“ = ضعف جاں۔

تا طاقی کے باعث وحشت کا خیال ہی نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے آج رات بیابان نے ہماری نگاہوں پر اپنا دامن ناز پھیلایا ہوا ہے۔ ضعف کے باعث، وحشت کا جذبہ دب کر رہ گیا ہے۔ اس خیال کو مرزا نے بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

دل از من عاریت جستند اہل لاف و دانستم

سمندر این غریبان را بہ دعوت خوانده است امشب

لغت: ”عاریت جستند“ = عارضی طور پر مانگنا۔

”اہل لاف“ = جھوٹے دعوے کرنے والے لوگ مراد اہل ہوس۔ ”سمندر“ ایک

کیزا ہے جو آگ میں رہتا ہے۔

”غریب“ = اجنبی یہاں آتش عشق سے بیگانہ لوگ مراد ہیں۔ عاشق کا دل سمندر کی

طرح ہوتا ہے جس کی زندگی، محبت کی آگ ہے۔

شاعر نے اہل لاف کو شہر محبت کے اجنبی لوگوں کا خطاب دے کر کہا ہے:

اہل ہوس نے مجھ سے میرا دل عاریتاً مانگا اور میں سمجھ گیا کہ سمندر نے ان محبت سے

بیگانہ لوگوں کو بلایا ہے۔ گویا عاشق سے اہل ہوس کا دل عاریتاً طلب کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ



محبت کی چاشنی سے آشنا ہونا چاہتے ہیں۔

زخمی آسائش جاوید، همچون صورتِ دیبا

نم زخم تن و بستر بھم چپانده است امشب

لغت: ”دیبا“ = رنگ برنگ نرم ریشم۔

چپاندن = چپکانا۔

جب جسم پر بہت زیادہ زخم ہوں تو انسان زخموں سے تڑپتا اور بے چین ہوتا ہے لیکن

جب زخم زیادہ رسنے لگیں اور بدن، بستر سے چمٹ جائے تو بلنا ذرا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس حالت کو شاعر نے آسائش سے تعبیر کیا ہے۔ کہتا ہے:-

زخموں کے رسنے نے میرے تن کو بستر سے یوں چپکا دیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے رنگین ریشمی لباس جسم سے چپک گیا ہے۔ اس آسودگی جاوید کے کیا کہنے۔

مرزا غالب نے زخموں کے مختلف نشانات کو، جو بستر پر پڑ گئے ہیں۔ رنگ برنگے ریشم سے تشبیہ دی ہے جو بڑی واضح ہے۔ آسائش کے لفظ میں ایک لطیف طنز بھی ہے۔

بقدر شام ہجرانش، درازی بادِ عمرش را

فلک نیز از کواکب سحرِ ہاگردانده است امشب

لغت: ”سحر“ = تسبیح۔ ”کواکب“ = ستارے۔ ”سحر گردانن“ = تسبیح پھیرنا، دعا

مانگنا۔ آسمان کے ستاروں کو تسبیح کے دانوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کہتا ہے:-

اللہ کرے اس کی (محبوب کی) عمر، اس کی شامِ جدائی کی طرح دراز ہو جائے۔ آج

رات تو آسمان بھی ستاروں کی تسبیح پھیر کر اس بات کی دعائیں مانگ رہا ہے۔

بخوابم می رسد بند قبا وا کرده از مستی

ندانم شوقِ من بروی چه افسون خوانده است امشب

لغت: ”قبا“ = ایک تنگ اور چست لباس ہوتا تھا۔

”بند قبا وا کردن“ = قبا کے بٹن کھول دینا۔

محبوب، مستی کے عالم میں بند قبا کھولے ہوئے مجھے خواب میں نظر آیا۔ نہ جانے

میرے شوق وصال نے آج رات اس پر کیا جادو کر دیا ہے۔

بدست کیست زلفت کاین دلِ شوریدہ می نالد

سر زنجیرِ مجنون را کہ می جنبانده است امشب

شاعر نے محبوب کی زلفوں کو، جو بٹل کھائے ہوئے ہیں، مجنوں (عاشق دیوانہ) کی زنجیر

سے تشبیہ دی ہے۔ کہتا ہے:

تیری زلفوں سے کس کے ہاتھ ٹھیل رہے ہیں کہ میرا دل دیوانہ فریاد کر رہا ہے۔

محبوب کی زلفوں میں تو عاشق اسیر ہے۔ غیر کے ہاتھوں کا وہاں تک پہنچنا کس طرح عاشق کو گوارا ہو سکتا ہے۔

خوش است افسانہ دردِ جدائی مختصر غالب

بہ محشر می توان گفت آنچه دردِ دل مانده است امشب

جدائی کی داستان بڑی دراز ہوتی ہے۔ اسے اس زندگی میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

شاعر کہتا ہے:

دردِ جدائی کا افسانہ مختصر ہی اچھا ہے اس کے بیان کرتے کرتے جو کچھ آج رات دل



میں رہ جائے وہ قیامت کے روز بیان کیا جاسکتا ہے۔

قیامت کا دن دراز ہوگا اور پھر اس روز داستان درد کی شنوائی بھی ہوگی۔ اس دنیا میں دکھڑا جتنا کم رویا جائے بہتر ہے۔



## غزل نمبر (۴)

از اندہ نایافت قلق می کنم امشب

گر پردہ ہستی است کہ شق می کنم امشب

لغت: ”اندہ“ = اندوہ کا مخف ہے۔ رنج و غم۔

”کہ“ کا حرف متعدد معنوں میں مستعمل ہے۔ یہاں ”کہ“ کا مفہوم ”ہم“ یعنی بھی

کا ہے۔ دوسرے مصرعے کی عبارت یوں ہے۔

گر پردہ ہستی است ہم شق می کنم امشب

یعنی اگر پردہ ہستی بھی درمیان میں حائل ہے تو میں وہ بھی آج رات پھاڑ دوں گا ”نا یافت“ ”نارسائی“ حقیقت کا سراغ نہ ملنا۔

شاعر کہتا ہے کہ آج رات مجھے اپنی نارسائی کا انتہائی قلق محسوس ہو رہا ہے۔ آج رات اگر میرے اور حقیقت کے درمیان خود میری ہستی کا پردہ حائل ہوا تو اس پردے کو بھی پھاڑ دوں گا تاکہ حقیقت تک پہنچ سکوں۔

هان آئندہ بگذار کہ عکس نفربد

نظارہ یکتائی حق می کنم امشب

آئینے میں آئینہ دیکھنے والے کا عکس نظر آتا ہے جو ہو بہو ہی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود مختلف ہوتا ہے۔ صوفیہ کے نزدیک مظاہر کائنات، ذات حق کے عکس ہیں، لیکن ذات حق ان سے الگ تھلک ہے وہ یکتا ہے۔ اس میں دوئی کا شائبہ تک نہیں۔ حق میں آنکھ کو ان عکسوں سے تسکین نہیں ہوتی۔ وہ یکتائی حق کو ترستے ہیں۔

مرزا غالب کہتے ہیں کہ آئینے کو چھوڑ دے۔ میں اس آئینے میں پڑنے والے عکس کے فریب میں نہیں آسکتا۔ آج رات تو میں یکتائی حق کے نظارے کر رہا ہوں اور اسی میں محو ہوں۔

آتش بہ نھادم شود آب از تھب مغرم

از تب نبود اینکہ عرق می کنم امشب

لغت: ”عرق کردن“ = پسینے سے شرابور ہونا۔

”نہاد“ = طینت، طبیعت۔ ”تب“ = حرارت۔ بخار

”تھب“ = گرمی۔ تھب مغرم، ذہن یا خیالات کی گرمی۔

میرے ذہن کی گرمی سے میرے جسم یا طبیعت کی آگ پکھل کر پانی ہو گئی ہے۔ یہ جو مجھے پسینہ آ رہا ہے یہ پسینہ نہیں ہے۔ یہ اُسی پانی کے قطرے ہیں جو میرے جسم پر نمودار ہو رہے ہیں۔

جان برلم اندازہ دریا کشی ام نیست

از می طلب سد رمق می کنم امشب



لغت: ”دریا“ = فارسی میں سمندر کے معنوں میں مستعمل ہے۔

”دریا کشی“ = شراب کے سمندر کے سمندر پی جانا۔ کثرت نے نوشی مراد ہے۔

”رمتی“ = بقیہ جان۔ نحیف جانی یا نیم جانی کا عالم۔

”سدرمتی“ = بقیہ جان کو روکے رکھنا، زندہ رہنے کی کوشش۔

میں جاں بلب ہوں۔ مجھے اپنی بلا نوشی کا کوئی اندازہ نہیں، (پے چلا جا رہا ہوں) میں

تو شراب سے اپنی جان کو، جو باقی رہ گئی ہے، روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اس شعر میں ’طلب‘ کا لفظ بہت بلیغ واقع ہوا ہے اور شعر کی جان ہے۔ شاعر نے یہ

نہیں کہا میں شراب سے بقیہ جان کو قائم رکھے ہوئے ہوں۔ اس نے سدرمتی نہیں لکھا بلکہ طلب

سدرمتی کہا ہے۔ شراب سے سدرمتی کی محض توقع ہے یعنی شراب سے زندہ رہنے کی کوشش کی جا

رہی ہے۔ شراب کا مداوے غم ہونا کوئی قطعی بات نہیں۔ یہ تو ایک عارضی سہارا ہے:

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

جو مے و نغمہ کو اندوہ رہا کہتے ہیں

از ہر بن مو چشمہ خون باز کشادہ

آرایش بستر ز شفق می کنم امشب

میں نے ہر بن مو سے ایک چشمہ خون بہا دیا ہے۔ آج میں اس خون سے شفق کا کام

لے کر اپنے بستر کی آرایش کر رہا ہوں۔

مرزا غالب نے زندگی کے غم و آلام کو اپنا سرمایہ فن بنالیا تھا۔ عالم رنج و الم میں

خون کے آنسو بہا کر آرایش بستر کرنا اسی نکتے کی تائید کرتا ہے۔

می چکد از لعل لبش در طلب نقل

مستی ز کو اکب بہ طبق می کنم امشب

لغت: ”نقل“ = وہ چیز جو تلخی مے کے اثرات کو دور کرنے کے لیے تھوڑی تھوڑی

شراب کے ساتھ کھائی جائے۔

”لعل لبش“ = لعل لب رو” میں لعل اضافت، اضافت تشبیہی ہے یعنی لعل جیسے لب۔

”کو اکب“ ستارے۔

محبوب کے لب لعلیں نقل کی طلب میں بے تاب ہیں اور ان سے شراب پک رہی

ہے۔ میں نے مناسب نقل مہیا کرنے کے لیے کچھ ستارے توڑ کر تھال میں رکھ لئے ہیں کچھ مے

کی مستی اور کچھ محبوب کے شراب کے سے سرخ لب، تر لبوں سے شراب کے قطرے یوں گر رہے

ہیں۔ جیسے چمکتے ہوئے ستارے ہوں۔ اسی رعایت سے شاعر نے ”ستاروں کے نقل“ کی طرف

اشارہ کیا ہے۔ یہ ایک حسین ندرت ہے۔

نازم بخش را و نیام دهنش را

خوش تفرقه در باطل و حق می کنم امشب

ہمارے شعر معشوق کے دہن تنگ کو عدم قرار دیتے ہیں۔ گویا وہ ہے ہی نہیں۔ مرزا

غالب نے اس شعر میں ایک نیا استعارہ استعمال کیا ہے۔ محبوب کے دہن تنگ کو باطل کہا ہے اور

اس کی میٹھی، پیاری پیاری، دل میں اترنے والی باتوں کو حق کا نام دیا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے اس کی

باتوں پر ناز ہے لیکن مجھے اس کے دہن کا سراغ نہیں ملتا (جہاں سے یہ باتیں ابھر رہی ہے۔)

میں نے آج رات حق و باطل میں ایک خوبصورت امتیاز قائم کیا ہے۔

اس شعر میں ایک لطیف نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ شاعر نے استعارے کے رنگ میں نہ صرف



محبوب کے دہن اور اس کی باتوں کا تذکرہ کیا ہے بلکہ باطل کی نفی اور حق کے اثبات اور عظمت کی وضاحت بھی کی ہے۔

عمری است کہ قانون طرب رفتہ ز یادم

آموختہ را باز سبق می کنم امشب

لغت: ”قانون“ = دستور، قاعدہ، (قانون ایک ساز کا نام بھی ہے)۔

”باز سبق می کنم“ = پھر یاد کر کے دہرا رہا ہوں۔

مدت ہوئی کہ میرے ذہن سے عیش و طرب کے انداز اور طور طریقے مٹ چکے ہیں۔  
آج رات میں پڑھی ہوئی (آموختہ) باتوں کو دوبارہ سبق کے طور پر یاد کر رہا ہوں۔  
یعنی عیش و طرب کے دن بھولی بسری داستان بن چکے ہیں۔ آج رات کی کیفیت اس  
بھولی ہوئی داستان کی یاد کو تازہ کر رہی ہے۔

غالب نبود شیوہ من قافیہ بندی

ظلمی است کہ بر کلک و ورق می کنم امشت

مرزا غالب نے اس غزل میں سنگلاخ قافیہ استعمال کیے ہیں۔ فارسی اور اردو کے  
بعض شعراء اس طرز کی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کو کمال فن سمجھتے تھے جس سے شعر کا فکری پہلو  
دب جاتا ہے اور شاعری محض لفاظی بن جاتی ہے۔ اسی بنا پر مرزا غالب کہتے ہیں:  
اے غالب! قافیہ بندی میرا شیوہ نہیں، آج رات (میں ایسی غزل کہہ کر) اپنے قلم  
اور کاغذ پر ظلم کر رہا ہوں۔

مرزا غالب نے اس غزل کی ساخت و پرداخت کو قافیہ بندی سے تعبیر کیا ہے اور کہا

ہے کہ اس قافیہ بندی سے وہ اپنے قلم اور کاغذ پر، دوسرے لفظوں میں خود اپنی شاعری پر ستم ڈھا  
رہا ہے۔ اس کا یہ احساس محض اظہار انکسار ہے کیونکہ باوجود سخت ”قافیہ ردیف“ کے اس کی  
یہ غزل بہت بلند ہے اور اس ن اُن بہترین غزلوں میں سے ہے۔ جن میں فکر و فن کا حسین  
استراج پایا جاتا ہے۔

مرزا غالب کے اردو دیوان میں بھی اسی نوع کی بعض غزلیں ہیں جو محض الفاظ کے  
شعبہ بازوں کو شرماتی ہیں۔ مثلاً:

رشتک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

اور

غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں

بو سے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں





## ردیف ”پ“

## غزل نمبر (۱)

سحر دمیدہ و گل در دمیدن است، تحسپ  
جہان جہان گل نظارا چیدن است، تحسپ

لغت وحل مشکلات:

”دمیدن“ = پھوٹنا، کھلنا۔

”سحر دمیدن“ = طلوع سحر۔ ”گل دمیدن“ = پھولوں کا کھلنا۔ ”گل در دمیدن است“ = یعنی پھول کھل رہے ہیں۔

”چیدن“ = سونا، تحسپ چیدن مصدر سے فعل نہیں ہے، یعنی مت سو۔

”جہان جہان“ میں لفظ ”جہان“ کا تکرار کثرت کا مفہوم پیدا کر رہا ہے۔ ”گل چیدن“ = پھول چننا۔ ”گل نظارا چیدن“ = پھولوں کا نظارہ کرنا۔ جہاں جہاں گل نظارہ چیدن سے مراد جی بھر کر پھولوں کو دیکھنا ہے۔ کہتا ہے:

صبح ہو چکی ہے اور پھول کھل رہے ہیں۔ جاگ، یہ سماں توجی بھر کو پھولوں کو دیکھنے کا ہے جن کی ایک دنیا آباد ہو چکی ہے۔ آنکھیں کھول اور دیکھ۔

مشام را بہ شمیم گلی نوازش کن

نیم غالیہ سا در وزیدن است، تحسپ

لغت: ”مشام“ = دماغ۔ ”شمیم“ = خوشبو۔

”نیم غالیہ در وزیدن است“ = معطر ہوا چل رہی ہے۔

اپنے دماغ کو کسی پھول کی خوشبو سے لطف اندوز کر لے سو کیوں رہا ہے۔ آنکھیں کھول اور دیکھ کہ معطر ہوا چل رہی ہے۔

ز خویش حسن طلب بین در صبحی کوش

می شبانہ ز لب چکیدن است، تحسپ

لغت: ”صبحی“ = وہ شراب جو صبح سویرے پی جائے۔ اس کی ضد ”سبوی“ = شام

کی شراب ہے۔ ”حسن طلب“ = کسی شے کو بڑے خوبصورت طریقے سے مانگنا۔

اپنے حسن طلب کے جذبے کے احساس کو دیکھ اور صبح کی شراب نوش کر۔ (ابھی تو) رات کی پی ہوئی شراب لیوں سے ٹپک رہی ہے۔ اٹھ، اے شبانہ کالیوں سے ٹپکتا بتا رہا ہے کہ مستی کی کیفیت ابھی باقی ہے اور اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ مے نوشی کو جاری رکھا جائے۔ یہی تقاضا گویا حسن طلب کا جذبہ ہے جس کی طرف شاعر نے بڑے شاعرانہ اسلوب بیان سے اشارہ کیا ہے۔

ستارۂ سحری مژدہ سنج دیداری است

بہین کہ چشم فلک در پریدن است تحسپ

لغت: ”پریدن چشم“ = آنکھ پھڑکنا۔ اسے ”پرواز چشم“ بھی کہتے ہیں۔ آنکھ کے



پھرنے کا سبب رنج ہے لیکن اکثر لوگ آنکھ کے پھرنے سے کسی دوست یا عزیز کے آنے یا ملنے کا شگون لیتے ہیں۔

مرزا غالب کہتے ہیں کہ صبح کا ستارہ کسی کے دیدار کی خوشخبری دے رہا ہے۔ دیکھ کہ آسمان کی آنکھ پھڑک رہی ہے۔ یہ سونے کا وقت کا نہیں۔

تو محو خواب و سحر در تاسف از انجم

بہ پشت دست بدندان گزیدن است تحسپ

لغت: ”پشت دست بدندان گزیدن“ کے لغوی معنی ہیں دانتوں سے ہاتھ کاٹنا، افسوس کرنا یا پشیمان ہونا۔

شاعر کہتا ہے کہ تو محو خواب ہے اور صبح (تجھے اس نیند کی حالت میں دیکھ کر) افسوس کر رہی ہے اور اس افسوس کے عالم میں وہ دانتوں سے اپنے ہاتھوں کو کاٹ رہی ہے۔ (شاعر نے ستاروں کو صبح کے دانتوں سے تعبیر کیا ہے)۔

نفس زنالہ بہ سنبل درودن است بخیر

ز خون دل، مژہ در لالہ چیدن است تحسپ

لغت: ”سنبل“ = ایک سچ دار اور خوشبودار پودا جس سے زلف کو تشبیہ دی جاتی ہے۔ ”درودن“ کا ثناء، فصل کاٹنا۔

مرزا غالب اس شعر میں صبح کی تازہ اور معطر فضا اور ہوا اور سرخ سرخ پھولوں کی بہار کا سماں دیکھ کر اپنے تاثرات کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

آنکھ کہ سانس فریاد کی طرح سچ و تاب کھا رہا ہے۔ یوں ہے جیسے سنبل کو کاٹ کر اسے

ڈھیر لگا رہا ہے۔ او دل کا خون ابھر کے مڑگاں سے ٹپک کر لالہ کاری کر رہا ہے۔ مت سو۔ سانس کے بہار کی فضا میں سچ و تاب کھانے کو سنبل سے اور دل کے جوش کو لالہ کاری سے تشبیہ دینا عجیب محاکاتی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔

نشاط گوش پر آواز قلقل است، بیا

پیالہ چشم براہ کشیدن است تحسپ

لغت: ”گوش پر آواز قلقل است“ = یعنی صراحی کی قلقل کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہے۔ ”چشم براہ بودن“ = بے تابی سے انتظار کرنا۔

پیالہ کشیدن“ = شراب پیناے کشی۔

بہار صبح دعوت نشاط دے رہی ہے جسے شاعر نے بڑے خوبصورت انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

آ کہ خوشی قلقل کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہے اور پیالہ سر تا پا اس انتظار میں ہے کہ کوئی اسے اٹھالے اور یہ سونے کا موقع نہیں ہے۔

نشان زندگی دل دویدن است، ماییت

جلائی آئینہ چشم دیدن است تحسپ

لغت: ”دویدن“ = لغوی معنی دوڑنا، یہاں اس سے مقصود حرکت اور تڑپ ہے۔ ”جلائے آئینہ“ = آئینے کی چمک اور آب و تاب۔

یو کیوں ٹھہر گیا ہے؟ زندہ دلی کی نشانی تو یہ ہے کہ دل لگا تار متحرک رہے انسانی آنکھ اس آئینے کی طرح ہے جس کی آب و تاب دیکھنے ہی سے ہوتی ہے۔ تو نے کس لیے آنکھیں بند کر لی



ہیں۔ بقول وارث شاہ۔

رب اکھیاں دتیاں ویکھنوں

ز دیدہ سود حریفان کشودن است، مہند

ز دل مراد عزیزان تپیدن است تحسب

لغت: ”حریف کا لفظ“ متضاد المعنی ہے۔ حریف ہم پیشہ لوگوں کو کہتے ہیں ایک ہی پیشے کے لوگوں میں دوستی بھی ہوتی ہے اور رقابت بھی، اس لیے یہ لفظ دونوں معنی دیتا ہے۔ اس شعر میں دوستی کا مفہوم دے رہا ہے۔ دوستوں کے لیے آنکھ کا فائدہ اسی میں ہے کہ کھلی رہے، اسے بند نہ کر۔ دل سے عزیزوں کا مقصد ترہنا ہے، جاگ۔

بہ ذکرِ مرگ شمی زندہ داشتن ذوقی است

گرت فسانہ غالب شنیدن است، تحسب

لغت: ”شب زندہ داشتن“ = رات بیدار رہ کر گزارنا۔

موت کا تذکرہ کرتے ہوئے رات جاگ کر گزارنے میں بھی ایک لذت ہوتی

ہے۔ اگر تو فسانہ غالب سننا چاہتا ہے تو مت سو۔ گویا غالب کی زندگی کا فسانہ سراسر موت ہی کا تذکرہ ہے۔



## ردیف ”ت“

### غزل نمبر (۱)

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمدؐ است

آری کلام حق بہ زبان محمدؐ است

لغت: ”حق“ = سچائی اور خدا دونوں کا مفہوم دیتا ہے چنانچہ ”کلام حق“ سے مراد کلام الہی یعنی قرآن پاک بھی ہے اور سچ بات بھی۔

یہ غزل نعتیہ ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں:

محمد ﷺ کے انداز بیان سے حق نکلتا ہے۔ کیوں نہ ہو، ان کی زبان پر کلام حق ہے۔

آئینہ دار پر تو مہر است ماہتاب

شان حق آشکار، شان محمدؐ است

ماہتاب کی روشنی میں سورج ہی کی چمک کا عکس ہوتا ہے۔ چنانچہ شان محمدؐ سے شان حق آشکار ہوتی ہے۔

تیر قضا ہر آئینہ در تر کش حق است

اما کشادہ آن ز کمان محمدؐ است



لغت: ”تیر قضا“ = میں تیر کی اضافت، اضافت استعارہ ہے جیسے ”مرغ دل“ میں مرغ کی اضافت۔ چنانچہ تیر قضا سے مراد قضا ہی ہے جو تیر کا کام کرتی ہے۔  
 ”ترکش“ = تیر دان۔ وہ تھیلا یا خول جس میں تیر رے ہیں۔  
 ”کشاد“ = کھلنا۔ یہاں کشاد تیر مراد ہے۔ یعنی تیر کا چلنا۔  
 اس میں شک نہیں کہ تیر قضا ترکش حق ہی میں ہوتا ہے۔ (یعنی قضا رضا سے حق ہی کا دوسرا نام ہے) لیکن یہ تیر قضا کمان محمدؐ سے چلتا ہے، گویا رے حق رضا سے محمدؐ ہے۔

دانی اگر بہ معنی لولاک وا ری

خود ہر چہ از حق است، ازان محمدؐ است

لغت: ”لولاک“ اس کے لفظی معنی ہے ”اگر تو نہ ہوتا

”لولاک“ مخفف ہے ”لولاک لما خلقت الافلاک“ یعنی اگر تو نہ ہوتا تو میں اس افلاک (مراد، اس کائنات) کو پیدا نہ کرتا۔ اور یہ عبارت حدیث قدسی ہے۔ حدیث قدسی سے مراد وہ وحی ہوتی ہے جو آنحضرت ﷺ پر خواب میں نازل ہوئی ہو۔  
 اگر تو معنی لولاک تک رسائی حاصل کر لے تو تجھے معلوم ہو جائے کہ حق تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے وہ محمدؐ ہی کا ہے۔

ہر کس قسم بدانچہ عزیر است می خورد

سوگند کر دگار بجان محمدؐ است

لغت: ”سوگند“ = قسم۔

ہر شخص اس چیز کی قسم کھاتا ہے جو اسے عزیز ہو۔ اللہ تعالیٰ جان محمدؐ کی قسم کھاتا ہے۔

واعظ حدیث سایہ طوبیٰ فرو گذار

کاینچا سخن ز سرو روان محمدؐ است

لغت: ”طوبیٰ“ کے لغوی معنی پاکیزہ ہیں۔ اصطلاحاً جنت کا ایک درخت ہے۔  
 ”حدیث“ بات ذکر، اے واعظ سایہ طوبیٰ کا ذکر چھوڑ دے۔ یہاں تو محمدؐ کے سرو رواں (حضور کے قد) کی بات ہو رہی ہے۔  
 نبی اکرم ﷺ کے قد مبارک کے آگے طوبیٰ ایک بے حقیقت شے ہے۔

بگر دو نیمہ گشتن ماہ تمام را

کان نیمہ جنبشی ز بنان محمدؐ است

لغت: ”بنان“ = انگلیاں۔

دو نیمہ گشتن ماہ تمام = چاند کے دو ٹکڑے ہونے یعنی شق القمر کی طرف اشارہ ہے۔  
 ماہ کامل کے دو نیم ہونے کو دیکھ کہ وہ محمدؐ کی انگلی کی نیم جنبش کی وجہ سے ہے۔  
 رسول پاکؐ کی انگشت مبارک کی نیم جنبش سے چاند کے دو نیم ہونے کو کس شاعرانہ لطافت سے بیان کیا ہے۔

در خود ز نفس مہر نبوت سخن رود

آن نیز نامور ز نشان محمدؐ است

لغت: ”مہر نبوت“ = آنحضرت ﷺ کے جسم مبارک پر ایک قدرتی نشان تھا جسے مہر نبوت کہا جاتا ہے اور اسے نبوت کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:  
 اگر مہر نبوت کی حقیقت کے بارے میں بھی بات کی جائے تو یہ یاد رہنا چاہیے کہ مہر



نبوت محمدؐ کی ذات گرامی سے سرفراز ہوئی ہے۔

غالب ثنائی خواجہ بہ یزدان گزاشتیم

کان ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

لغت: ”خواجہ“= سرور کائنات۔

اے غالب! ہم نے سرور کائنات کی مدح و ثناء، بزرگ و برتر ہی پر چھوڑ دی ہے کیوں کہ اسی کی ذات پاک محمدؐ کی مرتبہ شناس ہے۔



## غزل نمبر (۲)

گلشن بہ وفضای چمن سینہ ما نیست

ہر دل کہ نہ زخمی خورد از تیغ تو وانیست

گلشن ہمارے سینے کی فضاے چمن جیسا نہیں ہے۔ جو دل تیری تیغ محبت کا زخمی نہ ہو وہ کبھی نہیں کھلتا۔

عاشق کا سینہ محبت کے زخموں سے چمن زار بنا ہوا ہے۔ اس کا مقابلہ معمولی باغ کیا کر سکتا ہے جہاں صرف بہار اپنا جو بن دکھاتا ہے اور پھول کھلاتی ہے۔ دل ان پھولوں سے شگفتہ نہیں ہو سکتا۔ دل تو وہی شگفتہ ہوگا جس پر تیغ محبت نے زخم کاری کی ہو۔

می سوزم و می ترسم از آسیب ز دانش

آوخ کہ در آتش اثر آب بقا نیست

لغت: ”آب بقا“= آب حیات۔ ”آوخ“= افسوس۔

میں آگ میں جلتا ہوں لیکن ساتھ ہی اس کی گزند سے ڈرتا بھی ہوں اور یہ ڈر میری عقل کا نتیجہ ہے۔ افسوس کہ آگ میں آب بقا کا اثر نہیں۔

آتش عشق سے ہر اسماں ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عقل و حکمت مانع آتی ہے۔ کاش آگ میں ہمیشہ کی زندگی عطا کرنے کی صلاحیت ہوتی اور میں اسی میں جلتا رہتا۔

عمری است کہ می میرم و مردن نتوانم

در کشور بیدار تو فرمان قضا نیست

ایک عمر گزر گئی کہ میں مرتا ہوں (یعنی مرنے کی سعی کرتا ہوں) لیکن مر نہیں سکتا۔ تیری سلطنت جو رستم میں قضا کا حکم نہیں چلتا۔

محبت میں عاشق کی زندگی کا ہر مرحلہ گویا جان سے گزر جانا ہے۔ لیکن اس عالم جاں کنی میں موت نہیں آتی۔

هفت اختر و نه چرخ خود آخر بچہ کار اند

بر قتل من این عربده با یار روا نیست

لغت: ”عربده“= لڑائی جھگڑا۔

سات سیارے اور نو آسمان آخر کس کام کے لیے ہیں۔ میرے قتل پر میرے دوست سے یہ جھگڑا کس لیے ہو رہا ہے۔



سیاروں اور آسمانوں کی گردش، دنیا میں تباہ کاریاں مچاتی ہی ہے۔ عاشق کا محبوب کے ہاتھوں قتل ہونا بھی اسی نوع کا ایک حادثہ ہے۔ پھر محبوب سے مواخذہ کیا۔

عمرم سپری گشت و همان بر سر جور است

گویند بتان را کہ وفا نیست چرا نیست

لغت: "سپری گشت" = ختم ہو گئی۔

"وفا" = کسی ایک روش پر قائم رہنا۔

عمر ختم ہو گئی اور وہ بدستور جور و ستم پر قائم ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ معشوقوں میں وفا نہیں ہوتی، کیوں نہیں ہوتی (ہوتی ہے) معشوق محبت میں ثابت قدم نہیں تو نہ سہی، جور و ستم میں تو ثابت قدم ہے۔ عاشق کے نزدیک یہی وفا ہے۔

مرزا صاحب کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو

کاشکے کے تم مرے لیے ہوتے

جنت نکند چارۂ افسردگی دل

تعمیر بہ اندازۂ ویرانی ما نیست

جنت ہماری افسردگی دل کو دور نہیں کر سکتی۔ یہ تعمیر یعنی جنت ہماری ویرانی کے مطابق

نہیں ہے۔

کسی ویران جگہ کو آباد کرنے کے لیے، جگہ کی ویرانی کے اندازے کے مطابق، تعمیر درکار ہوتی ہے۔ مان لیا کہ جنت ہر طرح کی آسائشیں اور راحتیں مہیا کرتی ہے لیکن ہماری ویرانیاں

اور افسردگیاں اس حد تک پہنچی ہوئی ہیں کہ جنت بھی ان کا مداوا نہیں کر سکتی۔

با خصم زبون غیر ترحم چہ توان کرد

من ضامن تاثیر اگر ناله رسا نیست

لغت: "خصم زبون" = ایک حقیر دشمن، مقصود رقیب۔

ایک حقیر دشمن کے ساتھ سوائے رحم کی دعا کرنے کے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ اگر نالہ رسا نہیں تو میں اس کی تاثیر کی ضمانت دیتا ہوں۔

مان لیا کہ عاشق کی فریاد بے اثر ہوتی ہے لیکن رقیب جیسے زبوں حال دشمن کے حق میں بے اثر نہیں ہو سکتی۔

فریاد ز زخمی کہ نمک سود نباشد

ہنگامہ بنفزای کہ پرشش بسرا نیست

لغت: "زخم نمک سود" = وہ زخم جس پر نمک چھڑکا گیا ہو۔

زخم پر نمک چھڑکنے سے زخم کے درد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

"پرشش" = پرشش حال، عیادت۔

"بسرا" = مناسب حال۔

"ہنگامہ" = عاشق پر جور و ستم کرنا، طرح طرح کے چر کے لگانا۔ محبوب کی تمام ستم ظریفیوں کے لیے شاعر نے ہنگامے کا لفظ استعمال کیا ہے۔

شاعر معشوق سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اس زخم کی حالت قابل رحم ہے جس پر نمک نہ چھڑکا گیا ہو۔ ان ستم رانیوں میں اضافہ کیونکہ میری پرشش حال کرنا میرے حال کے



مطابق نہیں ہے۔

عاشق، معشوق کے جوہر و ستم کو بھی، پرسش حال ہی تصور کرتا ہے کیونکہ اس میں بھی التفات کا ایک پہلو ہوتا ہے، لیکن یہی کافی نہیں، زخم لگانے کے بعد نمک چھڑکنا بھی ضروری ہے۔ اس سے درد بڑھ جائے گا اور لذت درد میں اضافہ ہوگا۔ اسی کو عاشق مناسب پرسش حال سے تعبیر کرتا ہے۔

گر مھر و گر کین ہمہ از دوست قبول است

اندیشہ جز آئینہ تصویر نما نیست

لغت: ”اندیشہ“= خیال، تصور۔

”آئینہ تصویر نما“= آئینہ جس میں عکس ہو، بھرا بھرا آئے۔

”مہر و کین“= محبت اور دشمنی، یہاں مراد نرمی و سختی ہے۔

دوست کی طرف سے محبت میسر آئے یا جور و جفا، سبھی کچھ غنیمت ہے۔ ہمارا وجود تو ایک آئینے کی طرح ہے جس میں دوست کا عکس نظر آ جاتا ہے، خواہ وہ کسی رنگ میں ہو۔ زندگی کی شیرینیوں اور تلخیاں سبھی اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہیں۔ ان میں تفریق کرنا غلط ہے۔ یہ اس کی ذات کے مختلف انداز ہے۔

مینای می از تنہی این می بگدازد

پیغام غمت در خور تحویل صبا نیست

شاعر نے اس شعر میں پیغام غم یا پیغام محبت کو (جو لبریز غم ہے) تند و تیز شراب سے تعبیر کیا ہے اور صبا کو مینا سے تعبیر کیا ہے۔ غم محبت کی تندہی اور تیزی سے شیشہ سے بھی

گداز ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا پیغام ہے جسے صبا کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ پیغام تو ایک دل سے دوسرے دل تک براہ راست پہنچتا ہے۔ اور اسے عاشق کا دل ہی گوارا کر سکتا ہے۔

ہر مرحلہ از دھر سراب است لبی را

کز نقش کف پای کسی بوسہ ربا نیست

”سراب“= چمکتی ہوئی ریت جو دور سے پانی معلوم ہوتی ہے۔ دھوکا، چھلاوہ۔ اس دنیا کا ہر قدم (ہر ٹکڑا) ایسے لب کے لیے ایک سراب کی حیثیت رکھتا ہے جس نے کسی کے نقش کف پا کو بوسہ نہ دیا ہو۔

عاشق کی نظر میں یہ سر زمین اسی وقت دل آویز ہوتی ہے جب اس پر کسی حسینہ کے نقش قدم ہوں۔ عاشق ان نقوش کو چوم کر اپنے دل کی پیاس بجھاتا ہے ورنہ یہ سر زمین تو ایک مشت خاک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

از ناز دل بی ہوس ما نہ پسندید

دل تنگ شد و گفت درین خانہ ہوا نیست

لغت: ”ہوا“= ہوا کو بھی کہتے ہیں۔ اور اس کا ایک مفہوم ہوس بھی ہے، جیسے مرکب حرص و ہوا کا مطلب حرص و ہوس ہے۔

”دل تنگ“= یہ مرکب مقلوب ہے یعنی تنگدل، افسردہ، آزرده۔

اُس (محبوب) نے ناز سے ہمارے بے ہوس دل کو پسند نہ کیا۔ آزرده خاطر ہوا اور کہا کہ اس گھر میں تو ہوا ہی نہیں ہے۔

عاشق کا دل محبت سے لبریز ہے اور اس میں حرص و ہوا کا شائبہ تک نہیں لیکن معشوق کو ایسا



دل پسند نہیں وہ اسے ایسا گھر خیال کرتا ہے جس میں ہوانہ ہو۔ اس سے یکین کی طبیعت گھبراتی ہے۔ شاعر نے ”ہوا“ کا ذو معنی لفظ استعمال کیا ہے یہ صنعت لکھام ہے جب شعر میں کوئی ایسا لفظ جس کے دو معنی ہوں، ایک قریبی اور دوسرے بعیدی، اور بعیدی، معنی مراد لیے جائیں تو وہ صنعت ایہام کہلاتی ہے۔

اس شعر میں سیاق و سباق کے اعتبار سے ہوا کے قریبی معنی ہوا ہونے چاہیں لیکن یہاں ہوا بعیدی معنوں، یعنی ”ہوس“ کے لیے آیا ہے اس صنعت کے استعمال سے شاعر قارئین شعر کے ذہن میں استعجاب کی کیفیت پیدا کرتا ہے جو مزہ دیتی ہے۔

برگشتنِ مرگان تو از روی عتاب است

کندر دلم از تنگی جا یک مژہ جا نیست

لغت: ”برگشتن مرگان“ = پلوں کا پھر جانا۔ آنکھیں پھیر لینا یا بے رخی کا اظہار کرنا۔ ”تنگ دل“ = دل کی تنگی یا افسردگی۔

تیری پلوں کا پھر جانا عتاب کی وجہ سے ہے کیوں کہ (تو جانتا ہے کہ) میرے دل میں جگہ کی تنگی کے باعث ایک مژہ کی بھی گنجائش نہیں۔

عاشق کا دل اتنا افسردہ ہے کہ اس میں یاد یار یا خیال یار بھی نہیں سما سکتا۔ اس پر ایک بے دلی کی حالت طاری ہے جس کے باعث معشوق بگڑ کر اس سے آنکھیں پھیر لیتا ہے۔

”جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا۔“ (غالب)

در یوزہ راحت نتوان کرد ز مرهم

غالب همه تن خستہ یار است گدا نیست

لغت: ”در یوزہ“ = گداگری۔

”در یوزہ راحت“ = آرام اور راحت طلب کرنا۔

”خستہ“ = زخمی، خراب حال۔

مرہم طلب کر کے راحت و آرام کی در یوزہ گری نہیں کی جاسکتی۔ غالب محبوب کا سر تا پا زخمی تو ہے، گدا نہیں ہے۔



### غزل نمبر (۳)

بسکہ درین داوری بی اثر افتادہ است

اشک، تو گوئی، مرا از نظر افتادہ است

لغت: ”مرا از نظر“ میں را اضافی ہے یعنی اضافت کا کام دے رہا ہے۔ اس سے مراد ہے۔ ”از نظر من“ ”داوری“ = لغوی معنی ہیں اضافت طلبی۔ یہاں محبت کا معاملہ یا تقاضا۔ چونکہ محبت میں میرے آنسو بے اثر ہیں اس لیے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ میری نظر سے گر گئے ہیں۔ محبت میں آنسو بہانے سے معشوق کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا اس لیے عاشق کہتا ہے کہ یہ آنسو میری آنکھوں سے نہیں بلکہ نظر سے گر گئے ہیں یعنی حقیر ہیں۔

عکسِ تنش را در آب لرزہ بود ہم ز موج

بیم نگاہِ خودش کار گر افتادہ است



اُس (محبوب) کے جسم کا عکس پانی میں لہروں کے تموج سے لرز رہا ہے۔ اس کی نظروں کا عتاب کتنا کارگر واقع ہوا ہے۔

یعنی محبوب خود بھی اپنے عکس کو پانی میں دیکھ کر برہم ہو رہا ہے اور وہ عکس اس کے عتاب سے لرز رہا ہے۔ عکس کا پانی میں لرزنا لہروں کی وجہ سے ہے لیکن شاعر اسے محبوب کے عتاب سے منسوب کرتا ہے۔ اس طرح سے کسی واقعے کی اصلی علت کو چھوڑ کر اس واقعے کو کسی اور علت کا معلول قرار دینا علم بدائع میں ایک صنعت کہلاتا ہے جسے حسن تعلیل کہتے ہیں، یعنی کوئی عمدہ اور خوبصورت علت تلاش کرنا۔

نالہ نداند کہ من شعلہ زیان کردہ ام

ھر چه ز دل جسته است، در جگر افتاده است

فریاد کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ میرے سینے سے ابھرا ہوا ایک شعلہ ضائع ہو گیا کیونکہ جو آگ دل سے لپکی تھی وہ لپک کر جگر پر جا پڑی ہے۔

عاشق کی فریاد بے سود ہوتی ہے جو معشوق کے دل پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ بظاہر یہ آتش محبت کا زیاں معلوم ہوتا ہے کہ ایک شعلہ ضائع ہو گیا۔ لیکن نہیں۔ ایسی فریادیں کرنے سے دل کی گرمی کہاں کم ہوتی ہے۔ دل سے ابھرے ہوئے آتشیں نالے جگر پر اور جگر سے اٹھے ہوئے شعلے دل پر جا پڑتے ہیں اور کبھی ٹھنڈے نہیں ہوتے۔ غرض عاشق کے دل و جگر دونوں لہریز سوز عشق ہوتے ہیں اور نالاں رہتے ہیں۔

خاطر بلبل بجوی، قطرہ شبنم گوی

کز پس گویش گل نالہ تر افتاده است

بلبل کی دلداری کر۔ (یہ جو پھول پر قطرے نظر آ رہے ہیں) انھیں قطرہ شبنم نہ سمجھ کیونکہ یہ تو پھول کے کان کے پردے پر نالہ (فریاد) ٹھنڈا اور بے اثر ہو کر بڑا ہوا ہے۔

بلبل، پھول کے عشق میں فریاد سرتی ہے لیکن پھول اس سے بے نیاز ہے۔ بلبل کی آتشیں فریادیں، پھول کے کان میں اثر انداز ہونے کی بجائے نالہ و فریاد بن کر شبنم کے قطرہوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

از نگہ سرخوشت کام تنها کند

آئینہ سادہ دل، دیدہ ور افتاده است

لغت: ”نگہ سرخوشت“= شوق بھری نگاہ۔

”کام تنها کند“= اپنی تمنا پوری کر لیتا ہے۔

”دیدہ ور“= صاحب نظر۔

تو آئینہ سادہ دل کو اپنی شوق بھری نظروں سے دیکھتا ہے اور وہ تیرے جلوہ حسن سے تجھے دیکھنے کی تمنا پوری کر لیتا ہے۔ دیکھو، آئینہ کتنا صاحب نظر واقع ہوا ہے۔

معشوق بڑے ذوق و شوق سے آئینہ دیکھنے میں محو ہے اور یہ آئینے کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس کے دیدار سے فیضیاب ہو رہا ہے۔ اسے گویا آئینے کی دیدہ وری کہنی چاہیے۔

او دلی از ما گداخت وین نفست گرم ساخت

نالہ ما از نگاہ شوخ تر افتاده است

لغت: ”او کا ضمیر“ ”نگاہ“ کے لیے اور اس کا ”نالہ“ کے لیے آیا ہے۔

تیری نگہ سے ہمارا دل گداز ہو گیا اور ہماری فریاد نے تیرے سانس کو گرم مادیہ۔ ہماری



فریاد، تیری نگاہ سے شوخ تر نکلی۔

معشوق نے عاشق کو ایک نظر دیکھا تو اس کا دل جل اٹھا۔ عاشق کی فریاد نے معشوق کو برہم کر دیا یعنی فریاد نگاہ سے شوخ تر نکلی۔

خون ہوس پیشگان، خوش نبود ریختن

تغ ادا پارو بد گھر افتادہ است

لغت: ”ہوس پیشگان“ = ہوس پیشہ لوگ، اہل ہوس، اہل وفا کی ضد۔

”پارو“ = قدرے، تھوڑی سی۔ ”تغ بد گھر“ = اشارہ ہے ایسی تلواری کی طرف جو اصل نہ ہو۔

ہوس پیشہ لوگوں کا خون بہانا اچھا نہیں ہوتا لیکن معشوق کی تغ ادا اس بارے میں قدرے اصل واقع نہیں ہوئی۔

عاشق کے لیے تو معشوق کی تغ ادا کا ایک ہی وار کافی ہوتا ہے۔ اہل ہوس جان دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ انھیں مارنے کا کیا فائدہ۔ وہ اس کے شایاں نہیں مگر معشوق اپنے ناز و انداز کی تلواریں وہاں پر بھی آزماتا ہے جو غلط ہے۔ اسی اعتبار سے شاعر نے تغ ادا کو بد گھر کہا ہے جو بہت موزوں ہے۔

ریشک دھانت گذاشت غنچہ گل چون شگفت

دید کہ از روی کار پردہ افتادہ است

لغت: ”از روی کار پردہ بر افتاد“ یعنی معاملے سے پردہ اٹھ گیا۔

معشوق کے دہن جگ اور کلی میں ایک مشابہت ہوتی ہے۔ اسی لیے شاعر، دہن

معشوق کو غنچہ نا شگفت سے تشبیہ دیتے ہیں۔ بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ غنچے کو محبوب کا دہن جگ دیکھ کر ریشک آتا ہے جیسا کہ اس شعر میں ظاہر کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

غنچہ جب کھل گیا تو گویا اس نے تیرے دہن پر ریشک کرنا چھوڑ دیا اس لیے کہ اس نے دیکھا کہ معاملہ فاش ہو گیا۔

پھول کی کلی کو محبوب کے دہن جگ پر ریشک آتا تھا لیکن اس نے آخر محسوس کیا کہ وہ اس کی رعنائیوں اور خاموشیوں کے مقابل میں بیچ ہے، اس لیے وہ کھل گئی اور غنچگی کی حالت کو خیر باد کہہ دیا۔ اسی راز کا انکشاف تھا جسے شاعر بات کا فاش ہونا قرار دیتا ہے۔

دہ بہ فرو ماندگی داد فرو ماندگان

سایہ در افتادگی وقف ہر افتادہ است

لغت: ”فرو ماندگان“ = عاجز، خستہ حال لوگ۔

فرو ماندگی اُسی سے اسم مصدر ہے، یعنی فرو ماندہ ہونے کی حالت افتادہ = گرا ہوا، اور ”افتادگی“ گرے ہوئے ہونے کی حالت۔ شاعر محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے:

عاجزوں اور خستہ حالوں کی خستگی کی داد دو۔ دیکھو کہ سایہ کس طرح گرے ہوؤں کا ساتھ دیتا ہے۔

انسان جب کھڑا ہو تو اس کا سایہ زمین پر ہوتا ہے لیکن جب وہ گر پڑے تو اس کا سایہ اس سے لپٹ جاتا ہے۔ گویا سایہ گرے ہوئے انسان کا ساتھ دیتا ہے۔ شاعر اسی حالت کو بیان کر کے محبوب سے کہتا ہے کہ تجھے بھی یونہی خستہ حالوں کی دلداری کرنی چاہیے۔





## غزل نمبر (۴)

در گرد نالہ وادی دل رزمگاہ کیست

خونی کہ می دود بہ شرائیں سپاہ کیست

لغت: "شرائیں" = رگیں۔

عاشق کے دل میں جذبات محبت نے ایک ہنگامہ پیا کر رکھا ہے اور اس سے فریادیں ابھر رہی ہیں۔ دل کے اس ہنگامہ زار جذبات کو شاعر نے "رزمگاہ" (میدان جنگ) کا نام دیا ہے۔ کہتا ہے: نالہ و فریاد کے گرد و غبار میں وادی دل کس کی رزم گاہ بنا ہوا ہے۔ یہ خون جو ہمارے رگ وریشے میں دوڑ رہا ہے کس کی سپاہ ہے۔

حسن تو در حجاب ز شرم گناہ کیست

جا بر کرشمہ تنگ ز جوش نگاہ کیست

یہ غزل کا دوسرا مطلع ہے۔ اصطلاح شعر میں ایسے مطلع کو مطلع ثانی یا حسن مطلع کہتے

ہیں۔ حسن مطلع سے مراد یہ ہے کہ یہ دوسرا مطلع پہلے مطلع سے بہتر ہے۔

لغت: "جا بر کرشمہ تنگ" = ناز و ادا کے حسن کے اظہار کا دائرہ۔

تنگ ہو کر رہ گیا، یعنی محبوب ناز و ادا دکھانے سے معذور ہے۔ کس کے احساس گناہ کی ندامت سے سن پردے میں چھپ گیا ہے۔ یہ کس کی شوخ نگاہی سے حسن اپنے (ناز و ادا کے) جلوے نہیں دکھا سکتا۔ عاشق کا محبوب کو شوخ شوخ نظروں سے دیکھنا ایک طرح کی شان حسن میں گستاخی ہے۔ معشوق نہیں چاہتا کہ عاشق یہ گناہ کرے چنانچہ اس نے اپنے آپ کو چھپا لیا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ حسن کے لیے جلوہ فرمایوں کا موقع نہیں رہا۔ شاعر نے اس کی وجہ عاشق کا جوش نگاہ کہا ہے۔

مست است و رخ کشادہ بہ گلزار می رود

خون در دل بہار ز تاثیر آہ کیست

محبوب، مستانہ وار، نقاب اٹھائے، باغ کی طرف جا رہا ہے اور اس کے ان بے باک جلووں سے رشک کے باعث، بہار کا دل گویا خون میں غرق ہے۔ یہ کس کی آہوں کے اثر کا نتیجہ ہے؟

یعنی وہ کون ہے جس کی آہیں محبوب کو بے نقاب باہر کھینچ لائی ہیں کہ اس کے بے حجاب جلوے، بہار پر ستم ڈھا رہے ہیں۔

ما با تو آشنا و تو بی گانہ ز ما

آخر تو و خدا کہ جھانی گواہ کیست

لغت: "تو و خدا" = تجھے خدا کی قسم

ہم تیرے آشنا ہیں، اور تو ہم سے بیگانہ ہے۔ تجھے خدا کی قسم، آخر تو ہی بتا کہ دنیا کیا کہتی ہے۔

یعنی وہ ہماری آشنائی اور وفاداری کو دیکھتی ہے یا تمہاری بے التفاتی اور بے وفائی کو۔

مو بر فتابد این ہمہ پیچ و خم و شکن

زلف تو روز نامہ بخت سیاہ کیست

محبوب کی زلفیں پر پیچ ہیں اتنی ہی پیچ کہ اس سے زیادہ بالوں میں پیچ و خم کا تصور



ہی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ بال تو اتنے پیچ و خم اور شکن برداشت نہیں کر سکتے۔ بتا کے یہ تیری زلفیں کس کے بخت سیاہ کا روز نامچہ ہے۔

گویا معشوق کی سیر اور پیچ و خم کھائی ہوئی زلفیں، عاشق کی سیاہ بختی اور الجھے ہوئے نصیب کی تصویر ہیں۔

زینسان کہ سر بر گل و ریحان و سنبل است

طرف چمن نمونہ طرف کلاہ کیست

گوشہ چمن میں جو اس طرح، گل ریحان و سنبل کی کثرت ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کی طرح دار کلاہ کا نمونہ ہے۔

یعنی چمن معشوق کی کلاہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں گل کی رنگت، ریحان کی سی خوشبو، اور سنبل کے سے پیچ و خم اور شکن ہیں۔

رشک آیدم بہ روشنی دیدہ ہائی خلق

دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست

مجھے لوگوں کی روشنی چشم (آنکھوں کی چمک) پر رشک آتا ہے میں جانتا ہوں کہ کس کی راہ کے گرد و غبار کا اثر ہے۔

یعنی معشوق کی راہ سے جو غبار اٹھتا ہے وہ لوگوں کی آنکھوں کو چمکائی بخشتا ہے اور عاشق کو اس بات سے رشک آتا ہے

با من بخواب ناز و من از رشک بد گمان

تا عرصہ خیال عدو جلوہ گاہ کیست

وہ میرے ساتھ ناز سے سویا ہوا ہے لیکن میری حالت دیکھیے کے مجھے یہ بدگمانی رہی ہے کہ دشمن (رقیب) کے خیال اور تصور میں کس کی جلوہ گاہ سائی ہوئی ہے۔

باوجود اس کے کہ عاشق محبوب کے وصل سے فیض یاب ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ رقیب کے ذہن میں اس کا خیال بھی آئے اور وہ اس کے تصور سے لذت اندوز ہو۔

بی خود بہ وقت ذبح تپیدن، گناہ من

دانستہ دشمنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

لغت: ”دشمنہ“ = خنجر، چھری۔

قتل کے وقت بخود دی اور سرشاری کے عالم میں تڑپنا تو خیر میرا گناہ ہے لیکن یہ تو بتا کہ جان بوجھ کر چھری کو تیز نہ کرنا کس کی خطا ہے۔

غالب حساب زندگی از سر گرفته است

جانا! بمن بگو کہ غمت عمر کاہ کیست

لغت: ”عمر کاہ“ = عمر کو کم کر دینے والا۔

غالب نے تو حساب زندگی کو از سر نو شروع کر دیا، اے محبوب! بتا کہ تیرا غم کس کی عمر کو گھٹاتا ہے؟

ایک وہ ہیں کہ محبوب کے غم محبت میں ان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ مصیبت سے نجات حاصل کر لیتے ہیں لیکن غالب ہے کہ غم جدائی میں نہ جانے کتنی زندگیاں گزار چکا ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے تو دوسری شروع کر دیتا ہے، گویا سخت جان بھی ہے کہ نہیں مرتا اور جدائی کے صدموں سے جو موت سے کم نہیں عہدہ برآ بھی نہیں ہوتا اور لذت اندوز ہوتا چلا جاتا ہے۔ غالب کے اس شعر کو دیکھیے۔



کہوں تجھ سے میں کہ کیا ہے، شب غم بری بلا ہے

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اور پھر اس کے اس شعر پر نظر ڈالیے:

کارفرمائی شوق تو قیامت آورد

مردم و باز بہ ایجاد دل و جاں رفتم

ان تینوں شعروں میں ایک ہی جذبہ اور تجربہ کار فرما ہے۔



## غزل نمبر (۵)

در تابم از خیال کہ دل جلوہ گاہ کیست

داغم ز انتظار کہ چشمش براہ کیست

میں اپنے اس تصور سے بیچ و تاب کھا رہا ہوں کہ اس کا دل کس کی جلوہ گاہ ہے اور اس کے انتظار کی حالت کو دیکھ کر (رشتک سے) جل رہا ہوں کہ اس کی آنکھیں کس کی راہ دیکھ رہی ہیں۔

اس پوری غزل میں مرزا غالب نے اپنے محبوب کے کسی اور پرفریتہ ہو جانے کی حالت بیان کی ہے اور اس بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں کہتا ہے کہ مجھے یہ تصور مارے ڈالتا ہے کہ وہ کونسی ہستی ہے جس کا خیال میرے محبوب کے دل میں سایا ہوا

ہے اور وہ اس کے انتظار میں محو ہے۔

از نالہ خیزی دل سختش در آتشم

این سنگ پر شرر ز جھوم نگاہ کیست

میں اس کے دل سخت سے نالہ و فریاد ابھرتے دیکھ کر، رشتک سے جل رہا ہوں۔ سو چتا ہوں کہ کس کی نگاہوں کے جھوم سے اس کے پتھر جیسے دل سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔

چشمش پر آب از تف مھر پر یوشی است

من در گمان کہ از اثر دود آہ کیست

لغت: ”تف مہر“ = محبت کی گرمی

اس کی آنکھیں پر نم ہیں اور یہ کسی پر یوش (حسینہ) کی محبت کی گرمی کا اثر ہے لیکن میں اس گمان میں مبتلا ہوں کہ یہ کس کی آنکھوں کے دھوکے کا اثر ہے۔ عاشق کو رشتک آ رہا ہے کہ کہیں محبوب کے دل پر رقیب کی آنکھوں کا اثر نہ ہوا ہو۔

ظالم تو و شکایت عشق اسچہ ماجر است

باری بمن بگو کہ دلت داد خواہ کیست

اے ظالم! تو اور عشق کے ہاتھوں شکایت کرے، یہ کیا ماجرا ہے؟ قربان جاؤں مجھے یہ تو بتا کہ تیرا دل کس سے محبت کے دکھوں کی داد خواہی کر رہا ہے۔

در خود غم است جلوہ برق عتاب تو

این تیرگی بہ طالع مشت گیاه کیست



تیرے غیظ و غضب کی برق پاشیوں کے جلوے، اپنے ہی میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ سیاحی اور تاریکی کس کے ”مشت گیاہ“ (مٹھی بھرتیئے) کی سیاہ بختی کا عکس ہیں۔

محبوب کے عتاب میں بھی حسن کا جلال ہوتا تھا۔ اب کسی پر عاشق ہو جانے سے وہ جلال دب گیا ہے۔ گویا برق عتاب ماند پڑ گئی ہے اور اس سے شعلے نکلنے کی بجائے اب سیاہ دھواں اٹھ رہا ہے جسے شاعر نے مٹھی بھرتیوں کے جلنے سے تعبیر کیا ہے۔

نیرنگ عشق شوکت رعنائی تو برد

در طالع تو گردش چشم سیاہ کیست

لغت: ”گردش چشم“ = آنکھوں کا پھرنا

عشق کی عجب کاری دیکھو کہ اس نے تیرے حسن کی شان و شوکت چھین لی ہے۔ یہ کس محبوب کی چشم سیاہ کی گردش، تیرے نصیب کی گردش بن گئی۔

محبوب کے عشق میں مبتلا ہو جانے سے اس کے حسن کا رنگ روپ ماند پڑ گیا ہے۔ اب وہ اپنے معشوق کی آنکھوں کے اشاروں پر چلتا ہے، اس کی آنکھوں کا پھرنا گویا نصیب کا پھر جانا ہے۔

گوید ز عجز چوں تو خدا ناشناس، حیف

با چون خودی کہ داور گیتی گواہ کیست

کس قدر افسوس ہے کہ اب تجھ جیسا خدا ناشناس بھی ایک اپنے جیسے سے یہ کہہ رہا ہے کہ اس دنیا کا انصاف کرنے والا، (خالق کائنات) بھی کوئی ہے۔

”داور گیتی گواہ کیست“ فارسی محاوراتی اسلوب بیان ہے جس کا مفہوم ہے کہ اللہ

تعالیٰ جو انصاف کرنے والا ہے، سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ مرزا غالب نے اپنے محبوب کو جو رستم کے اعتبار سے خدا ناشناس کہا ہے کیونکہ وہ خدا سے نہیں ڈرتا۔ اب وہ خود کسی کے عشق میں مبتلا ہو کر اور اس کے، نور و ستم دیکھ کر اسے خدا کے واسطے دے رہا ہے۔

با اسنہ شکست، درستی ادای اوست

رنگ رخت نمونہ طرف کلاہ کیست

لغت: ”لغوی طور پر شکست، درستی کی ضد ہے۔ محاورہ شکست کا مفہوم مختلف ہے۔ شکست رنگ، رنگ کے اڑنے کو کہتے ہیں شکست کلاہ سے مراد، وہ ٹکٹن ہے جو کلاہ کے نیچے حار کھنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس انداز شکست میں ایک دلکشی ہوتی ہے۔

شاعر کہتا ہے، تیرے چہرے کا رنگ اتنا اڑ گیا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ایک رعنائی (درستی) کی ادائی پائی جاتی ہے۔ تیرے شکست رنگ میں کسی کی شکست کلاہ کا انداز ہے، یعنی کس حسین کے حسن نے تجھے گرویدہ کر لیا ہے۔

مرزا غالب کے تصورات حسن میں ایک تصور یہ بھی ہے کہ حسن کسی حالت میں بھی ہو، حسین و دل کش ہوتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے:

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا

رنگ کھلتا جائے ہے، جوں جوں کہ اڑتا جائے ہے

باتو بہ پند حرف بہ تلخی گناہ من

با من بعشق، غلبہ بدعوئی گناہ کیست

یہ ”درست کہ میں تجھے نصیحت کرتے اور سمجھاتے کبھی تلخ بات بھی کرتا ہوں، یہ میرا



تصور ہے۔ لیکن عشق کے معاملے میں میرے ساتھ، اپنے عاشق ہونے کے دعوے میں اتنے جذبات کے غلبے کا اظہار کرنا، کس کا گناہ ہے؟

غالب! کنون کہ قبلہ او کوی دلبر است

کی می رسد بدین کہ درش سجدہ گاہ کیست

اے غالب اب جب کہ کوئے دلبر اس کا (یعنی محبوب کا) قبلہ بن چکا ہے، اس بات کا کیا تذکرہ کرنا کہ اس کا اپنا دروازہ کس کی سجدہ گاہ ہے؟

میرا محبوب تو اپنے در معشوق پر جہہ سائی کر رہا ہے اور اس نے اسے اپنا قبلہ بنا لیا ہے۔ اب اسے اس بات کی کیا پرواہ ہے کہ اس کے دروازے پر کون سر جھکا رہا ہے، یعنی وہ اپنے عشق کے جذبات میں کھو گیا ہے، اب وہ عاشق کے جذبات کو کب خاطر میں لاسکتا ہے۔



### غزل نمبر (۶)

یاو از عدو نیارم وین ہم ز دور بنی است

کاندہر دلم گذشتن با دوست ہم نشینی است

مولانا حالی نے اس شعر کی شرح بڑی وضاحت سے کی ہے۔ فرماتے ہیں:

میں جو رقیب کا خیال دل میں نہیں لاتا، یہ دور بینی کی بات ہے کہ کیونکہ میرے دل

میں ہر وقت دوست رہتا ہے کہ رقیب کا خیال دل میں آئے گا تو گویا رقیب دوست کے ساتھ ہم نشیں ہو جائے گا۔

در عالم خرابی از خیل معنایم

سلیم برخت شوئی، برقم بخوشہ چینی است

جہاں تک بربادی اور تباہی کی دنیا کا تعلق ہے، میں اس دنیا کے بڑے بڑے امرا میں سے ہوں۔ میرا سیلاب، ساز و سامان کو بہا کر لے جانے میں مصروف رہتا ہے اور میری برق، خرمن کو اچک کر لے جانے میں۔

یعنی مجھ سے زیادہ برباد حال کوئی نہ ہوگا، بیل عشق، برق عشق دونوں میرے ساز و سامان حیات کے درپے ہیں۔

میرم، ولی بترسم کز فرط بدگمانی

داند کہ جان سپردن از عافیت گزینی است

میں جان تو دیتا ہوں لیکن جان دیتے ڈرتا ہوں کہ اس میں اتنی بدگمانی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جان دینا تو عافیت کوشی کی علامت ہے۔

در بادہ دیر مستم، آری ز سخت جانی است

در غمزه زود رنجی آری ز ناز مینی است

میں شراب پیتا ہوں تو بڑی دیر میں مست ہوتا ہوں، ہاں یہ میری سخت جانی کی علامت ہے۔ تو ناز و ادا دکھانے میں جلد بگڑ جاتا ہے، ہاں یہ بات تیرے ناز مین ہونے کے



باعث ہے، یعنی تیرے یہ تیور بھی ناز و اداسی ہیں۔

من سوی او بہ بنم، داند ز بی حیائی است

اوسوی من نہ بیند، دامن ز شرمگینی است

میں اُس کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ اسے گستاخی اور بے حیائی خیال کرتا ہے۔ وہ میری طرف نہیں دیکھتا، میں سمجھتا ہوں یہ اس کی شرم و حیا کی وجہ سے ہے۔

ذوقی است در ادایت، قاصد تو و خدایت

در جیب من بیفشان خلدی کہ آستینی است

اے قاصد! پیغام محبوب کے سلسلے میں، تیرا انداز ایک خاص ذوق رکھتا ہے، خدا کے واسطے جو جنت تیرے آستین میں پنہاں ہے وہ (جلدی سے) میری جیب میں ڈال دے۔

قاصد محبوب کی طرف سے پیغام لے کر آیا ہے اور اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ پیغام خوش آئند پیغام ہے۔ شاعر اسے غلد کہہ کر پکارتا ہے جسے قاصد نے آستین میں چھپا رکھا ہے۔

زین خو نچکان نواھا در یاب ماجراھا

هنگامه ام اسیری، اندیشه ام حزینی است

میری ان خو نچکان فریادوں سے اندازہ کر لے کہ مجھ پہ کیا کیا حالتیں گزرتی ہوں گی۔ میری زندگی کے ولو لے کیا ہیں اسیری اور افکار کیا ہیں۔ غم و اندادہ۔

درد شکست دل را، رام صدا نخواهم

ساز شکایت من تارش ز موی چینی است

لغت: ”موئے چینی“ = اے موئے پیالہ یا موئے کاسہ بھی کہتے ہیں۔ اردو میں موئے کی جگہ بال بھی بولتے ہیں۔ وہ ہلکی سی دراڑ جو پیالے میں آ جاتی ہے، دیکھنے میں بال کی شکل کی ہوئی ہے۔ وہی موئے چینی ہے۔

ایسے پیالے کو کھڑکانے سے آواز نہیں آتی۔

ذوق کہتا ہے:

ہے بے صدا وہ چینی جس میں کہ بال آیا

”میں نہیں چاہتا کہ میرے دل کا نوٹنا آواز کا پابند ہو (یعنی اس سے کوئی آواز نکلے)

میرے ساز شکایت کے تار موئے چینی کے ہیں۔

عاشق کا دل ٹوٹ چکا ہے لیکن وہ خاموش ہے اور شکایت لب پہ نہیں لاتا۔

سوزم دمی کہ یارم یاو آورد کہ غالب

در خاطرش گذشتن با غیر ہمنشینی است

اس مقطع میں مرزا غالب نے ایک ہی نوعیت کے احساس کو بیان کیا ہے لیکن نئے انداز کے ساتھ۔

”غالب جب بھی مجھے میرا محبوب یاد کرتا ہے تو میں جلتا ہوں کیونکہ اس کے دل میں کسی کا خیال آتا (رقیب کا ہم نشین ہونا ہے۔

معشوق کے دل میں رقیب کا خیال سمایا رہتا ہے، اس لیے جب عاشق کا خیال اس کے دل میں آئے گا تو وہ گویا رقیب کا ہم نشین ہوگا اور عاشق یہ بات گوارا نہیں کر سکتا۔





## غزل نمبر (۷)

لب شیرین تو جانِ نمک است  
وین کہ گفتم بہ زبانِ نمک است

شیرینی اور نمکینی دونوں خوشگوار ذائقے کی چیزیں ہیں۔ دونوں کا مزہ الگ الگ ہے۔ معشوق کے لبوں کو عموماً شیریں کہا جاتا ہے لیکن شاعر کہتا ہے: ”تیرے شیریں لب نمک کی جان ہیں اور پھر کہتا ہے کہ یہ بات بھی جو میں کہہ رہا ہوں نمک ہی کی زبان سے کہہ رہا ہوں۔ یعنی معشوق کے لبوں کی شیرینی میں نمکینی کی آمیزش ہے اور وہ اس قدر نمکین ہیں کہ خود نمک انھیں جانِ نمک کہہ کر پکارتا ہے۔

در فسادِ نمک از رشکِ لب  
ہست شوری کہ فغانِ نمک است

لغت: ”شور“ نمک اور فریاد دونوں کا مفہوم دیتا ہے۔ یہاں رعایت لفظی کے طور پر آیا ہے۔ شور کا مفہوم نمک ہی ہے۔ لیکن فغان کی رعایت سے لایا گیا ہے جس سے شعر میں صنعت ایہام پیدا ہو گئی ہے۔ نمک کی طینت میں، تیرے لبوں کے رشک سے وہ نمکینی کا اندازہ آ گیا ہے کہ اسے فغانِ نمک کہنا چاہیے۔

ای شدہ لطف و عتابِ ہمہ ناز  
ناز در عہد تو کانِ نمک است

تیرا لطف ہو کہ عتاب سرتا پا ناز ہے۔ ناز تو ترے عہد حسن میں کانِ نمک بن گیا ہے۔ جس طرح کان کی طینت اور تعمیر ہی نمک سے ہوتی ہے اور نمک کبھی ختم نہیں ہوتا اسی طرح معشوق کا ہر تیرا ناز ہے اور نہ ختم ہونے والا ناز ہے۔

ناز سر مایہ دیگر ز تو یافت  
نمک خوان تو خوانِ نمک است

تیری بدولت تیرے ناز و انداز کو ایک نئی شان ملی ہے۔ گویا خوان میں جو نمک ہے وہ بذاتِ خود خوانِ نمک بن گیا ہے۔

شورِھا صرف فغانم کردند  
نمک از حسرتیانِ نمک است

میری فریاد میں اتنی نمک (شور) کی آمیزش ہے کہ نمک کو خود نمک ہونے کی حسرت ہے۔

زخمِ ما پنبہ مرہم دارد  
زیں سفیدی کہ نشانِ نمک است

زخموں پر مرہم لگانے کے لیے روئی کا (پنبہ) استعمال کیا جاتا ہے جو سفید رنگ کا ہوتا ہے اور وہی رنگ نمک کا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے کہتا ہے۔

”ہمارے زخم پر پنبہ مرہم ہے۔ اس لیے کہ یہ سفید ہے اور سفیدی نشانِ نمک ہے۔ کہنا یہ ہے کہ عاشق کے زخم پر محبت کا مرہم نمک ہے۔ گو نمک زخم میں تلخی پیدا کرتا ہے لیکن عاشق اس تلخی کو مددِ اداے درد خیال کرتا ہے کیونکہ درد کی شدت میں اسے راحت ملتی ہے۔



گر نمک سود کنی زخمِ دلم

سود زخمِ است و زیانِ نمکِ است

لغت: ”نمک سود“ = زخم کو نمک سود کرنے کا مفہوم ہے زخم پر نمک چھڑکنا  
”سود“ = فائدہ

کہتا ہے کہ اگر تو میرے زخمِ دل پر نمک چھڑکے تو یہ زخم کے لیے سرتاپا سود (نفع) ہے  
اور نمک کے لیے نقصان۔

عاشق کا زخمِ دل نمک سے راحت محسوس کرتا ہے اس لیے نمک زخم کے لیے مفید ہے  
لیکن پیہم نمک چھڑکنے سے نمک کی مقدار گھٹتی جائے گی یا اس کا زیاں ہوا۔

گفتی الماس فشانم، تو و حق

نازش من بہ گمانِ نمکِ است

لغت: ”الماس“ = یعنی ہیرا۔ کہا جاتا ہے کہ ہیرے کا کوئی ریزہ زخم میں گر جائے تو وہ  
زخم کو چیرتا چلا جاتا ہے۔

شاعر کہتا ہے: تو نے کہا کہ میں نے (زخم پر) الماس چھڑکا۔ تو نے سچ کہا (تو حق)  
لیکن میں جو اس پر ناز کرتا ہوں تو الماس پاشی کو نمک پاشی سمجھ کر کر رہا ہوں۔  
مرزا غالب کا یہ شعر دیکھیے:-

نہ پوچھ نیک مرہمِ جراحتِ دل کا

کہ اس میں ریزہ الماس جزوِ اعظمِ است

نطق من مایہ من بس غالب

خود نمک گوھر کانِ نمکِ است

غالب! میرا نطق (یعنی قوتِ بیان) ہی میرا سرمایہ ہے۔ نمک ہی کانِ نمک کا  
گوہر ہے۔

شاعر کا سرمایہ اس کا فنِ شعر ہے اور وہ خود ہی اپنے فن کا مداح بھی ہے۔



### غزل نمبر (۸)

چہ فتنہ ہا کہ در اندازہٴ گمانِ تو نیست

قیامتِ است، دلِ دیرِ مہربانِ تو نیست

لغت: ”چہ“ = بظاہر کلمہ استفہام ہے لیکن یہاں نفی کے معنی دیتا ہے ”دلِ دیرِ  
مہربان“ = ایسا دل جو بڑی دیر کے بعد کسی پر مہربان ہو۔ کون سے ایسے فتنے ہیں جو تیرے تصور  
میں نہیں ہیں۔ تیرا دیر سے مہربان ہونے والا دل کیا ہے ایک قیامت ہے۔

محبوب کو عاشق پر ستم ڈھانے کے ہزاروں انداز معلوم ہیں۔ عاشق کی حالتِ زار کو  
دیکھ کر بھی بے اعتنائی سے کام لینا ایک ایسا ہی شیوہ ہے۔ اس کے مہربان ہوتے ہوتے عاشق  
پر قیامت گزر جاتی ہے۔

ہائے اُس زودِ پشیمان کا پشیمان ہونا

فریبِ آشتیِ دہ، این ظفرِ مبارکِ باد

دلِ ستمِ زدہ در بندِ امتحانِ تو نیست

(اب) محبت اور صلح کا فریب دے۔ تجھے یہ کامیابی مبارک ہو کہ میرا ستم زدہ دل،  
تیرے امتحانِ محبت سے آزاد ہو چکا ہے۔



محبوب، عاشق کی وفاداری کو آزمانے کے لیے ستم کرتا رہا۔ اگر اس جور و ستم میں خلوص ہوتا تو پھر بھی کوئی بات تھی کیونکہ اس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک ربط کا پہلو تو نکلتا ہے۔ لیکن یہ محبوب کی ستم رانیاں بھی فریب ہی تھیں۔ عاشق کا دل مایوس ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ اس سے کہتا ہے کہ اس فریب دہی میں تم کامیاب ہو گئے، مبارک ہو، اب کوئی اور انداز فریب سوچو اور وہ یہ کہ محبت سے پیش آؤ۔

شاعر نے کس ندرت بیان سے محبت کا واسطہ دیا ہے۔

مگر ز پارۂ سنگم کہ ریزد دم تنگ

بکس، مترس کہ در سودمن زیان تو نیست

شاید میں کوئی پتھر کا ٹکڑا ہوں کہ (تم ڈرتے ہو) اس سے تمہاری تلواری کی دھار خراب ہو جائے گی۔ ڈر نہیں۔ مجھے مار ڈال، میرے اس نفع میں تیرا کوئی نقصان نہیں۔

دل ہم بہ عہد وفائی فریفت نامہ سپار

خوش است وعدہ تو، گرچہ از زبان تو نیست

نعت: ”نامہ سپار“ = پیام لانے والا قاصد۔

قاصد تیری طرف سے عہد وفا کا پیغام لایا اور میرا دل اسی پر فریفت ہو گیا۔ کتنا اچھا ہے یہ وعدہ! (دل تو لہجہ گیا) اگرچہ یہ وعدہ تیری زبان سے نہیں، قاصد کی زبانی پہنچا ہے۔

فلکست رنگ تو از عشق، خوش تماشا می است

بہار دھر بہ رنگینی خزان تو نیست

نعت: ”فلکست رنگ“ = رنگ اڑنا۔

عشق سے تیرے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے اور یہ ایک حسین نظارہ ہے۔ دنیا کی بہار میں تیری خزاں سی رنگینی نہیں ہے۔

محبوب کے زرد چہرے میں ایک ایسی حسین خلقتی کا انداز ہے جو بہار کی رنگینیوں میں بھی نہیں ہوتا۔

مرزا غالب کے تصور حسن کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حسن ہر حالت میں حسین اور دلکش ہوتا ہے۔ کسی کی محبت میں ایک حینہ کے زرد چہرے کا عجیب عالم ہوتا ہے۔

مرزا غالب کا یہ اردو شعر دیکھیے جسے سمجھنے میں عام لوگ غلطی کھا جاتے ہیں۔

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے

یہ وقت ہے خلقتن گہاے ناز کا

”رنگ شکستہ“ سے مراد محبوب کا رنگ شکستہ ہے جس سے طرح طرح کی ناز آفرینیوں کے پھول کھلتے ہیں۔

شباہتی است مرآن را کہ بر نیامدہ است

و گر نہ موی بہ باریکی میان تو نیست

پہلے مصرعے میں ”آن“ کا اشارہ ”میان“ یعنی کمر کی طرف ہے۔

تیری کمر کو بال سے صرف اتنی مشابہت ہے کہ یہ ایسے بال کی طرح ہے جو ابھی اگا نہیں، نہ کوئی بال تیری کمر کی طرح باریک نہیں۔ یعنی کمر اتنی باریک اور نازک ہے کہ نظر بھی نہیں آتی۔ اس شعر میں محض مبالغہ آمیزی ہے۔

ز حق مرنج و در ابرو ز خشم چین مفلن

خوش است رسم وفا، گرچہ در زمان تو نیست



کج بات سے کبیدہ خاطر نہ ہو اور غصے سے ابرو میں شکن نہ ڈال۔ رسم وفا چھی بات ہے، یہ الگ بات ہے کہ تمہارے زمانے میں اس کا دستور نہیں۔  
وفا داری ایک مسئلہ خوبی ہے، کوئی اسے تسلیم نہ کرے تو اور بات ہے۔

روان فدای تو نام کہ بردہ ناصح

زہی لطافت ذوقی کہ در بیان تو نیست

اے ناصح! میری جان تجھ پر قربان، تو نے یہ کس کا نام لیا ہے۔ (سبحان اللہ) وہ کیسی لطافت اور لذت ہوگی کہ جو تیرے بیان میں نہیں (لیکن ہم اس سے محظوظ ہو رہے ہیں)۔  
ناصر، عاشق کو ترک عشق کی تلقین کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ محبوب کا نام مزے لے کر نہیں بلکہ ایک طرح نفرت سے لے رہا ہے۔ لیکن اس برے انداز سے ذکر کرنے کے باوجود، محبوب کے نام میں دل آویزی ہے جسے شاعر نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

عتاب و مھر تماشا یان حوصلہ اند

بہ سچ عربدہ اندیشہ راز دان تو نیست

تیرے غصے اور محبت کا انداز ایسا ہے (ان سے تیری طبیعت کا کچھ سراغ نہیں ملتا) کہ انہیں صرف تماشا ہی کہا جاسکتا ہے جو عاشق کے حوصلے کو دیکھ رہے ہیں، ورنہ محبت کے کسی ہنگامے سے ہمارا تصور تیرے راز کو نہیں پاسکتا۔

دل از خموشی لعلت امیدوار چہ است

چہ گفتہ بہ زبانی کہ در دھان تو نیست

نہ جانے میرا دل تیرے لب لعلیں کی خموشی سے اتنا امیدوار کیوں ہے؟ تو نے ایسی زبان سے جو تیرے منہ میں نہیں ہے کیا کہہ دیا ہے؟  
کوئی شخص خاموش ہو تو لوگ کہتے ہیں، اس کے منہ میں زبان نہیں۔ معشوق خاموش ہے لیکن اس کی خموشی کا انداز اس کی گویائی سے زیادہ حسین، دل کش اور فصیح ہے۔  
خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

گمان زیست بود بر منت زبی دردی

بد است مرگ، ولی بدتر از گمان تو نیست

یہ تیری بے دردی کی دلیل ہے کہ تجھے مجھ پر زندہ ہونے کا گمان ہے۔ موت بری شے سہی لیکن تیرے اس گمان سے زیادہ بری نہیں۔  
معشوق کے جور و ستم سے عاشق کی زندگی موت کے برابر ہو رہی ہے۔ اور اس کی ستم ظریفی کا یہ عالم ہیں کہ وہ عاشق کو زندہ شمار کرتا ہے۔ اس کا یہ انداز موت سے بھی زیادہ المناک ہے۔

عیار آتش سوزان گرفتہ ام صد بار

بہ سینہ تابانی داغ غم نہان تو نیست

لغت: "عیار چیزے گرفتن" = فارسی کا محاورہ ہے یعنی کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ "سینہ تابانی" = سینے کی حرارت۔

میں جلادینے والی آگ کا سو بار اندازہ کیا ہے تیری محبت کے غم پنہاں سے جو داغ ہمارے سینے میں ہے، اس کی حرارت اور تپش کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔  
یہاں پنجابی کے مشہور شاعر ہاشم شاہ کا شعر یاد آگیا۔ کہتا ہے:



آتش توں، برہوں دی آتش وچ نختی بہت پچھاتی  
سوہنی روز طے تریندیاں، پر سرد نہ ہو یوس چھاتی

تغافل تو دلیل تجاھل افتاد است  
تو و خدای تو، غالب ز بندگان تو نیست؟

لغت: "تغافل" = مصنوعی غفلت اور "تجاھل" = بناوٹی بے خبری ہے۔ معشوق سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

تیرا تغافل تیری بے خبری کی دلیل ہے۔ تجھے خدا کی قسم، یہ تو بتا دے کہ کیا غالب تیرے بندوں میں نہیں (کہ اسے تو نے یکسر بھلا دیا ہے۔)



### غزل نمبر (۹)

ای کہ گوئی غم درون سینہ جانفرسا است، ہست

خامشیم اما اگر دانی کہ حق با ما است، ہست

تو جو کہتا ہے کہ انسان کے سینے میں غم جانفرسا ہوتا ہے، واقعی ہوتا ہے۔ ہم خاموش ہیں، کچھ نہیں کہتے، لیکن اگر تو سمجھے کہ ہم حق بجانب ہیں تو یہ بھی بجا ہے۔

غم عاشق کی جان کو اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے اور وہ اف نہیں کرتا، اور اس کا خاموش رہنا بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔

این سخن حق بود و گاہی بر زبان ما زلفت

چون تو خود گفتی کہ خوبان را دل از خار است، ہست

یہ بات سچ تھی اور ہماری زبان پر کبھی نہیں آئی۔ اب جو تو نے خود ہی کہہ دیا کہ معشوقوں کا دل سخت پتھر کا ہوتا ہے تو ہاں ہوتا ہے۔

دیدہ تا دل خون شدن کز غم روایت می کنی

گر بگویم کا این نخستین موج آن دریا است، ہست

یہ جو تو کہہ رہا ہے کہ سنا ہے محبت میں عاشق آنکھوں سے لے کر دل تک خون ہو کر رہ جاتا ہے، میں اگر اس سلسلے میں یہ کہہ دوں کہ یہ تو اس خون کے سمندر کی پہلی لہر ہوتی ہے تو درست ہوگا۔

عاشق کی آنکھوں سے خون کے آنسوؤں کا بہنا اور دل کا خون ہو کر رہ جانا تو دراصل اس عشق کے سیلاب کی ابتدا ہے۔

دیدنی آخر انتقام خستگان چون می کشند

آنکہ می گفتیم ما کا امروز را فردا است، ہست

تو نے دیکھ لیا کہ عاشقان دل خستہ کا انتقام کیوں کر لیا جاتا ہے۔ وہ جو ہم کہا کرتے تھے کہ آج کے بعد کل بھی ہوتا ہے تو واقعی ہوتا ہے۔ یعنی عاشقوں کا جو رستم اٹھانا آخر رنگ لاتا ہے۔

ہم وفا ہم خواہش ما هیچ پرش عیب نیست

آنکہ میگفتی کہ خواہش در وفا بی جاست، ہست



ہم خود ہی وفا کرتے ہیں اور وفا کرنے کے خود ہی خواہشمند ہیں، اس لیے تیری طرف سے اگر ہماری پریش حال نہ ہو تو عیب کی بات نہیں۔ چنانچہ تمہارا یہ کہنا کہ وفامیں کوئی خواہش کرنا بے جا ہے تو واقعی بے جا ہے۔

باری از خود گو کہ چونی ور زمن پرسی پرس

بخت ناسازست، آری، یاربی پرواست، ہست

تو اپنی بات کر کہ تیرا چلن کیا ہے اور اگر مجھ سے میری بات پوچھنا چاہتا ہے تو وہ پوچھ لے۔ میرا بخت، ناسازگار ہے۔ اور یار بے پروا ہوا ہے۔ یہ صورت حال ہے تو ہے کیا کہا جاسکتا ہے۔

خوئی یارت را تو دانی، ورنہ از حسن و جمال

زلف غبر بوست، دارد، عارض زیباست، ہست

تو اپنے محبوب کی خو کو جانتا ہی ہے (اس کا کیا تذکرہ) رہا حسن و جمال کا اندازہ وہ زلف غبریں بھی رکھتا ہے اور عارض زیبا بھی۔

صبر دانگہ از تو، پندارم نہ حد آدمی است

وین کہ می گوئی، بہ ظاہر گرم استغناست، ہست

صبر اور وہ بھی جس کا تو اظہار کر رہا ہے، کسی انسان کی تو ہمت نہیں۔ اور یہ جو تو کہتا ہے کہ معشوق بظاہر بے نیازی کا مظاہرہ کر رہا ہے، یہ درست ہے۔

معشوق کی ظاہر بے نیازی ہی تو ستم ڈھاتی ہے جسے برداشت کرنا بے حد مشکل ہے۔

با چنین عشقی کہ طوفان بلا میخوانیش

چون بنی کان شکوہ دلبری بر جاست، ہست

ایسے عشق کے ہوتے ہوئے جسے تو ایک طوفان بلا کہتا ہے، جب تک تجھے حسن کی دلبرانہ شان قائم نظر آتی ہے عشق کا طوفان بلا بھی قائم رہے گا۔

دھکذارت را دل و جان گچنان فرش ست، ہان

جلوہ گاہت راز جان بازان همان غوغاست، ہست

تیری رہگذر میں عاشقوں کے دل و جان، فرش راہ بنے ہوئے ہیں۔ ہاں جلوہ گاہ میں جاں بازوں کا بدستور ہی ہنگامہ اور شور و غوغا ہے، اس میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

نظم و نثر شورش انگیزی کہ می باید بخواہ

ای کہ می گوئی کہ غالب درخن یکتاست، ہست

تو جو کہتا ہے کہ غالب فن سخن میں یکتا ہے تو واقعی ہے، اس لیے اگر تجھے دلولہ انگیز نظم و نثر کے شہ پارے درکار ہوں تو بے جھجک طلب کر لے۔



### غزل نمبر (۱۰)

سینہ بکشودیم و خلقی دید کا بنجا آتش است

بعد ازین گویند آتش را کہ گویا آتش است

ہم نے اپنے سینے کو کھولا اور لوگوں نے دیکھا کہ اس جگہ آگ ہے۔ اب اس کے بعد



لوگ اصلی آگ کو دیکھ کر آگ نہیں کہیں گے۔ بلکہ کہیں گے یہ کوئی آگ جیسی چیز ہے۔  
عاشق کے سینے میں محبت کے جوشعلے بھڑکتے ہیں اس کے مقابلے میں اصلی آگ کچھ  
بھی حقیقت نہیں رکھتی۔

انتظار جلوہ ساقی کبابم می کند

می بہ ساغر آب حیوان و بہ مینا آتش است

میں جلوہ ساقی کو دیکھنے کے انتظار میں جل اٹھتا ہوں۔ شراب مینا میں ہو تو آگ ہے  
اور ساغر میں ہو تو آب حیات بن جاتی ہے۔

جب تک ساقی نہیں آتا شراب صراحی میں پڑی رہتی ہے، اور اسے دیکھ کر میخواروں  
کے دل جلتے ہیں۔ جب وہی شراب ساقی اپنے ہاتھوں سے پیالے میں اٹھیل دیتا ہے تو آب  
حیات بن جاتی ہے:

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا

گریہ ات عشق از تاثیر دود آہ ماست

اشک در چشم تو آب و در دل ما آتش است

عشق میں تیرا رونا ہماری آہوں کے دھوکے کی تاثیر کے باعث ہے۔ تیری آنکھ میں  
آنسو پانی کی طرح ہے اور ہمارے دل میں آگ کی طرح۔

آنکھوں میں دھواں لگے تو پانی بننے لگتا ہے۔ معشوق کے کسی پر عاشق ہو جانے اور پھر  
عشق میں آنسو بہانے کو، اپنی آہوں کی تاثیر پر محمول کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ آنسو، محض پانی کی  
طرح ہیں۔ ہمارے آنسو تو آتش پارے ہیں، جو ہمارے دل میں بھڑک رہے ہیں۔

دل میں کہنے کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ عاشق انھیں دل میں ضبط کیے ہوئے ہے اور  
دوسرے یہ کہ وہ دل سے ابھرتے ہیں۔

ای کہ می گوئی تجلی گاہ نازش دور نیست

صبر مشتی از خس و ذوق تماشا آتش است

نفت: "مشت خس" = مٹھی بھرنے

تو جو یہ کہہ رہا ہے کہ اس کی (یعنی محبوب کی) تجلی گاہ ناز دور نہیں، ٹھیک ہے لیکن یہ بھی  
تو دیکھ کہ صبر کی حیثیت ایک مشت خس کی ہے۔ جلوہ ناز کو دیکھنے کا شوق، آگ کی طرح ہے۔ جلوہ  
معشوق کو دیکھنے کی بے تابی میں صبر کیوں کر ہو سکتا ہے۔ صبر تو ایک تنکا ہے جو بے تابی شوق کی  
آگ میں فوراً جل جاتا ہے۔

بی تکلف در بلا بودن از نیم بلاست

قعر دریا سلسبیل و روی دریا آتش است

مصیبت میں بے دھڑک کود پڑنا، مصیبت کے خوف زدہ ہونے سے بہتر ہے۔ سمندر  
کی سلسبیل کی طرح ہے اور سمندر کی سطح آب سراسر آگ ہے۔

سمندر کی سطح پر لہروں کا بے پناہ تلاطم، ساحل پر کھڑے اس طوفان کو دیکھنے والوں کو  
ہراساں کر دیتا ہے لیکن جب انسان طوفان میں کود پڑے تو یہ خوف دور ہو جاتا ہے۔ مصیبت کا  
تصور مصیبت سے کہیں زیادہ برا ہے۔

مرزا غالب نے یہ غزل عرفی کی ایک زمین میں کہی ہے، اور عرفی کے ایک مصرعے کو  
الٹ دیا ہے۔ عرفی کا مصرعہ ہے روے دریا سلسبیلی و قعر دریا آتش میں کیا ہے (چنانچہ اس کا ذکر



غالب نے اپنی غزل کے مقطع میں کیا ہے) اس الٹ پھیر سے غالب کے شعر میں ایک فکری بلاغت آگئی ہے۔

پردہ از رخ برگرفت و بی محابا مسخیم

بادہ باد است آتش آورا و مارا آتش است

اس نے چہرے سے پردہ اٹھایا اور ہم بے دھڑک جل گئے: شراب اس کی آگ کے لیے ہوا کی حیثیت رکھتی ہے اور ہمارے لیے آگ کی، یعنی شراب سے اس کا شعلہ حسن یوں بھڑک اٹھتا ہے جس طرح ہوا سے آگ اور ہم اس آگ میں جلتے والے ہیں۔

ہم بدین نسبت ز شونی در دلت جا کردہ ایم

فاش گوئیم از تو سنگ است آنچہ از ما آتش است

تیرے اور میرے درمیان ایک باہمی نسبت ہے جس سے ہم تیرے دل میں سما گئے ہیں۔ صاف صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ جو شے تیرے لیے پتھر ہے وہ ہمارے لیے آگ ہے۔ معشوق کا دل پتھر کی طرح ہے اور عاشق کے دل میں محبت کی آگ ہے۔ پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ یوں گویا عاشق کا معشوق کے دل میں سما جانے کا پہلو ابھرتا ہے۔

گریہ دارم کہ تا تحت الثری آب است و بس

نالہ دارم کہ تا اوج ثریا آتش است

لغت: ”تحت ثری“ = زمین کی تہ

میرے رونے کا یہ عالم ہے کہ تحت ثریٰ تک پانی ہی پانی ہے۔ نالہ و فریاد ہے کہ جس سے اوج ثریا تک فضا شعلوں کی لپیٹ میں آگئی ہے۔

پاک خور امروز و زنهار از پی فردا منہ

در شریعت مادہ امروز آب و فردا آتش است

لغت: ”پاک خوردن“ = ساری کی ساری شراب پی جانا۔

آج پوری شراب پی جا اور کل کے لیے بالکل نہ رکھ۔ شریعت رو سے شراب آج (یعنی اس دنیا میں) تو پانی ہے اور کل (یعنی اس دنیا میں) آگ۔

قیامت کے دن تو زندانِ بادِ خوارِ دوزخ کی آگ میں جلیں گے یعنی یہ شراب ان کے لیے آگ بن جائے گی۔ اس دنیا میں تو وہ پانی ہی ہے۔

راز بد خویان نہفتن بر نہاد بیش ازین

پردہ دار سوز و ساز ماست ہر جا آتش است

بدخو لوگوں کے راز کو اس سے زیادہ چھپانے کی تاب نہیں۔ جہاں کہیں آگ ہے وہ ہمارے ہی سوز و ساز کی پردہ دار ہے۔

بدخو لوگوں کی گرم طبیعت آگ کی طرح ہوتی ہے۔ اس کو برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ہم نے بڑے حوصلے اور خموشی سے اس کو دل میں جگہ دی ہے گویا وہ ایک راز ہے جو ہمارے دل میں چھپا ہوا ہے۔ گویا وہ آگ ہمارے دل میں سوز و سازِ محبت بن گیا ہے۔ معشوقانِ بدخو کے غضب کو برداشت کرنا، بلند جذبہ محبت ہی کا کام ہے۔

گشتہ ام غالب طرف با مشرب عرفی کہ گفت

روی دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

غالب میں مشربِ عرفی کا مقابل ہو رہا ہوں جس نے کہا، سمندر کی سطح سلسبیل ہے اور اس کی تہ آگ۔





## غزل نمبر (۱۱)

بخود رسیدنش از ناز بسکه دشوار است

چو ما بدام تمنای خود گرفتار است

لغت: ”بخود رسیدن“ = اپنے آپ تک رسائی۔ خود شناسی۔

معشوق، احساس ناز میں اس قدر کھو گیا ہے کہ اس کی اپنے تک رسائی نہیں (اسے اپنا بھی ہوش نہیں) وہ ہماری طرح اپنی تمنائیں گرفتار ہے۔

عاشق اپنی تمنائیں یوں گرفتار ہے کہ اس کی کوئی تنہا پوری نہیں ہوتی۔ ادھر معشوق کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ اپنے ناز حسن میں گرفتار ہے، اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں کیا ہوں اور میرا حسن کیا ختم ڈھار ہا ہے۔

تمام زحمت از ہستی ام چہ می پری

ز جسم لاغر خویشم بہ پیرھن خار است

لغت: ”بہ پیرھن خار بودن“ پہنے ہوئے کپڑوں میں کوئی کاٹا ہو تو اس کے چبھنے سے تکلیف ہوتی ہے۔

میری ہستی کے بارے میں کیا پوچھتا ہے، میں اس کے ہاتھوں سر تا سر زحمت ہوں۔ میرا جسم لاغر میرے لباس میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور میرے دکھوں کا باعث بنا ہوا ہے۔

صلای قتل دہ و جانفشانی ما بین

برای کشتن عشاق وعدہ بسیار است

عاشقوں کو قتل ہونے کی دعوت دے اور پھر ہماری جانفشانی کا جذبہ دیکھ، یوں تو تو نے عاشقوں کو قتل کرنے کے بہت سے (چھوٹے) وعدے کیے ہیں۔

الگ الگ عشق کے دعوے داروں سے انھیں قتل کرنے کا وعدہ کر کے انھیں خوش کر لینا اور بات ہے۔ قتل کی صلا عام دینے ہی سے سچے عاشق کی پہچان ہوتی ہے اور اس کی جانفشانی کے صحیح جذبے کا راز کھلتا ہے۔

ستم کش سر ناموس جوی، خوشنتم

کہ تاز جیب برآمد بہ بند دستار است

لغت: ”سرناموس جو“ = جس سر میں عزت و شہرت کے حصول کا سودا سمایا ہوا ہو۔

”جیب“ = جیب و گریبان دونوں معنی دیتا ہے۔

جیب و دستار کے الفاظ، انسانی لباس کی زینت کا سامان ہوتے ہیں شاعر کہتا ہے:

میں اپنے سر کے ستم اٹھار ہا ہوں جس میں عزت و ناموس کا سودا سمایا ہوا ہے۔ جیب کے فکر سے فارغ ہوتا ہے تو دستار کے فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

انسان عزت و ناموس کا بھوکا ہوتا ہے اور اس کے لیے ظاہر انمائش کے وسائل کے حصول میں پڑا رہتا ہے۔ یہی چیز انسان کی زحماتوں کا باعث بنی رہتی ہے۔

بہ شب حکایت قلم زغیر می شنود

هنوز فتنہ بہ ذوق فسانہ بیدار است

میرا معشوق رات کو رقیب سے میرے قتل ہونے کی حکایت سنتا ہے (اور مزے لیتا ہے) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس قسم کا افسانہ سننے کا شوق کم نہیں ہوا۔ یہ فتنہ اس کے سر میں جاگ رہا ہے۔



بقامت من از آوارگی است پیرہنی

کہ خار رکھد رش پود و جادہ اش تار است

لغت: "تار و پود" = تانا بانا

میرے تن پر آوارگی کا وہ لباس ہے کہ جس کا بانا راستے کے کانٹے ہیں اور تانا پگھلنے کی ہے۔

یہ شعر جنون عشق کی آوارگی کی تصویر ہے کہ عاشق دیوانگی کے عالم میں پھر رہا ہے اور تن بدن کا ہوش نہیں۔ جسم پر لباس ہے تو وہی راستے کی خاک اور کانٹے۔

بیا کہ فصل بہار است و گل بہ صحن چمن

کشادہ روی تر از شاہدان بازار است

آ کہ فصل بہار آگئی ہے اور صحن چمن میں پھول، حسینان بازاری سے کہیں زیادہ شگفتہ اور بے تاب چہرے لیے بیٹھے ہیں۔

"کشادہ روی" کے الفاظ میں بڑی معنوی بلاغت اور شعری حسن ہے، اس سے مراد شگفتگی بھی ہے اور بے حجابی بھی۔ شاعر نے اپنے محبوب کو بڑے انداز میں جلوہ گر ہونے کی دعوت دی ہے۔

غم شنیدن و لہنی بہ خود فرد رفتن

خوشا فریب ترحم چہ سادہ پرکار است

میرا محبوب میری داستان غم سنتا ہے اور سن کر قد رے غم سم ہو جاتا ہے (مگویا یہ ظاہر کرتا ہے کہ غمزدہ ہو گیا ہے)۔ سبحان اللہ! رحمدلی دکھانے کا کیسا انداز ہے! کتنا سادہ بھی ہے اور

ہو شیارد چالاک بھی۔

فناست هستی من در تصور کمرش

چو نغمہ کہ ہنوزش و جود در تا راست

میری ہستی اس کی کمر کے تصور میں اس طرح گم ہے جس طری وہ نغمہ جو ابھی ساز کے تار سے نہیں ابھرا (تاری میں گم ہے)۔

مرزا غالب نے معشوق کی کمر کی باریکی کو سو طرح سے باندھا ہے اور ہر بار نئے انداز کا اظہار کیا ہے۔

یہاں اپنی ذات کو معشوق سے بڑے خوبصورت پیرائے میں وابستہ کیا ہے۔

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست

بگرد نقطہ ما دور ہفت پرکار است

لغت: "ہفت پرکار" = سات آسمان مراد ہے۔

اس کائنات کی غرض و غایت سوائے انسان کے اور کچھ نہیں ہمارے نقطے کے گرد سات پرکاریں چکر کاٹ رہی ہیں۔

مرزا غالب نے اس شعر میں عظمت انسانی کی وضاحت کی ہے اور کہا ہے کہ انسان ہی اس کائنات کا مرکز واحد ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب اسی کی تکمیل حیات کے لیے ہے۔

سعدی کہتے ہیں:-

ایرو باد و مہ خورشید ہمہ در کار اند

تا تو تانی بکف آری و بغفلت نہ خوری



نگاہ خیرہ شد از پر تو رخس غالب

تو گوئی آمنہ ما سراب زیدار است

معشوق کے چہرے کی چمک دمک سے نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا آمنہ سراب دیدار ہے۔

یعنی معشوق کے جلوہ حسن کی تاب نہیں لائی جاسکتی۔ عاشق کو جو کچھ بظاہر نظر آتا ہے وہ دیدار معشوق نہیں بلکہ فریب دیدار ہے۔



### غزل نمبر (۱۲)

سموم وادی امکان ز بس جگر تاب است

گداز زھرہ خاک است ہر کجا آب است

چونکہ اس وادی امکان (دنیا) کی گرم ہوا بے حد جگر سوز ہے، اس صفحہ ارضی پر جہاں کہیں بھی پانی ہے سمجھ لیجئے (وہ پانی نہیں ہے) خاک کا پتا اس گرمی سے گداز ہو گیا ہے۔

مرنج از شب تار و بیا بہ بزم نشاط

کہ پنبہ سر بینای بادہ مہتاب است

اس سیاہ رات سے نہ ڈراور (ہماری) بزم نشاط میں آجا۔ یہاں تو مینائے سے کمن پر جو سفید روئی پڑی ہے وہی چاندنی کا کام دے رہی ہے۔

غم سے پہ جو سفید روئی کا ڈھکنا ہے وہ چاند کی طرح چمک رہا ہے۔ شاعر نے اس سے

دیکھانے کی تکلف نہ فضا کو اچا کر کیا ہے۔

بخواب آمدش جز ستم ظریفی نیست

خدا نخواستہ باشد بہ غیر ہم خواب است

میرے معشوق کا خواب میں دکھائی دینا ستم ظریفی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ خدا نہ کرے، رقیب کے ساتھ سویا ہوا ہے۔

معشوق رات تو رقیب کے ہاں گزار رہا ہے اور عاشق کو خواب میں جلوہ دکھا کر رشک دلدار ہے۔

ز وضع روزن دیوار میتوان دانست

کہ چشم غمگدہ ما براہ سیلاب است

لغت: ”روزن“ = وہ سوراخ جو روشنی اور ہوا کے لیے دیوار میں رکھتے ہیں، روشندان۔

ہماری دیوار کے روزن کی وضع قطع بتا رہی ہے کہ یہ روزن نہیں بلکہ ہمارے غمگدہ کی آنکھ ہے جو بڑی بے تابی سے سیلاب کی آمد کا انتظار کر رہی ہے۔ گویا عاشق کا گھر آمادہ فنا ہے اور ہر لمحہ کسی سیلاب کا منتظر ہے۔

ز نالہ کار بہ اشک اوفتادہ، دل خون باد

ز شرم بی اثری ہا فغان ما آب است

فریاد کرتے کرتے معاملہ آنسو بہانے پر آگیا۔ یہ دل خون ہو جائے، اس کے باعث ہماری فریاد و فغان بے اثر رہی اور شرم سے پانی پانی ہو گئی ہے۔



نالہ بے اثر تھا، اپنی بے اثری کی ندامت سے پانی پانی ہوا۔ وہی پانی آنسوؤں کی صورت میں بہہ رہا ہے۔ عاشق کا رونا بے چارگی اور بے بسی کی علامت ہے۔

ز وہم نقش خیالی کشیدہ ورنہ

وجود خلق چو عنقا بدھر نایاب است

تو نے اپنے وہم میں ایک نقش خیالی بنا لیا ہے ورنہ اس دنیا کا وجود عنقا کی طرح نایاب ہے۔ یہ خیال بعض صوفیاء اور فلسفیوں کے اس نظریے کا آئینہ دار ہے کہ اس کائنات کا وجود وہی ہے خارجی نہیں۔ غالب کا یہ شعر دیکھیے:

ہستی کے مت فریب میں آجائو اسد

عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

نگہ ز شوخی حست چہ طرف بر بند

چنین کہ طاقت ما را بنا ز سیماب است

نفت: ”طرف بستن“ = فاکہ برداشتن۔ ہماری نگاہیں تیری شوخی حسن سے کیسے فیضیاب ہو سکتی ہیں، جبکہ ہماری تاب و طاقت کی بنیاد سیماب (پارے) پر ہے۔  
ادھر حسن کی شوخیاں بے تاب اور ادھر عشق کی بے تابیاں سیماب صفت ہیں۔

بعض دعویٰ همطرحی تو خوبان را

نگہ در آئینہ همجو خسی بہ گرداب است

دوسرے حسین جب تیرے حسن کی ہمسری کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کی نگاہیں آئینے

میں یوں گھبرا کر بے قرار ہو جاتی ہیں، جیسے بھنور میں نیچے۔

معشوق کے حسن کے مقابلے میں آنے کے لئے جب کوئی حسینہ آئینے کے سامنے آ کر آرائش کرتی اور اپنا رنگ روپ آئینے میں دیکھتی ہے تو معشوق کے حسن کا تصویری انھیں پریشان کر دیتا ہے۔ ان کی نگاہیں آئینے پر نہیں جھمتیں بلکہ چکرانے لگتی ہیں۔ اس شعر میں بڑا خوبصورت محاکاتی رنگ ہے۔

زمین ز نقش سم تو سن تو ساغر زار

ہوا ز گرد رھت، شیشہ می تاب است

نفت: ”تو سن“ = گھوڑا۔

زمین تیرے گھوڑے کے سموں کے نشانوں سے ساغر زار بنی ہوئی ہے اور فضا تیری گرد راہ سے بے تاب کی صراحی معلوم ہوتی ہے۔

قوی فادہ چو نسبت ادب مجو غالب

ندیدہ کہ سوئی قبلہ پشت محراب است

جب ہمارے مابین ایک مضبوط رشتہ ہے تو غالب، ادب کے تکلفات کی ضرورت۔  
دیکھتا نہیں کہ محراب کی پیٹھ قبلہ کی طرف ہوتی ہے۔

مسجدوں اور مسجدوں میں نماز پڑھنے والوں کا رخ کعبہ کی طرف ہوتا ہے لیکن محراب کی پشت کعبہ کی طرف ہوتی ہے۔ اس کی وجہ محراب اور قبلہ کی باہمی نسبت ہے۔





## غزل نمبر (۱۳)

گرد رہ خویش از نفسم باز ندانست

نگش ز خرام آمد و پرواز ندانست

وہ میرے سانس اور اپنے راستے کی گرد میں فرق نہ کر سکا۔ اسے خرام سے عار آئی اور وہ اڑنے سے نا آشنا تھا۔

معشوق نے عاشق کی آواز کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھا اور اسے محض گردِ راہ سمجھا۔ معشوق اڑنا نہیں جانتا تھا ورنہ وہ عاشق سے نظر بچا کر اڑ کر گزر جاتا۔ اور خراماں خراماں عاشق کے سامنے سے گزرنے کو اس نے عار خیال کیا۔

زان سان غم ما خورد کہ رسوائی ما را

خصم از اثر غمزہ غماز ندانست

لغت: ”خصم“ = دشمن، رقیب۔

”غمزہ غماز“ = معشوق کا شیوہ ناز و انداز جس سے عاشق کی محبت افشاں ہو جاتی ہے

اور وہ بدنام ہو جاتا ہے۔

رقیب پر ہمارے غم کا یہ اثر ہوا کہ اس نے ہماری رسوائی محبت کو معشوق کے ناز و

احتمول نہ کیا بلکہ اس کی اور ہی تاویل کی کیونکہ اسے اس بات سے دکھ ہوتا تھا، اور شاعر نے اس کے غم کی یہی توجیہ بھی پیش کی ہے۔

فریاد کہ تا آنکہمہ خون خوردنم از غم

میکرہ بہ دلش کرد گزر، راز ندانست

(افسوس) کہ میری فریاد، جو میں نے غم میں اتنا خون پی کر کی تھی، ایک بار اس کے دل میں سے گزری اور وہ راز کو نہ سمجھ سکا۔ عاشق نے عمر بھر ضبط سے کام کیا اور خون جگر پیتا رہا ایک فریاد یوں تک آئی اور اس فریاد کا اثر معشوق پر نہ ہوا۔

نازم نگہ شرم کہ دلھا ز میان برو

زان سان کہ خود آن چشم فسون ساز ندانست

مجھے محبوب کی نگاہ شرمیں پر ناز ہے کہ جس نے ہزاروں دلوں کو موہ لیا لیکن اس طرح کہ خود اس کی چشم سحر کار کو اس کا چہانہ چلا۔

یکچند بھم ساختہ ناکام گذشتیم

من عشوہ نہ پزیرتم و او ناز ندانست

ایک دفعہ میرے اور میرے محبوب کے درمیان ملاپ کی صورت ہوئی لیکن دونوں ناکام رہے اور گزر گئے۔ میں اس کے عشوے کے اثر کو قبول نہ کر سکا اور اسے دل بھانے کا انداز بھول گیا۔

یہ شعر عاشق اور معشوق دونوں کی بے نیازی کی تصویر ہے

از شاخ گل افشانہ و ز خارا گھر انگشت

آئینہ ما در خور پرداز ندانست



لغت: ”پرداختن“ = کا ایک مفہوم عقل کرنا اور چمکانا بھی ہے۔ چنانچہ اس شعر میں ”پرداز آئینہ“ سے مقصود عقل آئینہ ہی ہے قدرت نے شاخ سے پھول برسا دیے اور سخت پتھروں سے جواہرات پیدا کیے لیکن ہمارے آئینہ دل کو جلا دینے کے قابل نہ سمجھا۔

گریم کہ برد موجہ خون خواب گمش را

در نالہ مرا دوست ز آواز ندانست

میں نے نالہ و فریاد کی لیکن میرا دوست میری آواز کو نہ پہچان سکا۔ اب میں اس لیے روتا ہوں کہ میرے خونیں آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلے اور اس کی خواب گاہ کو بہا لے جائے۔ یعنی آہ و فریاد تو اس پر اثر انداز نہ ہوئی، شاید آنسو ہی کا رگر ہو سکیں۔

ہمد کہ ز اقبال نوید اثرم داد

اندوہ نگاہ غلط انداز ندانست

لغت: ”نگاہ غلط انداز“ = سرسری نگاہ، بے رخی سے دیکھنا۔

میرے معشوق نے مجھ پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ اس پر میرے ہمد نے اس خوش نصیبی پر مبارک باد دی، یہ سمجھ کر کہ میرا کچھ تو محبوب پر اثر ہوا ہے لیکن میرے دوست نے اس دکھ کا خیال نہ کیا جو محبوب کی نگاہ غلط انداز سے مجھے ہوا۔

مخمور مکافات بہ خلد و سقر آویخت

مشتاق عطا شعلہ ز گل باز ندانست

لغت: ”مکافات“ = اعمال کا بدلہ۔ ”خلد و سقر“ = جنت و دوزخ۔

جو لوگ انسانی اعمال کے صلے کے نشے میں مست تھے، وہ تو جنت و دوزخ میں الجھ

گئے اور جو اللہ تعالیٰ کے عام جود و عطا کے مشتاق ہیں وہ آگ اور پھول میں فرق نہیں کرتے۔

مشتاقان عطا کو حق کی طرف سے جو بھی عطا ہو وہ قابل قبول ہے۔ ان کی نظروں میں خدا سراپا رحمت ہے، انہیں اس کی رحمت پر بھروسا ہے۔ باقی لوگ اپنے اعمال کے گھمنڈ میں دوزخ و جنت کے دوسووں میں گرفتار ہیں۔

غالب سخن از ہند برون برکہ کس اینجا

سنگ از گھر و شعبہ ز اعجاز ندانست

اے غالب! اپنے کلام کو ہند سے باہر لے چل کہ یہاں تو کوئی موتیوں اور سنگریزوں نیز لفظی شعبہ کاریوں اور معجزہ فن میں تمیز نہیں کر سکتا۔



### غزل نمبر (۱۳)

ہر ذرہ مو جلوہ حسن یگانہ ایست

گوئی طلسم شش جہت آئینہ خانہ ایست

کائنات کا ہر ذرہ حسن یکتا (حسن ازلی) کے نظارے میں ہمدن محویت ہو کر رہ گیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا (جوشش جہت کا ایک طلسم ہے) ایک آئینہ خانہ ہے۔

آئینہ خانے میں ہزاروں آئینے دیواروں پر لگے ہوتے ہیں۔ کوئی حسینہ جب اس آئینہ خانے میں جاتی ہے تو اس کے ہزاروں جلوے ہر طرف رونما ہوتے ہیں۔ کائنات اسی آئینہ خانے



کی طرح ہے جس میں تمام مظاہرات عالم، حسن ازلی ہزاروں عکس کی طرح ہیں۔ گویا یہ عالم ”ہمہ اوست“ ہی کا مظہر ہے۔

بر روے شش جہت در آئینہ باز ہے

حیرت بدھر بی سرو پا می برد مرا

چون گوھر از وجود خودم آب و دانہ ایست

موتی صدف میں بند ہوتا ہے اور اپنے وجود ہی سے اپنی نشوونما حاصل کرتا ہے۔ اس کی چمک دمک سے یوں ظاہر ہوتا ہے گویا وہ ہمہ تن حیرت بن گیا اور یوں اس کی وضع قطع سے اس کی بے سرو پا پائی جکتی ہے۔

شاعر کہتا ہے حیرت مجھے اس عالم میں بے سرو پا لے جا رہی ہے۔ موتی کی طرح مجھے اپنی ذات ہی سے آب و دانہ میسر آتا ہے۔

اس دنیا میں جو ایک ظلم حیرت ہے، انسان کھویا ہوا سرگرداں رہتا ہے، اس موتی کی طرح جو صدف میں تہا ہوتا ہے۔

نا چار با تغافل صیاد ساختم

پنداشتم کہ حلقہ دام، آشیانہ ایست

میں نے چار و ناچار صیاد کے تغافل سے موافقت کر لی اور جال کے حلقے ہی کو ایک آشیانہ سمجھ لیا۔

صیاد، پرندے کو جال میں اسپر کر کے اس کی طرف سے ارادہ بے نیاز ہو جاتا ہے اور طائر اسیر حلقہ راہ میں یوں پڑا رہ جاتا ہے جیسے آشیانہ ہو۔ ایک عاشق کا معشوق کے تغافل کا عادی

ہونا بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

ای دای ہر اسیری کز یاد رفتہ باشد

در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

پا بستہ نورد خیالی، چو دا ری

ھر عالمی ز عالم دیگر فسانہ ایست

تو وہم کی لپیٹ میں آیا ہوا ہے۔ جب تو معاملے کی تک پہنچ جائے گا تو تجھے معلوم ہوگا کہ ہر نیا عالم ایک دوسرے عالم ہی کا فسانہ ہے۔

خود داریم بہ فصل بہاران عنان کسخت

گلگون شوق را رگ گل تازیانہ ایست

لغت: ”گلگون“ = شیریں کے گھوڑے کا نام تھا۔ عام گھوڑا ”عناں کسختن“۔ لگام تڑا لینا۔ آزاد ہو جانا۔

فصل بہار آئی اور میری ساری متانت اور خود داری جاتی رہی۔ یوں کہنا چاہیے کہ رگ گل اسب شوق کے لیے تازیانے کا کام دیتی ہے۔ شعر میں بہار آنے پر عاشق کے جذبات بے قابو ہو جانے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

ھر سنگ عین ثابتہ آگینہ

ھر برگ تاک قفل در شیرہ خانہ ایست

لغت: ”ثابتہ“ = جس سے کوئی بات محقق ہو جائے۔



”آہگینہ“ = شیشہ، صراحی۔

ہر پتھر سر تا سر صراحی کا نمونہ بنا ہوا ہے، انگور کی پیل کا ہر پتا شیرہ خانہ کا قفل دکھائی دے رہا ہے۔

بہار کی آمد نے ایک عجیب ساں پیدا کر رکھا ہے۔ ہر سنگریزہ صراحی بن گئی ہے اور ہر انگور کے پتے سے شراب پھٹی نظر آتی ہے۔

ہر ذرہ در طریق وفای تو منزلی

ہر قطرہ از محیط خیالت کرانہ ایست

تیری وفا کی راہ میں ہر ذرہ نشان منزل بن گیا ہے اور ہر قطرہ تیرے خیال کے سمندر کا کنارہ۔

عشق و وفا کی راہ میں ہر قدم پر ہر ذرہ یوں نظر آتا ہے جیسے منزل آہنجی۔ محبوب کے تصور کا ہر قطرہ ساحل بن گیا ہے۔ سفر عشق میں انسان کا قدم نہ جانے کتنی منزلیں اور مسافتیں طے کر لیتا ہے۔

در پردہ تو چند کشم ناز عالمی

داغم ز روز گار و فراقت بھانہ ایست

میں تیرے پردے میں کب تک ایک دنیا کے ناز اٹھاؤں گا۔ دنیا نے مجھے جلا دیا ہے لیکن میں اسے تیرے فراق کے صدموں سے تعبیر کرتا ہوں۔

عاشق نے زمانے کے دکھوں کو بھی محبت میں گوارا کر لیا ہے۔ گویا انھیں بھی بلند مقام عطا کیا ہے۔ دراصل یہ دکھ بھی محبوب کی محبت کی وجہ سے ملے ہیں۔

دشت چو شاہدان بنظر جلوہ می کند

گرد رہ دھوا سر زلفی و شانہ ایست

دشت، ایک حسینہ کی طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ راستے کی گرد زلف اور ہوا اس کی شانہ کشی کر رہی ہے۔

دشت کے عالم میں عاشق سرگرداں ہے اور بیاباں نور دی کر رہا ہے لیکن اس عالم دشت میں بھی ایک کیفیت ہے کہ اب اسے گرد راہ زلف محبوب معلوم ہوتی ہے جسے ہوا شانے کی طرح سنوار رہی ہے۔ شاعر نے اس دشت کو ایک ایسی حسینہ قرار دیا ہے کہ جس نے ساری فضا کو حسین و جمیل بنا دیا ہے۔

غالب دگر ز منشاء آوارگی پیرس

گفتم کہ جبہ راہوس آستانہ ایست

لغت: ”جبہ“ = جبین، پیشانی۔

منشاء = خواہش

غالب اب آوارگی کی خواہش کی بات نہ کر۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ میری جبین کو اب کسی ایک آستانے کی تمنا ہے، جہاں آرام سے سجدہ کیے پڑا رہوں۔





## غزل نمبر (۱۵)

ھر چہ فلک نخواست غمچکس از فلک نخواست

ظرف فقیہی نہ جست بادۂ ماگزک نخواست

لغت: ”ماگزک“ = کوئی لذیذ چیز جو شراب پینے والے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کھاتے ہیں۔

جو کچھ آسمان نے نہیں چاہا وہ شے کسی شخص نے آسمان سے طلب نہیں کی۔ فقیہ نے اپنی تنگ ظرفی سے شراب نہ مانگی اور ہماری شراب (شراب نوشی) کو گزک کی ضرورت نہ پڑی۔

قدرت انسان کو وہی کچھ دیتی ہے جس کا اس میں ظرف ہو۔ دین پرست فقیہ میں شراب نوشی کا ظرف نہ تھا، وہ اس سے محروم رہا اور ہم میں اس کا ظرف وافر تھا، اتنی ملی کر گزک کے پکھنے کی نوبت نہ آئی۔

غرقہ بموجہ تاب خورد، تشنہ ز دجلہ آب خورد

زحمت صبح یک نداد، راحت صبح یک نخواست

غرق آب ہونے والا لہروں کے تھیرے کھاتا رہا۔ پیاسے نے دریا (دجلہ) سے پانی پیا اور خوب سیراب ہوا۔ غرق ہونے والے نے کسی اور کو زحمت نہ دی اور پانی سے سیراب ہونے والے نے کسی اور کی راحت کا خیال نہ رکھا۔

دنیا میں دکھ سہنے والا بھی تنہا دکھ سہتا ہے اور سکھ اٹھانے والا بھی تنہا سکھ اٹھاتا ہے۔

جس عالم میں بھی ہو کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہوتا۔

جاہ ز علم بی خبر، علم ز جاہ بی نیاز

ہم محک تو زرنہ دید، ہم زرمن محک نخواست

لغت: ”محک“ = کسوٹی۔ جاہ و حشمت (والے) علم سے بے گانہ ہوتے ہیں اور علم، جاہ و حشمت سے بے نیاز تیری کسوٹی نے سونا نہ دیکھا، میرے سونے کو کسوٹی کی ضرورت نہ پڑی۔ امارت پرست انسان کو علم کی دولت نصیب نہیں اور صاحب علم کو زرو مال کی پروا نہیں۔

شحنہ دھر بر ملا ھر چہ گرفت، پس نداو

کاتب بخت درخفا ھر چہ نوشت حک نخواست

لغت: ”شحنہ“ = کوتوال۔ شحنہ دھر۔ زمانے کی دست برد ”کاتب بخت“ = کاتب تقدیر۔

”بر ملا اور درخفا“ اعلانیہ اور پوشیدہ۔ دونوں لفظوں میں معنوی تضاد ہے اور شعر کے باقی الفاظ سے مل کر جو بڑے برجستہ اور مترنم واقع ہوئے ہیں۔ شعر میں موسیقیت پیدا کر رہے ہیں۔

زمانے کی دست برد انسان سے جو کچھ چھین لیتی ہے، وہاں نہیں دیتی اور کاتب تقدیر جو کچھ لکھ دیتا ہے اُس میں سے کسی لفظ کو نہیں کاٹتا۔

خون جگر بجائی می مستی ما قدح نداشت

نالہ دل نوای نی، رامش مانچک نخواست



لغت: ”چمک“ = سارنگی، اسے غوک بھی لکھتے ہیں۔ ”رامش“ = نغمہ۔

ہماری قسمت میں شراب کی جگہ خون جگر تھا۔ ہمارے نشے کو جام و ساغر کی حاجت نہیں تھی۔ (ہماری بزم میں) ہمارے نالہ دل ہی نئے آواز نئے کام دیا۔ ہمارے نغمے کو سارنگی درکار نہ تھی۔ ہم خون جگر پیتے رہے اور اسی میں سرشار رہے۔ فریادیں کیں اور وہی ہمارا نغمہ تھیں۔

زاهد و ورزش سجد، آہ ز دعویٰ وجود

تا نہ زداہر من رہش، بدرقہ ملک خواست

لغت: ”بدرقہ“ = رہنما، رہبر۔ دراصل یہ لفظ ”بدرہ“ کا معرب ہے۔ قدیم فارسی میں ”بد“ کا مفہوم بزرگ یا سردار کا ہے جیسے ”سپہ بد“ سردار لشکر۔ بدرہ کا مطلب ایسا شخص جو رہنمائی کر سکے۔

(اللہ اللہ) زاہد کی یہ پیہم مجہد ریزیاں (جیسے وہ مجہدوں کی ورزش کر رہا ہو) افسوس جب تک اس میں ان مجہدوں سے کبر و تاز پیدا نہ ہوا اور غرور نفس کے ہاتھوں شیطان نے اسے گمراہ نہ کیا، زاہد نے فرشتے کو اپنا رہنما نہ بنانا چاہا۔

فرشتوں کا وجود کبر و غرور سے پاک ہوتا ہے۔ ان میں زہد۔ بے ریا ہوتا ہے۔ وہ زاہد کی طرح، غرور نفس میں مبتلا نہیں ہوتے۔

بحث و جدل بجائی مان، میکدہ جوی کاند ران

کس نفس از جمل نہ زد، کس سخن از فدک خواست

لغت: ”بجائے مان“ = معلوم بجائے دار یعنی یونہی رہنے دے۔ مولانا حالی اس شعر کی شرح یوں کرتے ہیں جو بہت خوب اور واضح ہے۔

”بحث و جدل کو یونہی رہنے دے اور سے خانے میں جا کہ وہاں نہ جمل کا جھگڑا نہ فدک کا قصہ ہے جمل سے مراد جنگ جمل جس میں حضرت عائشہؓ جمل یعنی اونٹ پر سوار ہو کر حضرت امیر (علیؓ) سے لڑنے گئی تھیں۔ فدک ایک کھجوروں کا باغ تھا جس پر حضرت سیدہ النساء فاطمہؓ زہراؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت میں وراثت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ دونوں جھگڑے من جملہ ان بے شمار نزاعوں کے ہیں جن پر سنی شیعہ حضرات میں ہمیشہ نزاع رہتی ہے۔

گشتہ رہ انتظار پور، دیدہ رہ سہید

در رہ شوق، ہمرہی دیدہ ز مردمک خواست

اس شعر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے فرزند یوسفؑ کی جدائی میں بیٹائی کھو دینے کی طرف اشارہ ہے۔ اسے علم بدیع میں صنعت تلمیح کہتے ہیں۔

بیٹے کے انتظار میں پیر رہ (حضرت یعقوبؑ) کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ شوق محبت کی راہ میں انھوں نے آنکھوں کی پتلی کی ہمراہی بھی طلب نہ کی، یعنی حضرت یعقوبؑ کی محبت اور شوق کا یہ عالم تھا کہ بیٹے کے انتظار میں مایہ ناز ہو گئے۔ اس شوق کی محویت میں انھوں نے آنکھوں کی بیٹائی کو بھی اپنا ہمراہ نہ بنانا چاہا۔

حسن چہ کام دل دھد چون طلب از حریف نیست

خست نگاہ گر جگر خستہ ز لب نمک خواست

لغت: ”حریف“ = مقابل کو کہتے ہیں۔ اس شعر میں حسن کا مقابل عشق ہے۔ جب مقابل یعنی عشق کی طرف سے طلب کے جذبے کا اظہار نہ ہو تو حسن اس کی دلی خواہش کو کیوں پورا



کر سکتا ہے۔ عاشق خستہ جگر نے منہ سے نمک نہ مانگا، نگاہ عاشق خستہ ہو کر رہ گئی۔ عاشق کا جگر زخمی ہو چکا ہے۔ اب اس کی یہ آرزو ہے کہ حسن زخم جگر پر نمک ریزی کرے لیکن یہ بات وہ منہ سے نہیں کہتا، محض خاموش نگاہوں سے کہہ رہا ہے۔ محبوب تغافل سے کام لے رہا ہے۔ اور عاشق کی اس آرزو کو بے غلی پر محمول کرتا ہے چنانچہ آرزو پوری نہیں ہوتی۔ اور عاشق کی نگاہ خاموش التجائیں کرتے کرتے تھک جاتی ہے۔

خرد خوش است در برم پردہ چنیں خشن خوش است

عشق بہ خار خار غم پیر صم تنک نخواست

میرے تن پر گدڑی ہی اچھی لگتی ہے۔ یہ ایک موٹا اور سخت لباس ہے جو خوب پردہ پوشی کر لیتا ہے۔ اسی لیے عشق کے اس غم کی تڑپ میں میرے جسم پر ہلکا لباس گوارا نہیں۔ گدڑی گویا اس طرح کا پردہ ہے جس سے مرض میں اضافہ ہونے کا خدشہ نہیں اور اس نے غم عشق کو بھی چھپا رکھا ہے۔

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گران نبود

لیک صم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

لغت: ”رند ہزار شیوہ“ = رند جس کی زندگی کے کئی ایک رنگ اور تیور ہوں۔ وسیع مشرب۔

ایک وسیع مشرب رند کے لیے خدا کی بندگی کوئی مشکل چیز نہ تھی، لیکن جو جیس میرے آگے سجدہ کرتی ہے وہی کسی اور کے آگے بھی جھکے۔

شاعر نے ایسی جہیں کو جو کئی جگہ جھکے مشترک ناصیہ کہا ہے جو بہت خوبصورت ہے۔

سحل شمر د و سر سری، تا تو ز عجز نشمری

غالب اگر بداد، کی داد خود از فلک نخواست

لغت: ”شعر میں ”تا“ کا حرف، حرف تنبیہ ہے کہ دیکھنا، ہشیار۔ غالب نے اگر اپنا انصاف فلک سے طلب نہ کیا کہیں اسے اس کے عجز پر محمول نہ کر لیتا۔ اس نے اس بات کو گھٹیا تصور کیا اور اپنی کسر شان سمجھا۔



### غزل نمبر (۱۶)

ما لا غریم گر کمر یار نازک است

فرقی است در میانہ کہ بسیار نازک است

اگر کمر یار نازک ہے تو ہم لا غریم۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اس کی کمر بہت نازک ہے۔

دارم دلی ز آبلہ نازک نهاد تر

آہستہ پانھم کہ سر خار نازک است

میرادل میرے پاؤں کے چھالے سے بھی زیادہ نازک ہے۔ میں سنبھل سنبھل کے قدم رکھتا ہوں کہ کانٹے کی نوک بڑی نازک ہے۔

چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ چھالے بہت نازک ہوتے ہیں۔ ذرا کاٹنا



چھو جائے تو پھٹ جاتے ہیں، لیکن عاشق کا دل ان سے بھی نازک ہے۔ وہ رک رک کر قدم رکھتا ہے اس لیے نہیں کہ ڈرتا ہے کہیں کا نچا چھینے سے چھالے پھٹ نہ جائیں بلکہ اسے نوک خار کا خیال ہے کہ اسے پاؤں سے ٹھیس نہ لگ جائے کیونکہ وہ بھی بہت نازک ہے۔

از جنبش نسیم فرو ریزی زہم

ما را چو برگ گل در و دیوار نازک است

پھول کی پتی کی طرح ہمارے (گھر کے) در و دیوار نازک ہیں۔ ہلکی سی ہوا کی جنبش سے درہم برہم ہو کر گر پڑتے ہیں۔

با نالہ ام زنگ دلی حالی خود مناز

عافل قماش طاقت کھسار نازک است

لغت ”قماش“ = (لباس) ساز و سامان اور بے کار شے۔ اس اعتبار سے یہ لفظ یہاں بہت موزوں ہے۔ میری نالہ و زاری کو سن کر یہ سمجھ کہ یہ تیری سنگدلیوں کا اثر ہے اور اس پر غور نہ کر۔ نادان! اس کھسار کی طاقت ہی حقیر سی ہے، یعنی معشوق کی سنگدلیوں کے پتھر اڑے دل پر کیا چوٹ لگے گی اور کوئی کیا فریاد کرے گا، وہ پتھر تو بڑے نازک ہیں۔

زحمت کشید و آن مژہ بر نشت همچنان

ماخت جان و لذت آزار نازک است

اُن پلکوں نے یونہی ابھر کر دیکھا اور پھر پلٹ گئیں۔ بیکار زحمت اٹھائی۔ ہم سخت جان واقع ہوئے ہیں اور معشوق کی دلازاری کی لذت بہت نازک ہے۔

رسوائی مباد خود آرائی ترا

گل پر مزن کہ گوشہ دستار نازک است

زینت و آرائش کے لیے لوگ دستار پہ پھول لگا لیتے تھے۔ معشوق سے خطاب کر کے کہتا ہے:

کہیں تیری آرائش کا شوق ہی رسوا نہ ہو جائے۔ اتنے پھول گوشہ دستار پر نہ لگا کیونکہ وہ بہت نازک ہے۔

یعنی نمائش حد سے بڑھی تو رسوا ہو جاؤ گے اور برداشت نہ کر سکو گے۔

ترسم تپش زبند برون افکند مرا

تاب کند کاکل خمدار نازک است

معشوق کی زلف خمدار کی کند کے بیچ و تاب بڑے نازک ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے دل کی حرارت سے اس کند کے بند پکھل نہ جائیں اور مجھے باہر نہ پھینک دیں۔ حسن معشوق کی گرفت بڑی نازک ہوتی ہے۔ عاشق کی بے تابیوں سے گھبرا کر کسی وقت بھی گرفت ڈھیلی پڑ سکتی ہے۔

از جلوہ نا گداختن و رو نساختن

آئینہ را بہ بین کہ چہ مقدار نازک است

لغت: ”رو نساختن“ = رو کے ایک معنی شرم کے ہیں۔ رو نساختن، شرم کرنا۔ معشوق کے جلوے سے جلتا بھی نہیں اور پھر اسے اس بات سے حجاب بھی نہیں آتا۔ آئینے کو دیکھ کتنا نازک واقع ہوا ہے۔



می رنجید از تحمل ما بر جفائی خویش

ہاں شکوہ کہ خاطر دلدار نازک است

”ہم معشوق کے جوہر جفا کو برداشت کر لیتے ہیں اور وہ ہمارے اس تحمل پر برہم ہوتا ہے۔ اس کی جفا کا شکوہ کرو کہ اس کی طبیعت بڑی نازک واقع ہوئی ہے۔

عاشق ضبط سے کام لیتا ہے اور جفائے معشوق پر تحمل کرتا ہے مگر وہ اس پر بھی رنجیدہ ہوتا ہے لہذا فریاد لازم آتی ہے۔

از نا توانی جگر و معدہ پاک نیست

غالب دل و دماغ تو بسیار نازک است

غالب اگر تیرا جگر اور معدہ کمزور ہے تو کوئی ڈر نہیں، تیرا دل و دماغ بہت نازک ہے (یہ نازکی بہت خوب ہے)



### غزل نمبر (۱۷)

امشب آتشین روی گرم ژند خوانی ہاست

کز لبش نوا ہر دم در شرر فشانی ہاست

لغت: ”ژند“ = آتش پرستوں کے پیغمبر زرتشت کی کتاب۔ ژند کی کتاب پر ذیلی حاشیے لکھے گئے، وہ کتاب پاژند کہلائی۔

”ژند“ لغوی طور پر ”پارہ“ ہے۔ چونکہ ژند پارہ پارہ، سورہ سورہ کی صورت میں تھی

اس لیے یہ نام پایا۔ پھر ژند کا مفہوم پارہ بزرگ و عظیم ہوا۔ چنانچہ ژند پیل یا ژندہ پیل بڑے ہاتھی کو کہتے ہیں۔

آج رات ایک ایسا آتش چہرہ معشوق ژند خوانی کر رہا ہے کہ اس کے لبوں سے جونوا ابھرتی ہے ہر لحظہ شرر فشانی کر رہی ہے۔

تا در آب افتادہ، عکس قد دلجویش

چشمہ ہجو آئینہ فارغ از روانی ہاست

جب سے اس کے دلکش قد کا عکس پانی میں پڑا ہے، آئینے کی طرح چشمہ بھی اپنی روانیوں سے فارغ ہو گیا ہے۔ پانی میں اگر روانی نہ ہو تو وہ آئینے کی طرح ہوتا ہے۔ عکس محبوب سے صرف آئینہ ہی حیرت زدہ نہیں ہوا، بہتے ہوئے چشمے کا آب رواں تھم گیا ہے۔ شاعر نے ”دلکش“ کے لیے ”دل جو“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ”جو“ ندی کو بھی کہتے ہیں۔ جو سے رعایت لفظی پیدا ہو گئی ہے۔

در کشاکش ضعف نکسلد روان از تن

اینکہ من نمی میرم، ہم ز نا توانی ہاست

ضعف کی کشاکش میں الجھ کر میری جان تن سے نہیں نکلتی یہ جو میں نہیں مارتا، یہ بھی نا توانیوں کے باعث ہے۔

از خمیدن پشتم، روی در قفا باشد

تا چھا درین پیری حسرت جوانی ہاست



میری پیٹھ کے جھکنے سے میری نظر پیچھے کو پڑتی ہے۔ اس بڑھاپے کے عالم میں جوانیوں کی کتنی حسرت ابھی ہے۔

بوڑھے آدمی کی پیٹھ جھکنے سے اس کا سر بھی جھک جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیچھے کو مڑ کر جوانی کو دیکھ رہا ہے۔

کشتہ دل خویشم کز سنگران یکسر

دیدہ دلفریبی ہا، گفتم مہربانی ہاست

میں اپنے دل کا مرا ہوا ہوں کہ اس نے سنگر حسینوں کے ہاتھوں سر بسر دل فریباں دیکھی ہیں اور یہی کہتا رہا ہے کہ یہ مہربانیاں ہیں۔

سوی من نگہ دارد چمن گلندہ در ابرو

با گران رکابی ہا خوش سبک عنانی ہاست

لغت: "گران رکابی" = رکاب کا بھاری ہونا یعنی سست رفتاری۔ "سبک عنانی" = لگام کا ڈھیلا ہونا یعنی تیز رفتاری، گراں رکابی کی ضد۔

محبوب عاشق کی طرف دیکھتا بھی ہے اور ابروؤں پر بل ڈالے ہوئے ہے۔ چونکہ ابرو کی صورت رکاب کی سی ہے اس لیے اُن پر شکن پڑنے سے وہ گراں ہو گئے ہیں۔

یعنی معشوق ایک طرف تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری توجہ اور تیزی سے عاشق کی طرف حائل ہے لیکن ابرو کے شکن اس توجہ میں حائل ہو رہے ہیں۔

دائم از سر خاکم رخ نہفتہ بگذشتن

هان و ہان! خدا دشمن! این چہ بدگمانی ہاست

میری قبر پر سے ہمیشہ منہ چھپا کے گزر جانا، ہاں اے خدا دشمن تو ہی بتا دے کہ یہ بدگمانیوں کا کیا انداز ہے۔

شوخی اش در آئینہ محو آن دھن دارد

چشم سحر پردازش، باب نکتہ دانی ہاست

اس کی شوخی آئینے میں اے دھن کے دیکھنے میں مصروف رکھتی ہے۔ اس کی چشم سحر پرداز آنکھ کیا نکتہ دانیوں کا ایک باب ہے۔

با عدو عتابستی و زمنش حجاب استی

وہ چہ دلبر بانی ہا، ہی چہ جان ستانی ہاست

رقیب کے ساتھ عتاب کا رویہ ہے اور مجھ سے اے حجاب ہے۔ دلبر بانی ہے تو عجیب اور جان ستانی ہے تو عجیب۔ رقیب کے ساتھ غصے سے پیش آنا عاشق کے لیے دل فریب ہے اور عاشق سے حجاب کرنا اداے جان ستاں ہے۔ دونوں تو عجیب ہیں۔

با چنین تھی دستی بھر چہ بود ہستی

کار ما ز سرمستی آستین فشانی ہاست

ایسی تھی دستی کے عالم میں زندگی کا کیا فائدہ۔ ہماری زندگی کا مشغلہ تو اب یہی ہے کہ ہم اس سے دامن چھڑاتے رہیں۔

ای کہ اندرین وادی مرثدہ از ہما دادی

بر سرم ز آزادی سایہ را گرانہ ہاست



اے خدا تو نے اس دینا (وادی) میں ہما (کے سایے) کا مژدہ سنایا۔ میں ان باتوں سے آزاد ہوں۔ میری اس آزادی سے میرے سر پر سایہ پڑنے سے گھبراتا ہے۔

ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیرون

باظہوری و صائب محوہم زبانی ہاست

فکر سخن کی لذت غالب کو انجمن سے باہر لے گئی۔ وہ ظہوری اور صائب کی ہم زبانی میں محو ہے۔

غالب کو اپنے عہد کے سخنوروں سے ظہوری و صائب جیسے زیادہ مرغوب تھے جن کا وہ اپنے آپ کو پیرو کہتا تھا اور اسی بات پر نازاں تھا۔



### غزل نمبر (۱۸)

جیب مرا مدوز کہ بودش نہ ماندہ است

تارش زہم گستہ وہ پودش نہ ماندہ است

میرا گریبان نہ سی کہ اس کا اب کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ اس کا تانا بکھر چکا ہے اور پانا باقی نہیں رہا۔

سر گرمی خیال تو از نالہ باز داشت

دل پارہ آتش ایست کہ دودش نہ ماندہ است

تیرے تصور کی گرمی (محویت) نے مجھے فریاد کرنے سے روک رکھا۔ دل وہ آگ کا ٹکڑا ہے کہ جس سے کوئی دھواں نہیں اٹھتا۔ فریاد کے اٹھنے کو دھواں اٹھنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

داد از تظلمی کہ بگوشت نمی رسد

آہ از توقعی کہ وجودش نہ ماندہ است

افسوس اس دکھ بھری فریاد پر جو تیرے کان تک نہیں پہنچتی۔ افسوس اس توقع پر کہ جس کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔

چون نقطہ اختر سیہ از سیر باز ماند

گوئی دگر هبوط و صعودش نہ ماندہ است

نکتہ: "سیر" = گردش، حرکت۔ "هبوط و صعود" = غروب و طلوع۔ گرنا اور ابھرنا۔

ہماری قسمت کا سیاہ ستارہ نقطے کی طرح ایک جگہ ٹھہر چکا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی غروب و طلوع باقی نہیں رہا۔

مکتوب ما بہ تار نگاہ تو عقدہ ایست

کز چیچ رو امید کشودش نہ ماندہ است

ہمارا خط تیری نگاہ کے تار میں ایسی گانٹھ کی طرح ہے جس کے کھٹنے کی کسی صورت بھی کوئی امید نہیں۔

دل را بہ وعدہ ستمی می توان فیر یافت

نازی کہ بر وفائی تو بودش نہ ماندہ است



اب تو دل کو تیرے وعدہ ستم ہی سے بہلایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اسے جو تیری وفا پر ناز ہوتا تھا وہ باقی نہیں رہا۔

اُفتادگی نماز دل ناتوان ماست

درد سر قیام و قعودش نہ ماندہ است

انتہائی محنت کی اور بے چارگی میں گرے ہوئے ہونا ہی ہمارے دل ناتواں کی نماز ہے۔  
اب قیام و قعود کی کوئی درد دوسری باقی نہیں رہی۔

دل جلوہ می دھدھنر خود در انجمن

رحمی مگر بجان حسودش نہ ماندہ است

ہمارا دل محفل میں علانیہ (اپنے جذبہ وفا کے) جو ہر دکھاتا ہے۔ اور اسے حسد کرنے والے کی جان پر کوئی ترس نہیں آتا۔

عاشق اب اپنی وفا پر نازاں ہے اور کھلم کھلا اس کا اعلان بھی کرتا ہے۔ اس بات کا مطلق خیال نہیں کرتا کہ حاسد کو اس سے دکھ پہنچے گا۔

دل در غم تو مایہ بہ رھزن سپردہ است

کار از زیان گذشتہ وسودش نہ ماندہ است

ہمارے دل نے غم میں اپنی ساری بضاعت رہزن کو سونپ دی ہے۔ اب معاملہ فکر زیاں سے گزر چکا ہے اور نفع کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

غالب زبان بریدہ و آگندہ گوش نیست

اما دماغ گفت و شنودش نہ ماندہ است

لغت: ”زبان بریدہ“ = جس کی زبان کٹ گئی ہو۔

”آگندہ گوش“ = جس کے کان بند ہو گئے ہوں۔ یہ دونوں ترکیبیں فاعلی معنی دیتی ہیں۔ ”دماغ“ = ذوق، کیفیت۔

غالب کی کوئی زبان تو نہیں کٹ گئی، اس کے کان تو بند نہیں ہوئے۔ ہاں اب کچھ کہنے سننے کا ذوق ہی جاتا رہا ہے۔ غالب کا اردو شعر دیکھئے:

ہے کچھ ایسی ہی بات کہ چپ ہوں

ورنہ کیا بات کر نہیں آتی



### غزل نمبر (۱۹)

بلبل دلت بہ نالہ خونین بہ بند نیست

آسودہ زی کی یار تو مشکل پسند نیست

اے بلبل! تیرا دل (ہماری طرح) خونیں فریادیں کرنے کا پابند نہیں۔ تجھے آسودگی سے رہنا چاہیئے (اور اس بات کا شکر کرنا چاہیئے) کہ تیرا محبوب (گل) مشکل پسند واقع نہیں ہوا) کہ وہ تجھ سے ہر لحظہ کوئی دشوار اور کٹھن کام کے سرانجام دینے کی توقع رکھے۔ تو کس لیے فریاد کر



رہی ہے۔ ہم تو مجبور ہیں۔)

اندازہ گیر ذوق غم در مذاق من

تلخاب گریہ را نمک زهر خند نیست

آنسوؤں کا ذائقہ تلخ ہوتا ہے اس لیے شاعر نے تلخاب گریہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آنسوؤں میں کچھ نمکینی بھی ہوتی ہے۔ اس کے لیے نمک کا لفظ لایا ہے جو موزوں ہے۔ "زہر خند" اوپری ہنسی کو کہتے ہیں، یعنی دل غمزہ ہوا اور لب مسکرا رہے ہوں، ایسی حالت کو زہر خند کہا جاتا ہے۔

میرے مذاق سے میرے ذوق غم کا اندازہ کر لے۔ میرے تلخ آنسوؤں میں زہر خند کا نمک شامل نہیں۔

عاشق کا دل غم سے لبریز ہے اور اس کے چہرے پر جھوٹی ہنسی بھی نہیں آتی۔ اور یہ حالت غم سے بھی آسودگی اور لذت اندوزی کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

عہد وفا ز سوئی تو نا استوار بود

بشکستی و ترا بہ شکستن گزند نیست

تیری طرف سے جو عہد وفا باندھا گیا تھا وہ کمزور سا تھا۔ تو نے اس عہد کو توڑ دیا اور اس سے تجھے کیا تکلف ہوئی (دکھ تو ہمیں ہوا)۔

دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ عہد ہی بودا باندھا گیا تھا۔ اس کے توڑنے میں کوئی تکلیف درکار تھی۔ غالب کا یہ شعر دیکھئے۔

تری ناز کی سے چانا کہ بندھا تھا عہد بودا

کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

از دوست میل قرب بہ کشتن غنیمت است

گر تیغ در کمان بہ نشاط کند نیست

تیغ قاتل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ تیر کمان میں رکھ کر چلایا جاتا ہے۔ کند دور سے پھینک کر شکار کو اسیر کیا جاتا ہے۔ بہر حال کسی کو مارنے کے لیے تیغ و تیر ضروری ہوتے ہیں، کند نہیں۔ اور یہ دونوں کند سے بہتر ہوتے ہیں۔ تیر و کند کہ ان دونوں کا مزہ وہ نہیں ہوتا جو کند سے کسی کو اسیر کرنے میں میسر آتا ہے۔ پھر بھی جب معشوق، عاشق کے قتل کے لیے، عاشق کے قریب آنے کی خواہش ظاہر کرے تو اس کی خواہش قرب بڑی غنیمت بات ہے ورنہ وہ تو عاشق کو اسیر کند عشق کر کے بے نیازی سے دور دور پھرتا ہے۔

بر یاد تو کدام پری خوان بخور سوخت

کو شرمسار دعوت نا سود مند نیست

بعض لوگ سحر سے پریوں کو بلاتے ہیں اور اس عمل میں جو کچھ کیا جاتا ہے اس میں ایک شے بخور (خوشبو) کا جلانا بھی ہے۔ پری خوانی کی جو کوشش ناکام رہے گی وہ "دعوت نا سود مند" ہوگی۔ شاعر کہتا ہے کہ کس پری خواں نے تیری یاد میں بخور کو جلایا کہ اسے پری کو دعوت دینے کی بے کار کوشش پر شرمساری نہیں

معشوق ایک پری ہے۔ جو کوئی اسے آنے کی یا بلانے کی دعوت دیتا ہے، وہ غلطی پر ہے۔ اس کی یہ دعوت، دعوت نا سود مند ہے کیونکہ معشوق یوں نہیں آتا۔ مزہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو اپنی اس دعوت نا سود مند پر شرمساری نہیں ہوتی۔

ہم نے اس شعر میں "کو" کا لفظ رکھا ہے۔ اس کی دوسری صورت "کوئے" ہے جسے بعض تازہ مطبوعہ نسخوں میں ترجیح دی گئی ہے۔ ایسی صورت میں شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ کس پری خواں



نے تیری یاد میں غور جلایا؟ کہہ دو کے ایسا شخص اپنی دعوت ماسودمند پہ شرمسار نہیں ہے۔

آن لایہ های مهر فزا را محل نمائد

برخوان خود ان یکاد کہ مارا سپند نیست

لغت: ”سپند“ = وہ کالا دانہ جو نظر بد کو دفع کرنے کے لیے جلاتے ہیں (بخالی، ہر مل)۔ سپند جلانا ایک طرح کی خوشامد (لایہ) ہوتی ہے جس میں مہر و محبت کا جذبہ کارگر ہوتا ہے کہ مضمرات دور ہو جائیں۔

”ان یکاد“ میں سورہ قلم کی اس آیہ پاک کی طرف اشارہ ہے جو نظر بد دور کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہے۔

ان یکاد الذین کفرو.....

اب مہر و محبت پیدا کرنے والی خوشامدوں کا موقع (مغناش) نہیں۔ اب تو ان یکاد پڑھ کہ ہمارے پاس (آگ کی روک تھام کے لیے) کوئی سپند نہیں (اب ہم آگ میں کود پڑنے اور جل جانے پر آمادہ ہیں)۔

بی خود بذیر سایہ طوبی غنودہ ایم

شکیر رہروان تمنا بلند نیست

لغت: ”شکیر“ = صبح سے پہلے وقت کو کہتے ہیں۔ یہ ایوار کی ضد ہے جو عصر یا دیگر کے لیے مستعمل ہے۔ شکیر صبح کے سفر کے معنوں میں آتا ہے اور اس شور اور نعرے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو سفر کے وقت بلند ہوتا ہے۔ یہی چیز ایوار پر بھی عائد ہوتی ہے۔ بہر حال شکیر کے شور کی بڑی خوبی اس کا بلند ہونا ہے۔ شاعر شعر میں اسی رعایت سے بلند کا لفظ لایا ہے۔ (ہم رہروان تمنا ہیں) رہروان تمنا کا نعرہ سفر بلند نہیں ہوتا (خاموش ہوتا ہے) ہم تو سایہ طوبی

تلمے بے خود پڑے اُدگھر رہے ہیں۔

عاشق دل ہی دل میں محبوب سے تمنائیں وابستہ کیے رہتے ہیں گویا رہروان تمنا کا سفر شوق خاموشی سے ہوتا ہے اور اس سفر میں نہ جانے وہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ایک عاشق ان تمنائوں میں کھویا ہوا ایسا ہے جیسے آسمان پر سایہ طوبی تلمے آرام سے اُدگھر رہا ہو۔

هنگامه دلکش است بدبده چیست

اندیشه بی غش است پند نیست

دنیا کے ہنگامے اتنے دل کش ہیں پھر مجھے جنت کی خوشخبری کیوں دی جا رہی ہے۔ میرے خیالات بڑے صاف اور پاکیزہ ہیں، میں پند و نصیحت کا نیاز مند نہیں ہوں (یعنی نصیحت درکار نہیں)۔

می نوش و سکیہ بر کرم کرد گار کن

خط پیالہ را رقم چون و چند نیست

لغت: ”خط پیالہ“ اسے خط ایام بھی کہتے ہیں۔ وہ خط جو جامے میں کھینچے ہوتے ہیں اور ان کا مقصد شراب کی مقدار کو جانچنا ہوتا ہے تاکہ ہر میخوار کو اس کے ظرف کے مطابق پلائی جاسکے۔

شراب پی اور اللہ تعالیٰ کی بخشش پر بھروسہ کر۔ خط پیالہ کوئی ایسی تحریر نہیں کہ جس کا مفہوم کیوں اور کتنی ہے۔

یعنی اگر خاص مقدار تک پی جائے تو قدرت معاف کر دے گی۔ تو جتنی چاہے پی لے، خدا بخشے والا ہے۔



غالب من و خدا کہ سرانجام برشکال

غیر از شراب و انبه و برقاب و قند نیست

غالب، خدا کا نام لے کر کج کہتا ہوں کہ برسات کی آمد کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ شراب ہو، آم ہوں برف کا ٹھنڈا پانی ہو اور قند ہو۔



### غزل نمبر (۲۰)

منع ما از بادہ عرض احتسابی بیش نیست

مختسب! افشردہ انگور آبی بیش نیست

لغت: "احتساب" = وار و گیر، حساب گیری۔

"مختسب" = احتساب کرنے والا، کو توال۔ "افشردہ" = رس۔

ہمیں شراب سے روکنا، سوائے اس کے کہ احتساب کا مظاہرہ کیا جائے اور کچھ نہیں۔

اے مختسب! آخر شراب (انگور کا رس) پانی سے زیادہ کوئی شے نہیں (یعنی پانی ہی تو ہے)۔

رنج و راحت برطرف، شاہد پرستاریم ما

دوزخ از سرگرمی نازش عتابی بیش نیست

رنج و راحت کا کیا ذکر، انھیں چھوڑو، ہم تو محبوب کے پرستار ہیں۔ دوزخ اس کے

(محبوب کے) ناز کی سرگرمی کا ایک پہلو ہے جسے عتاب کہا جاتا ہے۔

خارج از ہنگامہ سرتاسر بہ بیکاری گزشت

روحیہ عمر خضر مد حسابی بیش نیست

دینا میں خضر کی زندگی جاوداں کا بڑا چہ چا اور ہنگامہ ہے۔ شاعر کہتا ہے: ایک ہنگامے کے سوا خضر کی زندگی ساری کی ساری بے کاری میں گزری۔ عمر خضر کا سلسلہ ایک مد حساب سے زیادہ کچھ نہیں۔

قطرہ و موج و کف و گرداب جیحون است و بس

این من و مائی کہ می بالہ حجابی بیش نیست

لغت: "من و ما" = میں اور ہم۔ من و مائی، میں ہوں ہم ہیں، دعویٰ کرنا۔

"جیحون" = مشرق ایران کے ایک دریا کا نام ہے۔ عام دریا اور سمندر کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے دجلہ۔ "بالیدن" پھولنا۔ فخر و ناز کرنا۔ اترانا۔

قطرہ بلر، چھاگ بھنور یہ سب کے سب جیحون ہی تو ہیں (اس سے الگ تو کچھ نہیں) یہ جو میں ہوں اور ہم ہیں کے دعوے، تعلیمیں ہو رہی ہیں، محض حجاب ہیں اور کچھ نہیں۔

ہے مشکل نمود صور پر وجود بحر

یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

خویش را صورت پرستان ہرزہ رسوا کردہ اند

جلوہ می نامند و در معنی نقابی بیش نیست



ظاہر پرستوں (صورت پرستوں) نے اپنے آپ کو بے فائدہ بدنام کر رکھا ہے در نہ جسے وہ جلوہ کہتے ہیں دراصل (دو معنی) ایک نقاب سے زیادہ کچھ نہیں۔ (جو حسن ازلی کے چہرے پر پڑا ہوا ہے۔

شونخی و اندیشہ خویش است سرتاپائی ما

تار و پود ہستی ما چچ و تابانی بیش نیست

ہمارا وجود سرتاپا ہمارا ہی فکر اور اس کی شونخی ہے۔ ہماری ہستی کا تار و پود (تانا بانا) چچ و تاب کے سوا کچھ نہیں۔

انسان اپنی ہستی کی کنہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ایک چچ در چچ معما ہے اور اسی میں انسان الجھا ہوا ہے۔ یہی اس کی ہستی ہے۔

زخم دل لب تھمہ شور تہتم ہای تست

این نمکدان ہا بہ چشم ما سراپی بیش نیست

اصل میں ہمارا زخم دل تیرے تہتم کے نمک کا پیاسا ہے۔ باقی یہ جو دنیا میں ویسے نمکدان ہیں وہ ہماری نظر میں سراب (چھلاوے کی) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عام نمک سے عاشق کے دل کے زخم لذت اندوز نہیں ہو سکتے۔ یہ کام تو معشوق کے تہتم کی نمکینی ہی سرانجام دے سکتی ہے۔

نامہ بر از پیشگاہ ناز، مکتوب مرا

پانچی آورده است اما جوابی بیش نیست

لغت: ”پانخ“ = جواب (قدیم فارسی میں) ”پائے خون“ تھا یعنی وہ الفاظ جو کسی خط یا دفتری نوشتے میں لکھے جاتے تھے، جسے انگریزی میں ریمارکس کہتے ہیں۔ پائے خون مخفف ہو کر پانخ ہو گیا۔ پانخ کا لفظ تین طرح آتا ہے: سُخُن، سُخُن، سُخُن۔

پانخ کا لفظ پانخ بھی آتا ہے اور پانخ بھی۔ اساتذہ نے دونوں کو جائز قرار دیا ہے۔ مرزا غالب نے پانخ اور جواب میں فرق کیا ہے۔ پانخ وہ جواب ہے جس پر مکتوب الیہ کچھ لکھے اور جواب، جواب صاف ہے۔

”پیشگاہ“ = صدر و صدر مجلس کو کہتے ہیں اور اس فرش کو بھی جو صدر کے آگے بچھا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں مرزا غالب نے پیشگاہ کا لفظ پر معنی انداز میں استعمال کیا ہے۔ بارگاہ ناز کہنے کی بجائے پیشگاہ ناز اس لیے کہا ہے کہ قاصد فرش پا انداز ہی سے عاشق کے خط کا جواب لے کر لوٹ آیا ہے۔

قاصد معشوق کی بارگاہ ناز سے ہمارے خط کا جواب لایا ہے لیکن وہ جواب سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ (یعنی جواب صاف ہے)۔

جلوہ کن، منت منہ، از ذرہ کمتر نیست

حسن با این تابناکی آفتابی بیش نیست

کہتے ہیں کہ ذرے کا وجود آفتاب سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ دھوپ ہی میں دکھائی دیتا ہے۔

پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

اپنا جلوہ دکھا، احسان نہ جتا، میں ذرے سے تو کم نہیں۔ حسن کتنا ہی تابناک ہو آخر آفتاب سے زیادہ تو نہیں۔



آفتاب اپنی روشنی سے ڈروں کو زندہ کرتا ہے۔ اگر معشوق اپنا جلوہ دکھائے اور اس سے عاشق کی جان میں جان آئے تو کیا مضائقہ ہے۔

چند رنگین نکتہ دلکش تکلف بر طرف

دیدہ ام دیوان غالب، انتخابی بیش نیست

یہ رنگین دلکش نکتے کب تک بیان ہوتے رہیں گے۔ تکلف بر طرف، میں نے دیوان غالب کو دیکھا ہے، ایک انتخاب ہی تو ہے۔

غالب کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی نیا دلکش نکتہ تلاش کرنا کیا ضروری ہے۔ سارا دیوان ہی ایسے نکات سے بھرپور ہے اور اس اعتبار سے یہ دیوان کیا ہے، دیوان کا بہترین انتخاب ہے۔



### غزل نمبر (۲۱)

لذت عشقم ز فیض بی نوائی حاصل است

آن چنان تنگ است دست من کہ پنداری دل است

لغت: ”تنگ“ فارسی میں کئی ایک مفہوم دیتا ہے۔ دست تنگ: افلاس زدہ ہاتھ۔ ”دل تنگ“ = افسردہ، غمگین دل۔

شاعر نے تنگدستی یا بے نوائی اور تنگ دلی کی باہمی لفظی مناسبت سے شعر میں ایک نکتہ پیدا کیا ہے۔

میری لذت عشق، میری تنگدستی اور بے نوائی کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ میرا ہاتھ اتنا تنگ ہے کہ گویا دل ہے۔

ہم بقدر جوشش دریا تنومند است موج

تغ سیراب از روانی های خون بگل است

سندر کے زور تلاطم کے مطابق ہی لہر میں توانائی ہوتی ہے۔ قاتل کی تلوار، خون بگل کی روانی ہی سے سیراب ہے۔ عاشق میں قتل ہونے کے جذبے ہی سے قاتل کی تلوار اپنی شان دکھاتی ہے۔

دای لب گر دل ز تاب تشنگی نگداز دم

میگساران مست و من مخمور و ساقی غافل است

مخمور مست ہیں، میں شمار زدہ ہوں، اور ساقی غافل ہے۔ ان حالات میں اگر میرا دل پیاس کی تاب لاتے لاتے گداز نہ ہو جائے تو میرے لبوں پر افسوس۔

در خم بند تغافل نالم از بیداد عمر

پردہ ساز فغانم پشت چشم قاتل است

تغافل سے مراد یہاں محبوب کا تغافل ہے، جسے دوسرے مصرعے میں قاتل سے یاد کیا گیا ہے۔ ”پردہ“ کا ایک مفہوم ”سر“ ہوتا ہے، یہاں اسی رعایت سے آیا ہے۔ اور دو معنی دے رہا ہے۔ پردہ ساز فغانم یعنی میری فریاد کے ساز کے سر اور دوسرے میری فریاد کے ساز کا پردہ۔ ”پشت چشم قاتل“ = قاتل کے تغافل کو ظاہر کرتی ہے۔



میں محبوب کے تغافل کا اسیر ہوں اور زندگی کے دکھ اٹھائے جا رہا ہوں، اس فریاد کی تہ میں میرے قائل (محبوب) کا تغافل ہے جو مجھے مار کر زندگی کے دکھوں سے نجات نہیں دلاتا۔

بلکہ ضبط مشق غم فرسودہ اعضا مرا

راز دل از ہمنشینانم نہفتن مشکل است

غموں کو ضبط کرتے کرتے میرے جسم کے تمام اعضاء فرسودہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب میرے لیے ہمنشیوں سے راز دل چھپانا مشکل ہو گیا ہے۔

یعنی میری حالت صاف ظاہر کر رہی ہے کہ میں غم عشق کا مارا ہوا ہوں۔

شہری دل نیست گر حسرت، مرا بجا از چہ رو

چشم اہل دل زبان دان نگاہ سائل است

لغت: ”شہری دل“ = دل کی مکیں۔ دل کے شہر میں رہنے والی۔ اگر حسرت دلوں کی مکیں نہیں ہے تو اہل دل کی آنکھیں کیوں کر حسرت زدہ دلوں (سائل) کی نگاہوں سے ان کے دلوں کا راز پالیتے ہیں۔

ہر ایک دل میں کوئی نہ کوئی حسرت ہوتی ہے، چنانچہ ہر حسرت زدہ انسان کی نظریں دوسرے حسرت زدہ انسان کی نگاہوں سے سمجھ جاتی ہیں کہ یہ کوئی سائل ہے، دل میں کوئی آرزو لیے بیٹھا ہے۔

باہمہ نزدیکی از وی کام دل نتوان گرفت

تھنہ ما بر کنار آب جو پا در گل است

لغت: ”پا در گل“ جس کے پاؤں دلدل میں پھنسے ہوں، مجازاً مجبور و لاچار۔

محبوب کے اتنے قریب ہو کے بھی اس سے دل کے ارمان نہیں نکلتے۔ ہم ایسے پیارے کی طرح ہیں جس کے پاؤں ندی کے کنارے کی دلدل میں پھنس گئے ہیں اور وہ آگے بڑھ کر پانی نہیں پی سکتا۔

در نور گفتگو از آگهی وا مانده ایم

بیچ و تاب رہ نشان دوری سر منزل است

ہم بحثا بحثی میں پڑ کر حقیقت سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتے اور عاجز ہو کر رہ گئے ہیں۔ راستے کے بیچ و خم ہی منزل کی دوری کا نشان ہیں۔

جتنا راستہ پر بیچ ہوتا تا ہی منزل کا فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ حقیقت کے بارے میں بحث و تحقیق، راستے کے بیچ و خم کی طرح ہوتی ہے جو ہمیں منزل آگاہی تک پہنچنے نہیں دیتی۔

عقل در اثبات وحدت خیرہ می گردد چرا

ہر چہ جز ہستی است بیچ و ہر چہ جز حق باطل است

نہ جانے انسانی عقل، وحدت وجود کو تسلیم کرنے میں پریشان کیوں ہے۔ سیدھی بات ہے، جو کچھ ہستی مطلق کے علاوہ ہے، بیچ ہے، اور جو کچھ حق کے علاوہ ہے، باطل ہے۔ وحدت الوجود کے عقیدے کے مطابق، کائنات کی ہر شے کا وجود، وجود حق ہی ہے۔ وہی ذات ہے، باقی کچھ نہیں۔

ما همان عین خودیم اما خود از وہم دوئی

در میان ما و غالب، ما و غالب حائل است



ہم سب ایک دوسرے کا عکس ہیں لیکن دونی کے وہم میں ہر شخص اپنے کو دوسرے سے الگ سمجھتا ہے گویا ہم اور غالب کا تصور حائل ہو گیا ورنہ غالب ہم سے الگ نہیں اور ہم غالب سے الگ نہیں۔



## غزل نمبر (۲۲)

ہم وعدہ و ہم منع، ز بخشش چہ حساب است

جان نیست، مکرر نتوان داد، شراب است

شراب (شراب طہور) کا وعدہ بھی ہے اور شراب سے منع بھی کیا جاتا ہے۔ آخر آپ کی بخششوں کا کیا حساب ہے۔ شراب کوئی جاں تو نہیں کہ دوبار نہیں دی جاسکتی، شراب ہی تو ہے۔

یعنی اگر آخرت میں شراب ملنی ہے تو آج یہاں کیوں ممنوع قرار دی گئی ہے۔

در مژدہ ز جوی غسل و کاخ زمرد

چیزی کہ بدبستگی ارزدمی ناب است

جنت میں شہد کی نہر اور زمرد کے محلات کی خوشخبری میں سے جو چیز دل کو کھینچنے والی ہے، وہ شراب ناب ہے اور بس۔ غالب کا یہ اردو شعر دیکھیں۔

وہ شے کہ جس کے لیے ہو ہمیں بہشت عزیز

سوائے بادۂ گلفام و مشک بو کیا ہے

لہر اسپ کجا رفتی و پرویز کجائی

آتشکدہ ویرانہ و میخانہ خراب است

نعت: ”لہر اسپ“ = کیانی خاندان سے ایران کا ایک بادشاہ۔ کیا کوس کا لڑکا اور گشت اسپ کا باپ۔

”پرویز“ ساسانی خاندانی سے ایران کا بادشاہ۔ خسرو پرویز، شیرین کا شوہر۔

لہر اسپ تو کہاں چلا گیا؟ پرویز تو کہاں ہے؟ آتشکدہ ویران پڑا ہے اور میخانہ خراب اور خستہ حالت میں ہے:

شاعر نے لہر اسپ کو آتشکدہ سے اور خسرو پرویز کو میخانے سے نسبت رکھنے پر خطاب کیا ہے۔ لہر اسپ زردشتی ہونے کے باعث اور خسرو پرویز اپنے قیث کے لیے مشہور ہے۔

از جلوہ بہ ہنگامہ شکلبا نتوان شد

لب تفتہ دیدار ترا خلد سراب است

جلوہ محبوب کو چھوڑ کر جنت کی رونق میں کھوجانے سے تسکین نہیں ہو سکتی۔ تیرے دیدار کے پیاسے کے لیے خلد تو سراب (فریب نظر) ہے۔

با اتھمہ دشوار پسندی چہ کند کس

تا پردہ برانداختہ، در بند حجاب است

خدا تعالیٰ کے بارے میں کہتا ہے: اپنی اتنی دشوار پسندیوں کے باوجود کوئی کیا کرے، جب سے اس شاہد ازلی نے پردہ اٹھایا، نظروں سے اوجھل ہے۔

حسن ازلی نے اپنا جلوہ دکھایا لیکن اس جلوے کے باوجود کوئی اس کو نہیں دیکھ سکتا،



وہ حجاب میں ہے۔

دو شینہ بہ مستی کہ مکیدست لبش را؟

کامروز بہ پیانہ می در شکر آب است

پہلے مصرعے میں ”لبش“ کے لفظ ش کے ضمیر کا مرجع پیانہ ہے۔ کل کس نے مستی کے عالم میں پیانہ سے کو چوسا ہے کہ اس سے آج شراب میں شیرینی آگئی۔ ظاہر ہے کہ شاعر کس کے لفظ میں محبوب کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کے شیریں لبوں نے پیانہ سے کو چوس کر شراب کے ذائقے کو شیریں بنا دیا۔

آن قلزم داغیم کہ برما ز جھنم

چندان کہ قد صاعقہ باران در آب است

ہم محبت کے آتشیں داغوں کا وہ سمندر ہیں کہ ہم پر دوزخ سے جتنے برق کے شعلے گریں یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پانی پر بارش ہو رہی ہے۔  
یعنی ہم دل جلوں پر جہنم کی آگ کا کیا اثر ہوگا۔ اس کے شعلے تو ہمارے لیے بارش کے قطرے ہیں جو ہمیں جلانے کی بجائے ہمیں ٹھنڈک پہنچائیں گے۔

سر گرمی ہنگامہ طامات ندارم

فیضی کہ من از دل ظلم بوی کباب است

لغت: ”طامات“ = جمع طامہ (ممشدہ کے ساتھ) فارسی والوں نے اسے تخفیف کے ساتھ طامہ بنا دیا۔ نام نہاد صوفیہ کی کشف و کرامات کے سلسلے میں پراگندہ اور مبالغہ آمیز باتیں۔  
میرے دل میں پریشان اور مبالغہ آمیز باتوں سے حرارت پیدا نہیں ہوتی۔ میں تو

اپنے دل سے جو فیض حاصل کرتا ہوں وہ بوئے کباب ہے، یعنی میں دل جلا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دل سے بوئے کباب آتی رہے کہ اس میں ایک لذت بھی ہے۔

تا غالب مسکین چہ تمنع برد از تو

بر داشتہ آنچه خود از چہرہ، نقاب است

مسکین غالب تیرے حسن کے جلوے سے کیا لذت اندوز ہو سکتا ہے۔ تو نے اپنے چہرے سے جو کچھ اتار پھینکا ہے، وہ بھی نقاب ہی بن گیا ہے۔  
سارے مظاہر قدرت، حسن ازلی ہی کے مظاہر ہیں۔ وہ ان میں جلوہ گر ہے۔ اس نے اپنے چہرے سے نقاب اتار ڈالا ہے لیکن اس جلوہ گری کے باوجود نظر نہیں آتا گویا اس کا نقاب اتارنا بھی ایک طرح کا نقاب ہی ہے۔



### غزل نمبر (۲۳)

بسکہ از تاب نگاہ تو ز آسودن رفت

بادہ چون رنگ خود از شیشہ بپالودن رفت

تیری نظری تا بانیوں سے شراب تڑپ اٹھی اور اس کی آسودگی جاتی رہی۔ اپنے رنگ کی طرح وہ خود بھی صراحی میں صاف اور پاکیزہ ہو گئی۔

این سفال از کف خاک جگر گرم کہ بود؟

دست شستیم ز صحا کہ بہ پیودن رفت



لغت :- ”سفال“ = جام سفالیں یعنی مٹی کا پیالہ مراد ہے۔

یہ جام سفالیں کس (عاشق) کے جگر گرم کف خاک سے بنا ہوا تھا کہ ہم نے جو شراب اس میں ڈالی، وہ اس نے جذب کر لی اور ہمیں اس شراب سے ہاتھ دھونا پڑا۔

خیز و در دامن باد سحر آویز بہ عذر

گر شب تیرہ بداغ مرثہ نکلشودن رفت

اگر تو نے رات بھر اپنی پلکیں نہیں کھولیں اور تیری ساری سیاہ رات اسی دکھ میں گزر گئی تو اٹھ اور اسی بہانے سے باد سحر کے دامن ہی سے لپٹ جا۔

یعنی رات تو کئی جیسی بھی کئی، اب باد سحر کے دامن ہی سے لپٹ جا۔ یعنی رات تو کئی جیسی بھی کئی، اب باد سحر سے تو تھمت حاصل کر لے۔

ھر چہ از گریہ فشاندم بہ نشردن ریخت

ھر چہ از نالہ رساندم بہ نشودن رفت

ہم نے رونے میں آنسو بہائے وہ سب کے سب بے گئے ضائع ہو گئے اور دل کا جو دکھ درد فریاد کے ذریعے پہنچایا وہ نہ سننے کی نذر ہو گیا۔

یعنی نہ تو کسی نے ہماری اشک فشان کی طرف توجہ کی اور نہ نالہ و فریاد کو سنا۔

ریگ در بادیہ عشق رواں است ہنوز

تا چھا پای درین راہ بہ فرسودن رفت

بیابان عشق کی ریت ابھی تک اسی طرح گرمی اور تیز رفتاری سے رواں دواں ہے۔ اللہ

جانے کتنے پاؤں اس راہ میں گھستے گھستے ختم ہو گئے۔

ہزاروں بد نصیب رہروان عشق وحشت و جنوں کے عالم میں صحرا نور دی کرتے کرتے مر گئے لیکن بیابان عشق کا دم خم ابھی وہی ہے۔ اس کی ریت ویسی ہی گرم اور رواں ہے۔ اس میں فرق نہیں آیا۔

باخت از بسکہ زلیخا بہ تماشای تو رنگ

از حیا بر در زندان بہ گل اندودن رفت

زلیخا تیرے جلوے کو دیکھ کر اپنا رنگ کھو بیٹھی چنانچہ شرم سے قید خانے کے دروازے کی مٹی (کا ہگل) سے لپائی کرنے کے لیے چلی گئی۔

غالب کے محبوب کا جلوہ دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا (زرد پڑ گیا) چنانچہ اس نے جہاں یوسف کے قید خانے میں سفیدی کروائی تھی وہاں اب مٹی کی لپائی کرنے لگی کہ اس کا رنگ زرد ہوتا ہے۔

بر تنک مائیگی ام رحم کہ یک عمر گناہ

ہم بہ تاراج سبکدستی بخشودن رفت

لغت :- ”تنک مائیگی“ = تنگدستی۔ ”سبک دستی“ ہاتھوں کی چستی، مہارت، سبکدستی، بخشودن، بڑی تیزی اور صفائی سے بخشا۔ میری تنگدستی قابل رحم ہے کہ میرا سارا سرمایہ یہ گناہوں بھری زندگی تھی، وہ خداے پاک کے ماہر انداز بخشش نے لوٹ لی۔

مرزا غالب کا سرمایہ حیات گناہ تھے، وہ اللہ کی بخشش کی نذر ہو گئے اور مرزا خالی ہاتھ رہ گئے۔ شاعر نے اس شعر میں اپنے گناہوں کا اعتراف اور ان پر ناز کرنے اور پھر اپنے پروردگار



کی وسعت کرم کو نہایت فنکارانہ مہارت سے بیان کیا ہے۔ یہ شعر غالب کے نہایت بلیغ اشعار میں سے ہے۔

داغِ تردستی اشکم کہ ز افسردن دل

ھر چه در گریہ فزودیم در افزودن رفت

لغت: ”تردستی“ = چستی و چالاکی۔ ”داغ“ = چننا۔

میں اپنے آنسوؤں کی چستی اور چالاکی سے جل کر داغ ہو گیا ہوں کہ دل کی افسردگی کے باعث رونے میں جتنا اضافہ کیا وہ اضافہ کرنے میں ضائع ہو گیا۔

شاعر نے آنسوؤں کے تیزی سے بہنے کو ان کی تردستی کا نام دیا ہے۔ عاشق کا دل افسردہ ہے اور افسردگی کے باعث آنسو بھی اس روانی سے بہتے ہیں۔ جب آنسوؤں میں اضافے کی کوشش کی گئی تو چند آنسو جو تھے وہ اس آنسو بڑھانے کی کوشش میں صرف ہو گئے۔

شست و شو مشغلہ شوخی ابر کرم است

دژم آن خرقہ کہ با داغِ نیالودن رفت

اللہ تعالیٰ کے ابر کرم کا ایک شوخ مشغلہ ہے کہ وہ گنہگاروں کے دامن سے گناہوں کے داغ دھو ڈالتا ہے۔ ایسی صورت میں اس خرقے کی حالت کتنی افسوس ناک ہے کہ جس پر کوئی ایسا داغ نہ پڑا اور وہ خرقہ اس داغ سے آلودہ نہ ہونے کی کوشش ہی میں ختم ہو گیا۔

مدعی خواست رود بر اثر من غالب

ھر چه زو بود بہ سودایِ چو من بودن رفت

لغت: ”مدعی“ = حریف، مقابل ”بر اثر کسی رفتن“ = کسی کی پیری یا نقل کرنا۔

میرے حریف نے چاہا کہ وہ میری پیروی کرے۔ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ میرے جیسا بننے کی کوشش میں جاتا رہا۔

غالب کے حریف اس کے مقابل تو نہ ہو سکے لیکن کوشش کرتے کرتے جو کچھ پونجی اپنے پاس تھی وہ بھی گنوا دی۔



### غزل نمبر (۲۳)

نگہ بہ چشمِ نھان و بہ جبہ چمن پیدا است

شگرفنی تو ز اندازِ مھر و کین پیدا است

لغت: ”شگرف“ = عجیب ”شگرفنی“ = عجوبہ پن۔ ”جبہ“ = پیشانی۔

تیری نگاہیں آنکھوں ہی میں رہ گئی ہیں لیکن پیشانی پر تیوری چڑھی ہوئی ہے۔ تیرا عجوبہ پن تیرے پیار اور تیرے غصے کے انداز سے معلوم ہو جاتا ہے۔

معتوق ایک طرف تو نظریں چھپا چھپا کے عاشق کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے جس سے پیار نکلتا ہے۔ دوسری طرف اس کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے ہیں جو غصے کی علامت ہے۔ معتوق کے دو قسم کے تیور جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس کی طبیعت کی عجیب افتاد کو ظاہر کرتے ہیں۔

نظارہ عرضِ جمالت ز نو بہار گرفت

شکوہ صاحبِ خرمن ز خوشہ چمن پیدا است



ہماری نظروں نے تیرے حسن و جمال کا اندازہ بہار سے کر لیا۔ خوشہ چیں سے خرمن کے (جہاں سے خوشہ چینی کی گئی ہے)۔ مالک کی شان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بہار کیا ہے؟ حسن و شباب کا مجسمہ ہے۔ اسی سے معشوق کے حسن کا سراغ ملتا ہے۔ عاشق کی نظریں اُسی سے خوشہ چینی کر لیتی ہیں۔

رسید تیغ تو ام بر سر و ز سینہ گذشت

زہی شگفتگی دل کہ از جبین پیدا است

تیری تلوار تو میرے سر پر لگی لیکن یہ محسوس ہوا کہ سینے سے گزر گئی ہے۔ ہمارے دل کی شگفتگی کے کیا کہنے کہ اس کا اندازہ ہماری پیشانی سے ہو رہا ہے۔

بجرم دیدہ خون بار کشتہ ای ما را

ترا ز دامن و ما را ز آستین پیدا است

تو نے ہمیں اس جرم میں مار ڈالا کہ ہماری آنکھوں سے خون کے آنسو بہ رہے تھے۔ یہ بات دو چیزوں سے ظاہر ہو گئی۔ تمہارے دامن سے کہ اس پر ہمارے خون کے دھبے پڑے ہیں اور ہماری آستیں سے کہ جس سے ہم اپنے اشک خوں پونچھتے رہے۔

زہی لطائف پرداز سعی ابر بہار

کہ ہر چہ در دل باد است از زمین پیدا است

ابر بہار کی حسین کوششوں کی لطافت اور پرداخت، سبحان اللہ! جو کچھ ہوا کے اندر (دل) میں ہے وہ زمین سے ظاہر ہو رہا ہے۔

موسم بہار کے بادلوں سے مینہ برس رہا ہے، ہوا میں تازگی آگئی ہے اور اس سے زمین میں رنگارنگ پھول اُگ آئے ہیں اور اپنی رعنائیاں دکھا رہے ہیں۔

فتیلہ رگ جان سر بسر گداخته شد

ز بیچ و تاب نفس حائی آتشین پیدا است

لغت: "نفس ہائی آتشین" = آتشیں آہیں اور فریادیں۔

ہماری آتشیں آہیں اور فریادیں صاف بتا رہی ہیں کہ ہماری رگ جاں جو فتیلے (حق) کی طرح ہے، جل جل کر گداز ہو گئی (اور وہیں سے یہ آگ ابھر رہی ہے) عاشق کی جان انہی فریادوں کی نذر ہو گئی۔

نفس گداختن جلوہ در ہوائی قدش

ز خوی فشانی آن روی نازنین پیدا است

لغت: "خوے" = اس میں واو، واو معدولہ ہے یعنی بولی نہیں جاتی۔ خوی کوٹی پڑھتے ہیں اس کے معنی پسینہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قدرِ عنا کی فضا میں جلوہ حسن خود گداز ہو گیا ہے چنانچہ یہ بات معشوق کے نازنین چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے کہ جس سے پسینہ ٹپک رہا ہے۔

عیار فطرت پیشیان ز ما خیزد

صفای بادہ ازین درد تہ نشین پیدا است

لغت: "عیار فطرت" = فطرت کا خالص پن۔ "درد" = تھمت، وہ میل جو تہ میں بیٹھ جاتا ہے۔



ہماری ہی وجہ سے متقدمین (ہم میں سے پہلے بزرگوں) کا معیار فطرت نمایاں ہوتا ہے۔ ہم وہ درود تہ نشیں ہیں کہ جس سے شراب کی پاکیزگی کا سراغ ملتا ہے۔

مرزا غالب قدیم استادان فن کے مقابلے میں اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ ہمارے بزرگ شراب ناب تھے ہم تلچٹ ہی سہی، ہمیں ان سے یک گونہ نسبت ہے۔ لوگوں کو یہ تو پتا چلتا ہے کہ ہم کن کے جانشین ہیں۔

ز ہی شکوہ تو کاندہ طراز صورت تو

ز خود بر آمدن صورت آفرین پیدا است

تیرے حسن کی شان و شکوہ کے کیا کہنے! کہ تیری صورت کے سنوارنے میں، تیرا صورت آفریں (خالق) اپنے آپ سے باہر آ گیا۔

یعنی تیری صورت سے تیری صورت کو پیدا کرنے والے کا سراغ ملتا ہے۔

نهاد نرم ز شیرینی سخن غالب

لسان موم ز اجزای انگبین پیدا است

لغت: ”انگبین“ = شہد۔

اے غالب! کلام کی شیرینی سے ہماری فطرت کی نرمی اور لطافت اسی طرح معلوم ہو جاتی ہے جس طرح موم کا سراغ شہد کے اجزا سے مل جاتا ہے۔



## غزل نمبر (۲۵)

گر بار نیست سایہ خود از بید بودہ است

باری بگو کہ از تو چہ امید بودہ است

لغت: ”بار“ = پھل۔

کہتے ہیں کہ سرو کی طرح بید کے درخت کو پھل نہیں لگتا۔ معشوق سے کہتا ہے: اگر بید پھل نہیں دیتا تو اس کا سایہ تو ہوتا ہے (انسان اسی سے فیض حاصل کرتا ہے) تمھی بتا دو کہ ہمیں تم سے کیا امید ہے (نہ پھل ہے نہ سایہ)

شادم ز درد دل کہ بمغز شکلیب ریخت

نو میدئی کہ راحت جاوید بودہ است

میں اپنے درد دل سے خوش ہوں کہ اس نے صبر و شکیب کے مغز میں وہ ناامیدی اور مایوسی پیدا کر دی ہے کہ وہ میرے لیے ہمیشہ رہنے والی راحت بن گئی ہے۔

انسان کو دکھ اس وقت ہوتا ہے جب وہ کوئی امید لگائے ہوئے ہو اور وہ امید پوری نہ ہو۔ جب مایوسی کا عالم طاری ہو جائے تو طبیعت کو ایک سکون حاصل ہو جاتا ہے۔

ظالم ہم از نهاد خود آزار می کشد

بر فرق ازہ تشدید بودہ است

لغت: ”نہاد“ = وجود۔ ”فرق“ = سر۔ ”ازہ“ = آرا۔

”تشدید“ = دو ایک جیسے حرفوں کو ملا کر پڑھنا تشدید کہلاتا ہے جیسے لفظ ”ازہ“ میں



ر کا حرف۔ تشدید کی نشانی ”۔“ ہوتی ہے جس میں آرے کی طرح دندانے ہیں۔ گویا آرے کے سر پر ایک اور راہ ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ظالم کو اپنے وجود ہی سے ظلم کی سزا مل جاتی ہے۔ دیکھ لو آرے کے سر پر تشدید ہے (جو آرے کی طرح اس پر چل رہی ہے)

شہما کند ز روی تو در یوزہ ضیا

مہ کاسہ گدائی خورشید بودہ است

چاند، راتوں کو تیرے چہرے سے کب ضیا کرنا رہتا ہے۔ (تیرے چہرے سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے) یہ چاند کیا ہے۔ سورج سے روشنی مانگنے کا کاسہ ہے (کاسہ گدائی)۔ معشوق کے روئے درخشاں کو سورج سے تشبیہ دی ہے۔ گویا چاند اس کے آگے بیچ ہے۔

تلخ است تلخ رشک تمنای خویشتن

شادم کہ دل ز وصل تو نو مید بودہ است

لغت: ”نومید“ = ناامید۔

عاشق کو اپنی تمنا پر بھی رشک آتا ہے اور رشک سے دکھ ہوتا ہے لیکن کہتا ہے کہ میں خوش ہوں کہ میرا دل تیرے وصل سے ناامید ہو چکا ہے۔ اس کی تمنا جاتی رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی مجھے رشک تمنا کی تلخیوں سے نجات مل گئی ہے۔

در ماہ روزہ طرہ پریشان چہ می روی

می خور کہ در زمانہ شب عید بودہ است

لغت: ”طرہ پریشان“ = وہ شخص جس کے بال بکھرے ہوئے پریشان ہو۔ پریشان حال۔ روزوں کے مہینے میں یہ پریشان حالی کیسی؟ شراب پی کہ دنیا میں ایک چیز شب عید بھی ہوتی ہے۔

از رشک خوش نوائی ساز خیال من

مضرب نی بناخن ناہید بودہ است

لغت: ”ناہید“ = ایک سیارہ ہے، اسے اہل یونان رقص و نغمہ سے منسوب کرتے ہیں۔ اسے زہرہ اور رقصہ فلک بھی کہا جاتا ہے۔

”مضرب“ = زخم۔ وہ چھلا جسے انگلی میں پہن کر ساز بجایا جاتا ہے۔ ”نئے“ بانسری۔ میرے تخیل کے ساز سے وہ نغمے ابھرتے ہیں جن کے انداز خوش نوائی پر زہرہ کو بھی رشک آتا ہے اور وہ اپنے ناخن میں مضرب نے پہن لیتی ہے۔

”مضرب نے“ کے استعمال سے شاعر نے یہ لطیف اشارہ بھی کیا ہے کہ ناہید کی نوا درد بھری ہوتی ہے۔

ہر گونہ حسرتی کہ ز ایام می کشیم

درد تہ پیالہ امید بودہ است

لغت: ”درد تہ“ = وہ تلچھت یا میل جو پیالے یا صراحی کے نیچے بیٹھ جاتا ہے۔ زمانے کے ہاتھوں جو حسرت ہمارے دل میں رہ جاتی ہے، وہ ہمارے پیالہ امید کی تلچھت ہوتی ہے۔

انسان کی مایوسیاں، اس کی امیدوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جتنی امیدیں کم ہوں گی اتنی



ہی مایوسیوں کی درد کم ہوگی۔

حق را ز خلق جو کہ نو آوز دید را

آئینہ خانہ مکتب توحید بودہ است

لغت: ”نوآموز“ = وہ شخص جس نے کسی کام کے سیکھنے کی ابتدا کی ہو۔ مبتدی۔

مخلوق ہی میں خالق کو تلاش کر کیونکہ نیا نیا نگارہ کرنے والے کے لیے آئینہ خانہ ہی مکتب توحید ہوتا ہے۔

یہ کائنات ایک آئینہ خانہ ہے جس میں ہستی مطلق کے ہزاروں لاکھوں عکس نظر آتے ہیں۔ توحید کے راز کے سمجھنے والے کے لیے اس میں بڑی آسانی ہے۔ وہ اس کثرت میں وحدت کے موجود ہونے کو پالیتا ہے۔ گویا یہ اس کے لیے مکتب توحید ہے۔

نادان حریف مستی غالب مشو کہ او

دردی کش پیالہ جمشید بودہ است

لغت: ”جمشید“ ایران کا ایک پر شکوہ شہنشاہ جس کے نام پہ جام جم مشہور ہے۔ اس جام جمشید کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ جب اسے گھماتے تھے تو اس میں آنے والے واقعات کا عکس نظر آتا تھا۔

اے نادان تو غالب کی مستی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ تو جام جمشید کی درد تک کا پی جانے والا ہے۔ یعنی غالب کی مستی خم کے خم پینے سے ہوئی ہے۔



غزل نمبر (۲۶)

یار در عہد شبابم بہ کنار آمد و رفت

ہچو عیدی کہ در ایام بہار آمد و رفت

میرا محبوب عہد شباب میں، میرے آغوش میں آیا اور چلا گیا، اس عید کی طرح کہ فصل بہار میں آئی اور چلی گئی۔

تا نفس باخیز پیروی شیوہ کیست

تند بادی کہ بہ تاراج غبار آمد و رفت

لغت: ”تند باد“ = تیز ہوا، آندھی (کا طوفان)۔

”نفس باخیز“ = جس کا سانس اکھڑا ہوا ہو، خصوصاً تیزی سے چلنے سے۔

”تا“ = یہ لفظ ایسا ہے کہ اس کا متبادل اردو ترجمہ مشکل ہے۔

”تا“ کا یہاں استعمال روزمرہ کا ہے اور محض زور بیان کے لیے آیا ہے۔ یہ ہوا کا طوفان جو خس و خاک (غبار) کو اٹھالے جانے کے لیے آیا اور چلا گیا، آخر کس کے انداز و ناز کی پیروی کی کوشش میں اپنے حواس کھوئے ہوئے ہے۔

تند باد کا استعارہ محبوب کے لیے آیا ہے، یعنی یہ آندھی کا طوفان، محبوب ہی کے انداز طبیعت کا مظہر ہے۔ یوں کہیے کہ وہ معشوق کیا ہے، ایک تند باد ہے جس کے طوفان میں ہزاروں چاہنے والے غبار کے طرح اڑ جاتے ہیں۔



بسجہ گردان اثرهای وجود است خیال

هر چه گل کرد تو گوئی بشمار آمد و رفت

لغت: "بسجہ" = تسبیح۔ "سجہ گرداں" = تسبیح پھیرنے والا "گل کردن" = ظاہر ہونا۔

"اثر" = ایک معنی نشان ہے، جمع آثار۔ اس شعر میں وہی قدیم مرہجہ نظریہ وجود کائنات کا تذکرہ ہے کہ اس کائنات کا وجود خیالی ہے۔ کہتا ہے:

انسان کا وہم و خیال ہی وجود کائنات کے نشانوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح شمار کرتا چلا جا رہا ہے۔ جو شے سامنے آئی (گل کرد) اسے شمار کر لیا اور وہ غائب ہو گئی۔

عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

طالع بکل مابین کہ کمان دار زپی

پارہ بر اثر خون شکار آمد و رفت

ہمارے بکل کا نصیب دیکھو کہ شکاری کہاں اٹھائے ہوئے پیچھے سے شکار کے خون کے نشان زمین پر پڑے دیکھ کر اس کی طرف آیا اور پھر لوٹ گیا۔

یہاں طالع کا لفظ طنز آ یا ہے، یعنی بد نصیبی۔

عاشق، محبوب کا زخم خوردہ ہے لیکن محبوب کو اس کی پروا نہیں۔ عاشق بد نصیب کی حالت اس بکل کی طرح ہے کہ شکاری اس کے خون کے نشان کے سراغ پر اس کی طرف تیر کمان اٹھائے ہوئے آئے اور پھر دیکھے کہ شکار تو وہی ہے، وہیں اس کو چھوڑ جائے۔

شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از یک دگر اند

روز روشن بہ وداع شب تار آمد و رفت

خوشی ہو یا غم سب ایک دوسرے سے بڑھ کر آوارہ مزاج ہیں۔ روز روشن کو دیکھو، سیاہ رات کو رخصت کرنے کے لیے آیا اور چلا گیا۔

ہرزہ مشاب و پی جادہ شناسان بردار

ای کہ در راہ سخن چون تو ہزار آمد و رفت

یوں ہی تیز رفتاری نہ دکھا، رستے سے واقف لوگوں کے نقش قدم پر چل۔ تجھ سے پہلے اس راہ سخن میں تیرے جیسے ہزاروں آئے اور چلے گئے۔

برق تمثال سراپای تو می خواست کشید

طرز رفتار ترا آئینہ دار آمد و رفت

لغت: "آئینہ دار" = سنگھار کرتے وقت جو عورت سامنے آئینہ لے کے بیٹھتی تھی، آئینہ دار کہلاتی تھی۔ مجازاً آئینہ دار اسے کہتے ہیں جو کسی دوسرے کا نمونہ پیش کرے۔

برق نے تیرے سراپا کی تصویر کھینچنا چاہی، وہ صرف تیری رفتار کی صورت (کا نمونہ) پیش کر سکی اور چلی گئی۔ گویا معشوق کی رفتار چشمک برق ہے کہ آنکھوں کے سامنے آتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ عاشق، دیدار کے پیاسے، ترستے رہ جاتے ہیں۔

غالب:

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا

حلقہ غافل ز بھاران چہ طمع داشتہ

گیر کامسال بہ رنگینی یار آمد و رفت



لغت: ”بلہ“ = حرف تنبیہ۔

اے غافل بہاروں سے تجھے کیا توقع ہے۔ یہ سمجھ لے کہ اس سال وہ حسن یار کی رنگینیوں کے انداز میں آئی تھی اور چلی گئی۔

بہ فریب اثر جلوہ قاتل صد بار

جان بہ پرواگی شمع مزار آمد و رفت

عاشق کے مزار پر شمع جل رہی ہے۔ تصور ہوتا ہے کہ یہ جلوہ قاتل ہے۔ عاشق جو اس قاتل کے ہاتھوں قتل ہوا ہے، بار بار دھوکا کھاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ شمع نہیں جلوہ قاتل ہے۔ اس کی روح قبر سے کئی بار باہر نکل کر آئی اور پروانہ دار اس شمع پر قربان ہو کر چلی گئی۔



### غزل نمبر (۲۷)

اختری خوش تر از نیم بھان می بایست

خرد پیر مرا بخت جوان می بایست

لغت: ”انسانی قسمتوں کو چونکہ ستاروں سے وابستہ کیا جاتا ہے اس لیے شعر میں ”

اختر“ کا لفظ ستارہ قسمت ہی کا مفہوم دے رہا ہے۔ میرا ستارہ قسمت اس دنیا میں اس سے بہتر ہونا چاہیے تھا۔ اے عقل پیر (تو تو مجھے مل گئی) میرا نصیب تو جواں ہونا چاہیے۔

بہ زمینی کہ باہنگ غزل نشینم

خاک گل بو و ہوا مشک فشان می بایست

جس سر زمین میں غزل گوئی کے لیے آمادہ ہوتا ہوں، وہاں کی خاک پھولوں کی طرح معطر اور ہوا مشک فشاں ہونی چاہیے۔

برنتابم بہ سیو بادہ ز دور آوردن

خانہ من بسر کوی مغان می بایست

میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے لیے شراب کسی دور جگہ سے آئے۔ میرا گھر تو کوئے مغان کی گلی میں ہونا چاہیے۔

بہ گرایش خوشم، اما بہ نمائش خوارم

پرسشی چند زیارم بہ زبان می بایست

لغت: ”گرایشین“ = مائل ہونا۔ اسی سے گرایش حاصل مصدر ہے اور میلان و رغبت کا مفہوم دیتا ہے۔

کہتا ہے کہ میں محبوب کی ظاہر رغبت سے خوش ہوں، لیکن چونکہ اس میں نمائش کا پہلو ہے اور یہ محض دکھاوے کے لیے ہے۔ اس لیے میں اسے اپنے لیے ذلت خیال کرتا ہوں۔ کبھی تو وہ اپنی زبان سے میرا حال احوال پوچھے۔

تاب مہرم نکند خستہ دلی در رہ شوق

روی گرمی ز رفیقاں بمیان می بایست



شوق کی راہ میں کوئی خستہ دل انسان، میری بے تابی محبت کی تاب نہیں لاسکتا۔ ایسے سفر میں تو گرم رو رقیق ہمراہ ہونے چاہئیں جن کے چہروں سے محبت کی گرم جوشی نکلتی ہو۔ (تاکہ ہم پورے ذوق و شوق سے قدم اٹھائیں)۔

نرسد نامہ در اندیشہ سبب حساست بسی

پرس وجوی ز عزیزان بگمان می بایست

محبوب کا خط نہیں آتا۔ اس سلسلے میں میرے ذہن میں بہت سے گمان ابھرتے ہیں۔ (کہ یہ سبب ہوگا، وہ سبب ہوگا) چنانچہ اس گمان کی حالت میں ہمارے عزیزوں سے کچھ پوچھ گچھ ہونی چاہیے۔

ہر زہ دل بر در و دیوار نھادن نتواں

سویم از رو زنہ چشمی نگران می بایست

محبوب کے در و دیوار پر یونہی بے فائدہ نظریں جمائے بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں۔ چاہیے کہ دیوار کے روزن سے کوئی ہمیں جھانک بھی رہا ہو۔

یعنی محبوب ذرا سے التفات سے تو کام لے۔

ساز هستی کنم و دل بہ فسوم گیرد

ہم در اندیشہ خدگم بہ نشان می بایست

لغت "فسوس" = افسوس کا مخفف ہے۔

"دل بہ فسوم گیرد" میرے دل کو افسوس ہوتا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ زندگی کا سامان

کرتا ہوں اور خود ہی دل گرفتہ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ آخر میرے تصور میں کوئی مقصود ہونا چاہیے کوئی ایسا تیر تو ہو جو نشانے پہ بیٹھنے والا ہو، یونہی بلا مقصد غلط امیدوں کے گھروندے بنانے سے کیا فائدہ۔

یا تمنای من از خلد برین نہ گزشتی

یا خود امید گھی در خور آن می بایست

یا تو میری تمنا خلد بریں سے آگے نہ جاتی یا پھر اس بلند تمنا کے مناسب کوئی بلند امید گاہ ہونی چاہیے تھی۔

انسان کی منجائے نظر جنت ہے۔ مرزا غالب کی بلند نظر اس سے آگے پڑتی ہے اور آگے کوئی مقام نہیں۔ اب یا تو یہ وسیع ظرف عطا نہ کرتا جس کی نظر میں خلد نہیں چلتا یا اس بلند نظری کے مناسب کوئی خلد سے بڑھ کر مقام ہونا چاہیے جس پر انسان نظر جمائے۔

غالب:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

کم نظر لوگ خلد و طوبیٰ ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس شعر کو دیکھیے، یہ پہلے آچکا ہے:

بی خود بزمیر سایہ طوبیٰ غنودہ اند

بہر رھروان تمنا بلند نیست

تا تنگ مایہ بہ دریوزہ خود آرا نشود

نرخ پیرایہ گفتار گران می بایست

لغت: "پیرایہ" = آرائش و زینت، حسن انداز۔



آراستگی کلام کا زرخ ذرا گراں ہونا چاہیے تاکہ کم مایہ لوگ اسے لے کر (اس کی بھیک مانگ کر) اپنے آپ کو اس سے سنوار نہ لیں۔  
کلام اتنا بلند ہونا چاہیے کہ دوسرے کم مایہ لوگ اس کی نقل کر کے اس پر فخر نہ کر سکیں۔

قدر انفاس گرم در نظر استی غالب

در غم دھر در غم بہ فغان می بایست

لغت: "انفاس" = سانس "گرم" = اگر۔ "م" جو گر کے بعد ہے وہ نظر کے ساتھ ہے اور اضافی ہے یعنی نظر میں۔ "قدر" = قدر و قیمت۔ "قدر انفاس" = انسانی سانس کی قدر و اہمیت۔

غالب اگر میری نظر میں ان سانسوں کی کوئی قدر و قیمت ہے تو میں جو دینا کے غم میں پڑ کر ان سانسوں سے فریاد کرتا رہا ہوں اس پر افسوس کرنا چاہیے۔ ان قیمتی سانسوں کو غم دنیا میں صرف کرنا افسوسناک امر ہے۔



## غزل نمبر (۲۸)

از فرنگ آمدہ در شہر فراوان شدہ است

جرعہ را دین عوض آریدی ارزان شدہ است

لغت: "فرنگ" = اصل میں فرنگ تھا اور فرانس کے لیے آتا تھا۔ فارسی میں کافی فارسی یعنی گ کے ساتھ آتا ہے۔ لغت عام میں یورپ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ شراب کا تذکرہ ہے، کہتا ہے:

یہ فرنگ سے آئی اور شہر میں کثرت سے ملتی ہے۔ اس کے ایک جرعے کے لیے دین لے آؤ کہ سستی ہو گئی ہے۔ شعر میں گہرا طنز ہے یعنی تہذیب فرنگ بغیر دین بیچے حاصل نہیں ہو سکتی۔

چشم بد دور چہ خوش تیم امشب کہ بروز

نفس سوختہ در سینہ پریشان شدہ است

اللہ نظر بد سے بچائے، میں آج رات اس مزے سے جل رہا ہوں کہ دن کے وقت میرے سینے میں جلا ہوا سانس پریشان ہو رہا ہے۔ (کہ وہ جلنے کی لذت کہاں گئی)

در دلش جوئی و در دیر و حرم نشناسی

تاچہ روداد کہ در زاویہ پنہان شدہ است

تو اسے دل میں ڈھونڈ رہا ہے اور دیر و حرم میں اسے نہیں پہچانتا، آخر کیا بات ہو گئی کہ وہ ایک گوشے میں آ کے چھپ گیا ہے۔

خدا ہر جگہ موجود ہے۔ دیر ہو کہ حرم سب جگہ وہی جلوہ گر ہے۔ پھر اس کو محض دل میں محصور کر لینا کیسا؟

لب گزد یخود و با خود شکر آبی دارد

تاچہ گفت است کہ از گفتہ پشیمان شدہ است

محبوب یخودی کے عالم میں اپنے لب کاٹ رہا ہے۔ در آن حالیکہ اس کے پاس آب شیریں ہے۔ (شیریں لب) اس نے کیا کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے کبے پر پشیمان ہو رہا ہے۔



داغم از مور و نظر بازی شوقش بہ شکر

کش بود پویہ بدان پای کہ مژگان شدہ است

لغت: "پویہ" = تیز تیز چلنا۔

چیونٹی میٹھی چیز (شکر) کی طرف بڑے شوق سے لپکتی ہے شاعر نے اس کی نازک  
ناٹوں کو مژگان کہا ہے گویا وہ اپنی محبوب چیز یعنی شکر کی طرف آنکھوں کے بل چلتی ہے۔ چنانچہ  
اسے چیونٹی کا یہ ذوق و شوق دیکھ کر رشک آتا ہے۔

مرزا غالب نے شوق کے ساتھ نظر بازی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ دو اعتبار  
سے، ایک تو یہ کہ وہ کتنی دور سے شکر کو دیکھ لیتی ہے اور دوسرے یہ کہ آنکھوں کے بل چل کر ادھر  
کو جاتی ہے۔

گفتم البتہ زمن شاد بمرдон گردی

گفت دشوار کہ مردن بتو آسان شدہ است

لغت: "البتہ" = فارسی میں تاکید کے لیے آتا ہے۔

میں نے محبوب سے کہا یقیناً تو میرے مرجانے سے خوش ہوگا۔ اس نے جواب دیا،  
نہیں، میرا خوش ہونا دشوار ہے اس لیے کہ تو آسانی سے مر رہا ہے (میں تو تجھے ترپتا ہوا دیکھنا پسند  
کرتا ہوں) دوسرے مصرعے کا ایک اور معنوی پہلو یہ بھی ہے کہ محبوب نے کہا کہ یہ بات مشکل  
ہے کہ مرنا تیرے لیے اتنا آسان ہو گیا ہے۔

درد روغن پچراغ و کدر می بہ ایام

تا خود از شب چہ بجا ماند کہ مہمان شدہ است

رات بھر محفل میں چراغ جتا رہا، تیل ختم ہو گیا، صرف تھوڑا سا میل رہ گیا ہے اور  
پیالے میں صرف تھوڑی سی تلچھت باقی ہے۔ اب رات کے ساز و سامان میں سے باقی رہ گیا  
گیا ہے کہ وہ محبوب بن کر آ گیا ہے۔

"تا خود از شب چہ ماند" کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اب رات بھی گزرنے والی ہے،  
اب وہ آیا تو کیا آیا۔

شاہد و می زمین رفتہ و شادم بہ سخن

کشتہ ام بید درین باغ کہ ویران شدہ است

معشوق اور شراب دونوں نہیں رہے اور میں شعر و سخن سے خوش ہوں۔ میں نے بید  
بویا ہے اور ایک ایسے باغ میں بویا ہے جو ویران ہو چکا ہے، یعنی میں ایسے دور میں مشق سخن کر  
رہا ہوں جو زوال زدہ ہے۔

شہر تم گر بہ مثل ماندہ گردو، بنی

کہ بر آن ماندہ خورشید نمکدان شدہ است

اگر میری شہرت، مثال کے طور پر، دسترخوان کی صورت اختیار کر لے تو اس دسترخوان پر  
خورشید کی حیثیت ایک نمکدان کی ہوگی۔

یعنی میری شخصیت کی عظمت کے آگے کائنات کی بڑی سے بڑی شے کیا حیثیت رکھتی ہے۔

غالب آزرده سروشی است کہ از مستی قرب

ہم بدان وحی کہ آزرده غزل خوان شدہ است



لغت: ”سروش“ = فروغ، فیضی اصل میں اس فرشتے کو کہتے تھے جو ایران کے قدیم پیغمبر زرتشت کے پاس وحی لے کر آتا تھے۔ جبریل۔

غالب وہ آزرده حال فرشتہ ہے کہ اس قرب مقام سے اتنا بدست ہو گیا ہے کہ جو وحی وہ لے کر آیا تھا اسی کو غزل خوانی کا رنگ دے دیا۔

گویا مرزا غالب کی شاعری بمنزلہ وحی کے ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریح خامہ نوائے سروش ہے

اس شعر میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ مرزا غالب کے لیے شاعری اور غزل گوئی اس کی اصل شخصیت کی عظمت کے آگے حقیر ہے۔



## غزل نمبر (۲۹)

فغان کہ برق عتاب تو آنچنانم سوخت

کہ راز در دل و مغز اندر استخوانم سوخت

الامان! تیری برق عتاب نے مجھے اس طرح جلا دیا کہ دل کا راز دل میں جل کر رہ گیا اور میری ہڈیوں کا مغز تک جل گیا۔

محبوب کے غصے کی آگ نے تن بدن کو جلا دیا۔

شنیدہ کہ باتش نہ سوخت ابراہیم

بہ بین کہ بی شرر و شعلہ می توانم سوخت

تو نے سنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ آگ میں نہیں جلے تھے۔ مجھے دیکھ کہ میں بغیر شعلہ کے جل سکتا ہوں۔ (یا مجھے بغیر شرر اور شعلے کے جلایا جاسکتا ہے)۔

محبت کی آگ میں چنگاریاں اور شعلے نہیں ہوتے لیکن عاشقوں کو جلا دیتی ہے۔

شرار آتش زردشت در نھادم بود

کہ ہم بہ داغ مغان شیوہ دلبرانم سوخت

لغت: ”زردشت کے پیر و کار آتش پرست ہوتے ہیں۔ ان کے معبدوں میں ہمیشہ آگ جلتی رہتی ہے۔ مغان (مغ کی جمع) آتش پرستوں کے لیے آتا ہے چونکہ ان کے یہاں شراب پینا جائز تھا اس لیے مغان کا لفظ نئے سازوں اور نئے خواروں کے لیے استعمال ہونے لگا اور فارسی اور اردو شاعری میں ایک علامت بن گیا۔ ”پیر مغان“ پیر مغانہ بھی ہے اور پیر طریقت بھی۔ ”نہاد“ = طینت، فطرت ”مغان شیوہ دلبران“ ایسے محبوب جن کا شیوہ مغان کا سا ہے۔ کافرانہ ناز و ادا رکھنے والا۔

زرتشت کی آگ کی چنگاریاں میری طینت میں بھی تھیں۔ یہی وجہ ہے میں مغان شیوہ دلبروں کے داغ محبت ہی سے جل گیا۔

آگ میری طینت میں تھی، ذرا سے داغ نے جلا ڈالا۔

عیار جلوہ نازش گرفتن ارزانی

ہزار بار بہ تقریب امتحانم سوخت



لغت: ”ارزانی“ = گرانی کی ضد تھا، پھر اس کے معنی ارزاں یا کم بہا کے ہو گئے  
 ”عیار“ جانچنا اندازہ کرنا۔ جانچ اور پرکھ عیار گرفتن پر کہنا۔

میں نے محبوب کے جلوہ ناز کو معمولی سمجھا تھا چنانچہ میں اس امتحان میں ہزار بار جل گیا۔ محبوب کے جلووں کی تاب لانا کوئی آسان کام نہیں، جو سامنے آتا ہے جل جاتا ہے۔

مرا دمیدن گل در گمان فگند امروز

کہ باز بر سر شاخ گل آشیانم سوخت

آج جب سرخ سرخ پھول کھلے تو مجھے ایسا گمان ہوا کہ شاخ گل پہ میرا آشیانہ  
 جل رہا ہے۔ سرخ پھولوں کو جلتے ہوئے آشیانے سے تشبیہ دی ہے۔

ز گلفروش نالم کز اهل بازار است

تپاک گرمی رفتار باغبانم سوخت

لغت: ”تپاک“ = بخار (گرجوشی)

میں گلفروش سے نالاں نہیں ہوں کہ وہ اہل بازار ہے (اس کا کیا شکوہ)۔ مجھے تو باغبان  
 کی گرمی رفتار کی تپش نے جلا دیا ہے۔

چہ مایہ گرم برون آمدی ز خلوت غیر

کہ شکوہ در دل و پیغارہ بر زبانم سوخت

تو رقیب کی خلوت سے یوں گرجوشی کے عالم میں باہر آیا کہ میری شکایتیں میرے  
 دل میں اور طعنے زباں پر آ کر جل گئے (یعنی بھی دب کر رہ گئے)۔

چو وا رسید فلک کآب در متاعم نیست

جوش گرمی بازار من دکانم سوخت

جب آسمان کو اس راز کا پتا چلا کہ میری متاع دکان میں پانی نہیں ہے تو اس نے  
 میرے بازار کی گرمی کی تیزی سے میری دکان کو جلا دیا۔

مرزا غالب کے متاعِ سخن کی گرم بازاری (شہرت) تھی۔ آسمان کو یہ بات گوارا نہ ہوئی  
 چنانچہ ان کی گرم بازاری ہی ان کی تباہی کا سبب بن گئی۔ ان کے پاس اس آگ کو بجھانے کا کوئی  
 سامان نہ تھا۔

نفس گداختگی های شوق را نازم

چہ شمعھا بہ سرا پردہ بیانم سوخت

شوق کی آگ نے میرے سانس کو بھی گداز کر دیا ہے اور میں اس گداز نفس پر ناز کرتا  
 ہوں کہ اس نے میرے بیان کے پردوں میں کیسی کیسی شمعیں روشن کر رکھی ہیں۔  
 دل گداختہ اور نفس گداختن ہونا بڑی بات ہے لیکن اگر یہ نصیب ہو جائے تو شمعِ سخن  
 چمک اٹھتی ہے:

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد

پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

نوید آمدت رشک از قفا دارد

شگفتہ روئی گلھای بوستانم سوخت

لغت: ”قفا“ = پیچھے۔ ”نوید“ = خوش خبری۔



تیرے آنے کی خوشخبری میں ایک رشک کا پہلو بھی ہے۔ تیرے آنے سے باغ کے پھول شگفتہ ہو گئے ہیں اور میں ان کی شگفتگی دیکھ کر (رشک سے) جل گیا ہوں۔

کسی درین کف خاکسرم مباد انباز

چہ شد گر آتش ہمسایہ خانمانم سوخت

لغت: ”انباز“ = شریک، ساتھی یہ ہم باز کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ دو دوست جو ایک دوسرے کے ساتھ کھیلے ہوں، ہم باز کہلاتے ہیں۔ ”خانماں“ خانہ و سامان کا مخفف۔ گھر اور گھر کا ساز و سامان، گھریا۔

اگر ہمسائے کی آگ نے میرا گھریا جلا ڈالا تو کیا ہوا۔ اللہ کرے اب اس مٹھی بھر راکھ میں (جو باقی رہ گئی ہے) میں! کوئی شریک نہ ہو۔

یہ شعر مرزا غالب کے ان شعروں کی آئینہ داری کرتا ہے:

رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ہم خن کوئی نہ ہو اور ہمزباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے

کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

مگر پیام عتابی رسیدہ است بہ من

شکستہ رنگی یاران رازدانم سوخت

لغت: ”شکستہ رنگی“ = اڑے ہوئے رنگ کی حالت۔

شاید (میرے دوست کی طرف سے) کوئی عتاب آمیز پیام آیا ہے۔ میرے رازداں دوستوں کے چہروں کے رنگ اڑے ہوئے ہیں اور ان کی اس حالت نے مار ڈالا ہے۔

محبوب کی طرف سے کوئی ایسا مایوس کن پیغام ہے جو عاشق کے رازداں دوستوں کو معلوم ہے اور وہ پریشان ہیں۔ ان کی پریشاں حالی سے عاشق راز کو پا گیا ہے اور آزرده ہے۔

خبر دہید بہ قاتل کہ ہجر می کشدم

ز مہتاب چہ منت برم کتامنم سوخت

لغت: ”کتان“ = ایک کپڑا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ چاندنی میں پھٹ جاتا ہے۔ میرے قاتل کو کہہ دو کہ تو اب میرے قتل کی زحمت گوارا نہ کر، ہجر ہی مجھے مار رہا ہے۔ اب چاندنی کے احسان اٹھانے کی کیا حاجت، میرا کتان ہی جل چکا ہے۔

خن چہ عطر شرر بر دماغ زد غالب

کہ تاب عطسہ اندیشہ مغز جانم سوخت

لغت: ”عطسہ“ = چھینک۔ ”تاب“ گرمی ”خن“ = شعر، شاعری۔

تیز خوشبو سونگھنے سے چھینک آ جاتی ہے۔

شاعر کہتا ہے: غالب فن شعر (خن) نے میرے دماغ میں کیسا آتشیں عطر ڈال دیا ہے کہ میرے تخیل کو چھینکیں آنے لگی ہیں اور ان چھینکوں کی تاب نے میرے مغز جاں کو جلا دیا ہے۔ یعنی شعر نے میرے تخیل میں ہنگامہ پیدا کیا ہوا ہے اور اس ہنگامے کی گرمی سے جل رہا ہوں۔





## غزل نمبر (۳۰)

گفتم بروز گارخنور چومن بسی است

گفتند اندرین کہ تو گفستی خن بسی است

میں نے کہا، زمانے میں میرے جیسے بہت سے خنور ہیں۔ کہنے لگے، یہ جو کچھ تو نے کہا، اس کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔

شاعر نے تو بڑے انکسار سے کہا کہ مجھے اپنے پہ کوئی خاص گھمنڈ نہیں، میرے جیسے اور بھی بہت سے شاعر دنیا میں ہیں مگر جواب بڑا پہلودار ہے۔ ایک پہلو تو یہی ہے کہ تو شاعر بھی ہے کہ نہیں اور اگر ہے تو پھر کیا اور تجھ جیسے اور بھی ہیں تو ہوں گے۔ یہ شعر مرزا غالب کی شوخ کلام کی ایک مثال ہے۔

معنی، غریب مدعی و خانہ زاد ماست

ہر جا عقیق نادور و اندر یمن بسی است

لغت: ”مدعی“ = دعویٰ کرنے والا، حریف مقابل۔ اس کے معنی رقیب کے بھی ہوتے ہیں۔

”خانہ زاد“ = جو گھر میں پیدا ہوا ہو، گھر کا غلام، گھر کی لونڈی۔

”معنی“ = نکتہ آفرینی، شعر گوئی، بغز گوئی۔

شعر میں نکتہ آفرینی، ہمارے حریف کے لیے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ ہمارے گھر کی لونڈی ہے۔ عقیق ہر جگہ نادر اور نایاب ہے لیکن یمن میں کثرت سے ملتا ہے۔

یعنی ہماری ذات معنی آفرینی میں یکتا ہے اور عقیق خن پیدا کرنے میں یمن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا مقابل ہمارا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔

مشکلیں غزالہ ہا کہ نہ بنی بہ هیچ دشت

در مرغزارهای ختا و ختن بسی است

مشک پیدا کرنے والی ہرنیاں جو تجھے کسی جنگل میں نظر نہ آئیں گی، ختا اور ختن کے میدانوں اور چراگا ہوں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

در صفحہ نبودم ہمہ آنچه در دل است

در بزم کمتر است گل و در چمن بسی است

جو کچھ ہمارے دل میں ہے وہ سب صفحہ قمر طاس پہ نہیں آسکتا۔ محفلوں میں پھول تھوڑے ہوتے ہیں، چمن ان کا اصلی مقام ہے۔ وہاں ان کی کثرت دیکھیے۔

لیلیٰ بدشت قیس رسید است ناگهان

در کاروان جوازہ محمل فلن بسی است

لیلیٰ دشت قیس (مجنوں) میں اتفاقاً آ پہنچی ہے۔ ورنہ تو قافلے میں محمل کو گرا دیئے والی اونٹنیاں بہت ہیں۔

بعض اونٹنیاں یا سواری کے جانور، تیز چل کر، یا بگڑ کر محمل کو گرا دیتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ قافلے میں منہ زور اونٹنیاں بہت تھیں۔ اب لیلیٰ جو دشت قیس میں آ پہنچی ہے تو اسے قیس ہی کا جذب عشق کہنا چاہیے۔



باید بہ غم نخوردن عاشق معاف داشت

آن را کہ دل ربودن و نشناختن بسی است

لغت: ”غم نخوردن“ = عاشق کا غم نہ کھانا، اس کی پروا نہ کرنا۔ ”معاف داشتن“ = در

گزر کرنا، معاف کر دینا۔

اس شخص کو جس میں لوگوں کے دل چھیننے اور پھر انہیں در خود اعتنائی نہ سمجھنے کی

عادت کوٹ کوٹ کر بھری ہے، اگر وہ عاشق کا غم نہیں کھاتا تو اسے معاف کر دینا چاہیے (بے

نیاز انسان ہے)۔

زور شراب جلوہ بت کم شمرده ایم

اما نظر بہ حوصلہ برہمن بسی است

لغت: ”کم شمرده“ معمولی خیال کرنا۔

ہم اس بات کی طرف دھیان نہیں دیتے کہ صنم کے جلوے کی شراب کتنی پر زور اور

مست کر دینے والی ہے۔ ہماری نظر برہمن پر پڑتی ہے کہ اس کا کتنا بڑا حوصلہ ہے کہ بتوں میں گھرا

ہوا ہے اور ان کے جلوؤں کے تاب لائے جارہا ہے۔ عشق کے سارے حوصلے معشوق کے مسکور کن

حسن کی کرامات ہیں۔

گردر هوای قرب تو بستیم دل، مرنج

خود ناکشودہ جای در آن انجمن بسی است

لغت: دستور ہوتا ہے کہ جب کوئی مہمان کسی محفل میں آتا ہے تو اُس کے لیے پہلے

سے جو لوگ آ کے بیٹھے ہوتے ہیں، وہ خود سکر کے اُس کے لیے جگہ کھول دیتے ہیں سوائے اس

شخص کے لیے جو ناخواندہ مہمان ہو یا اہل نہ ہو۔ ایسا شخص ”ناکشودہ جا“ ہوتا ہے۔

کہتا ہے کہ ہم نے اگر تیرے قریب آنے کی آرزو کی ہے تو تو کیوں خفا ہو رہا ہے۔ ہم

جیسے تو تیری محفل میں بہت سے ہیں جن کے لیے وہاں گنجائش نہیں۔ ایک میں بھی ہو گیا تو پھر کیا۔

تا شیر آہ و نالہ مسلم ولی مترس

مارا هنوز عربده با خوشتن بسی است

لغت: ”عربده“ = اُلجھنا۔ جنگ کرنا۔

یہ مان لیا کہ آہ و نالہ میں اثر ہوتا ہے لیکن تو کیوں ڈرتا ہے۔ ابھی تو ہم اپنے آپ سے

النجھے ہوئے ہیں، اسی سے عہدہ برآ نہیں ہوئے۔ گویا ابھی ہماری فریادیں تو ہمارے اپنے

دکھڑوں کے باعث ہیں۔ ان سے فارغ ہوں گے تو تم سے بھی نبٹ لیں گے۔

غالب نخورده چرخ فریب از ہزار بار

گفتم بہ روزگار سخنور چومن بسی است

اے غالب میں نے ہزار بار کہا کہ زمانے میں میرے جیسے بہت سے سخنور ہیں۔ لیکن

آسمان میرے فریب میں نہ آیا۔ آسمان کا اہل کمال پرستم ڈھانا، مشہور ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھ

پر اگر اس لیے ستم ڈھایا جارہا ہے کہ میں سخنور ہوں تو دنیا میں اور بھی تو سخنور ہیں، ادھر یہ آفت

کیوں نازل نہیں ہوتی۔





## غزل نمبر (۳۱)

چو صبح من ز سیاہی بشارت ماند است  
چلوئی ام کہ ز شب چند رفت یا چند است  
جب میری صبح بھی، سیاہ ہونے کے باعث شام کی طرح ہے تو پھر تو مجھ سے یہ کیوں  
پوچھتا ہے کہ رات کتنی گزر چکی ہے اور کتنی باقی ہے۔  
جب صبح بھی تاریک ہی ہو تو پھر رات گزرنے کا کیا سوال۔

بہ رنج از بی راحت نگاہداشتہ اند  
ز حکمت است کہ پای شکستہ در بند است  
دکھ راحت ہی کے لیے برداشت کیے جاتے ہیں۔ دیکھ لڑوٹی ہوئی ٹانگ کو جو پٹی سے  
باندھا جاتا ہے (اور اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس میں) حکمت پوشیدہ ہے۔

دراز دستی من چاکي از گلند چه عیب  
ز پیش، دلق ورع، هزار پیوند است  
لغت: ”دلق“ = گدڑی۔ ”ورع“ = زہد و پرہیزگاری ”ز پیش“ = پہلے ہی سے۔  
دلق یا گدڑی، ایسا لباس ہے کہ وہ جہاں سے پھرتا ہے اس میں ایک پیوند لگا دیتے ہیں  
گو یا وہ مسلسل چاک و پیوند ہوتی ہے۔

زہد و پرہیزگاری کی گدڑی میں تو پہلے ہی سے کئی پیوند لگے ہوئے ہیں۔ اگر میری

دراز دستی نے اس میں کوئی ایک اور چاک کا اضافہ کر دیا تو اس میں کیا عیب ہے۔  
گو یا دلق ورع لباس ہی ایسا ہے کہ اسے چاک کیا چاہیے

نہ گفتہ کہ بہ سختی بساز و پند پذیر  
برو کہ بادۂ مالتخ تر ازین پند است  
تو نے خود ہی نہیں کہا کہ تلخی اور سختی برداشت کر لے اور نصیحت کو قبول کر لے۔ جا، کہ  
ہماری شراب (تلخ) نصیحت سے زیادہ تلخ ہے۔ اگر تلخی ہی گوارا کرنی ہے تو تلخی شراب کیوں نہ  
گوارا کی جائے۔

وجود او همه حسن است و هستی ام همه عشق  
بہ بخت دشمن و اقبال دوست سو گند است  
دشمن و دوست دونوں کے بخت و اقبال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے محبوب کی  
ذات سرتاپا حسن ہے اور میری ہستی سراسر عشق ہے۔

نگاہ مھر بہ دل سرندادہ چشمہ نوش  
هنوز عیش باندازہ شکر خند است  
ابھی محبوب کی نگاہ محبت سے (لذتوں کا) میٹھا چشمہ بہہ کر ہمارے دل میں نہیں گرا۔  
ابھی تو ہماری لذت خوشی (عیش) اس کی میٹھی سی ہنسی کے اثر تک محدود ہے۔  
ابھی تو محبوب نے ادا سے مسکرا کر ہمیں دیکھا ہے۔ ابھی اس کی محبت آمیز نظریں  
ہمارے دل میں نہیں اتریں۔



ز نیم آن کہ مبادا بہ میرم از شادی

نگوید ار چه بمرگ من آرزو مند است

اگرچہ میرا محبوب میری موت کا آرزو مند ہے تاہم منہ سے کہتا نہیں۔ ڈرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ میں یہ بات سن کر خوشی سے جان نہ دے دوں۔

شمار کجروی دوست در نظر دارم

درین نوردد اندام کہ آسمان چند است

آسمان کجرو ہوتا ہے کہ وہ انسانی خواہشات کے خلاف گردش کرتا ہے۔ معشوق کجرو ہے کہ وہ عاشق کی تمنا کے برعکس چلتا ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں:

میں تو صرف دوست کی کجرویوں گن رہا ہوں اور اسی میں مصروف ہوں۔ مجھے معلوم نہیں اس لپیٹ میں، آسمان کا کتنا ہاتھ ہے۔

مرزا غالب اپنی مصائب میں جو بے شمار ہیں، صرف محبوب کے جو رستم کا شمار کر رہے ہیں۔ نہ جانے آسمان کی کتنی دشمنیاں اس سلسلے میں شامل ہیں۔

اگر نہ بھر من از بھر خود عزیزم دار

کہ بندہ خوبی او خوبی خداوند است

اگر میرے لیے نہیں تو اپنے لیے ہی تجھ پر مہربان ہو (اور میری ذاتی خوبیوں پر نظر ڈال) کیونکہ اگر غلام میں کوئی خوبی ہو تو وہ آقا ہی کی خوبی شمار ہوتی ہے۔

نہ آن بود کہ وفا خواہد از جہان غالب

بدین کہ پرسد و گویند ہست، خورسند است

غالب دنیا سے کوئی زیادہ وفا کا خواہش مند نہیں۔ فقط اتنا چاہتا ہے کہ محبوب (میرا حال) پوچھے تو لوگ یہ کہ دیں ہاں زندہ (ہست) ہے۔ غالب اسی میں خوش ہے۔



## غزل نمبر (۳۲)

ساخت ز راستی بہ غیر، ترک فسون گری گرفت

زہرہ بطالع عدو، شیوہ مشتری گرفت

لغت: ”فسون گری“ = کسی پر جادو کرنا، مسح کرنا۔ ”ترک گرفتن“ = کسی کام کو چھوڑ دینا۔ ”غیر“ = مراد رقیب۔ ”عدو“ = اسی مفہوم میں آیا ہے۔

”زہرہ و مشتری“ = دو مبارک ستارے۔ جب یہ سیارے ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں تو اس وقت بڑا مبارک خیال کیا جاتا ہے اسے قرآن السعدین کہا جاتا ہے۔

محبوب نے بڑے صدق دل سے رقیب سے موافقت کر لی اور ظاہر اناز و ادا سے اسے مسح کرنا چھوڑ دیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ زہرہ نے ہمارے رقیب کے نصیبے میں مشتری کا کردار ادا کیا۔

یعنی یہ رقیب کی خوش نصیبی کی علامت ہے کہ محبوب بڑی سچائی کے ساتھ اظہار محبت کرنے لگا ہے۔

شہ بہ گدا کجا رسد، ز انکہ چو فتنہ روی داد

خاتم دست دیو برد، کشور دل پری گرفت



بادشاہ گدا تک کیسے پہنچ سکتا ہے، اس لیے کہ جب کوئی فتنہ پچا ہوتا ہے تو شای ہاتھ کی انگوٹھی، دیو چھین کر لے جاتا ہے اور دل کی سلطنت پر پری قبضہ کر لیتی ہے۔  
حضرت سلیمان کی انگوٹھی (خاتم جم) دیو نے چرائی تھی اور ان کے دل پر ملکہ سہا کی شہرت حسن کا اثر ہوا تھا۔

ترک مرا ز گیر و دار خفل غرض بود نہ سود

فرہ اگر نہ یافت صید، خردہ بہ لا غری گرفت

لغت: "ترک" = مراد محبوب ہے۔

"گیر و دار" = پکڑ دھکڑ محاسبہ کرنا۔ "خردہ گرفت" = نقص نکالنا۔ چھوٹے چھوٹے عیب نکالنا گیر و دار ہے۔

ہمارے (جابر) محبوب کی غرض و غایت محض ایک مشغلہ ہے کوئی فائدہ مقصود نہیں۔  
(وہ ایک ایسا شکاری ہے) کہ اگر اس کے ہاتھ میں کوئی موٹا شکار نہ آئے (دبلا ہو) تو وہ اس کے دبے پن پر نکتہ چینی کرتا ہے۔

دبے پن پہ حرف گیری کرنے کے لیے خردہ گیری کے الفاظ استعمال کرتا ہے حد موزوں ہے۔

آمد و از رہ غرور بوسہ بہ خلوتم نداد

رفت و در انجمن ز غیر مزد نواگری گرفت

وہ آیا اور عالم غرور میں ہماری خلوت کو بوسہ تک نہ دیا۔ (ادھر یہ حالت ہے) کہ بھری محفل میں چلا گیا، نواگری کی اور اپنی نواگری کا صلہ رقیب سے قبول کر لیا۔ یعنی عاشق کی ایک با

غزت دعوت کو ٹھکرا دیا اور رقیب کی خاطر ایک بے وقار ماحول میں چلا گیا۔

ای کہ دلت ز غصہ سوخت، شکوہ نہ در خور و فاست

ور سزد آنکہ سر کنی گیر کہ سرسری گرفت

لغت: "غصہ" = فارسی میں انتہائے غم و اندوہ کے لیے آتا ہے۔ "سر کردن" = اظہار کرنا۔

"سرسری گرفتن" کسی بات کو بالکل سرسری سمجھنا، درخور اعتنائی نہ سمجھنا۔

اگرچہ تیرا دل غم سے نڈھال ہو گیا ہے پھر بھی شکوہ کرنا وفا کے شایان شان نہیں اور اگر اس کے اظہار کرنے کے لیے (تجھے محسوس ہو کہ) مناسب موقع ہاتھ آیا ہے تو یہ سمجھ لے معشوق نے اسے (دل سے نہیں) محض ایک بے معنی سی بات سمجھ کے سنا اور نال دیا۔

جادہ شناس کوی خصم بودم و دوست راہ جوی

منکر ذوق ہم رہی خردہ بہ رہبری گرفت

لغت: "جادہ شناس" = راستے سے واقف۔ "خصم" = دشمن رقیب۔

"راہ جلوئے" = جسے راستے کی تلاش ہو۔ "بہری" = ہمراہ ہونا ساتھ۔

میں رقیب (خصم) کے کوچے کے راستے سے آشنا تھا اور محبوب (دوست) کو اس راستے کی تلاش تھی۔ لیکن وہ کسی کے ساتھ چلنے کی لذت سے منکر تھا، اس نے میری رہنمائی پر سخت اعتراض کیا۔

مستی مرغ صمد بر رخ گل، بوی تست

ہرزہ ز شرم باغباں، جہہ گل تری گرفت



لغت: ”جہہ“ = پیشانی۔ ”برزہ“ = بے فائدہ۔ ”تری گرفتن“ = تر ہونا (پھول کے شبنم آلودہ ہونے کی طرف اشارہ ہے)

پھول کے رو برو مرغِ سحری پر جو مستی طاری تھی وہ تیری (محبوب) یاد میں تھی۔ (پھول یہ سمجھا کہ یہ مستی اس کی وجہ سے ہے۔) چنانچہ وہ شرمایا گیا کہ باغبان کیا کہے گا اور اس خیال سے اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔

شاعر نے ایک شبنم زدہ پھول پر صبح کے وقت بلبل کے چھپھانے کی ایک حسین توجیہ پیش کی ہے۔

رای ز دم کہ بار غم ہم کہ رقم ز دل رود

نامہ چون بستمش بہ بال، مرغ سبک پری گرفت

مدھائے ہوئے پرندوں کے پروں میں خط باندھ کر پیغام بھیجے جاتے ہیں جنھیں مرغانِ نامہ بر کہا جاتا ہے۔ ”رقم“ = تحریر، مضمونِ نامہ۔ ”سبک پری“ = ہلکا اڑنا۔

میرا خیال تھا کہ خط میں اپنا حال لکھ کر میرے غم کا بوجھ دل سے دور ہو جائے گا (چنانچہ ایسا ہی ہوا) جوئی میں نے خط پرندے کے پروں میں باندھا وہ ہوا میں تیرنے لگا۔

غالب اگر بہ بزمِ شعر دیر رسید دور نیست

کش بفراقِ حسرتی دل ز سخنوری گرفت

لغت: ”دل از چیزے گرفتن“ = کسی چیز سے بے زار ہو جانا۔

”حسرتی“ = شیفہ۔ نواب مصطفیٰ خان شیفہ فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔

وہ مرزا غالب کے بڑے گہرے دوست تھے اور ان سے مشورہ، سخن بھی کرتے تھے۔

ان کی وفات سے مرزا صاحب کو بڑا قلق ہوا تھا۔ اس شعر میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔  
اگر غالب بزمِ شعر میں دیر سے پہنچا تو کوئی عجیب بات نہیں۔ اس کا دل حسرتی کے فراق (کے غم) میں شعر و شاعری سے اچاٹ ہو گیا ہے۔



### غزل نمبر (۳۳)

دل بردن ازین شیوہ عیان است و عیان نیست

دانی کہ مرا بر تو گمان است و گمان نیست

میرے دل کو اس ناز و انداز سے چھین لینا عیاں ہے اور عیاں نہیں بھی ہے۔ تو جانتا ہے کہ مجھے تجھ پر اس بات کا شبہ ہے اور یہ شبہ نہیں بھی ہو سکتا۔

در عرضِ غمت پیکرِ اندیشہ لالم

پا تا سرمِ اندازِ بیان است و بیان نیست

لغت: ”اندیشہ“ = فکر و خیال، مجازاً انہم و ہر اس۔ ”عرض“ = پیش کرنا، ظاہر کرنا۔

”لال“ = گنگ اردو میں بھی انہی معنوں میں آتا ہے، مثلاً زبانِ لال۔

تیرے غم کو ظاہر کرنے میں ایک خاموش مجسمہ خیال ہوں۔ میں سر سے پاؤں تک انداز بیان ہوں اور بیان کہیں ہے نہیں۔

یعنی ظاہری صورت سے میرے دل کا حال صاف صاف بیان ہو رہا ہے اگرچہ اس



بیان کی صورت بیان کی سی نہیں ہے:

خوشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

فرمان تو بر جان من و کار من از تو

بی پردہ بہ ہر پردہ روان است و روان نیست

لغت: ”روان“ = جاری یہ لفظ اس شعر میں دو چیزوں کے لیے آیا ہے۔ ”فرماں جاری شدن“ یعنی فرماں کا جاری ہونا یا صادر ہونا اور ”کار روان شدن“ یعنی کام کا رواں ہونا جو کام کے رکنے یا نہ ہونے کی ضد ہے۔

”بے پردہ“ = علانیہ۔ ظاہری طور پر۔ ”بہ ہر پردہ“ = ہر باطنی اور خفیہ انداز میں۔

دوسرے مصرعے میں ”روان است“ فرمان کے لیے اور ”روان نیست“ کار (کام) کے لیے آیا ہے یعنی فرمان جاری و ساری ہے اور ظاہر میں اور پوشیدہ طور پر جاری و ساری ہے۔ لیکن تیرے ہاتھوں میرا کام رواں نہیں ہوتا، یعنی حسن کے فرمان تو مجھ پہ نازل ہو رہے ہیں اور میں سر تا پا انتشار امر بنا ہوا ہوں لیکن حسن ہماری کسی ایک خواہش کو پورا نہیں کر رہا۔ اس شعر کا خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو زیادہ موزوں ہوگا۔

نازم بہ فریبی کہ دھی اہل نظر را

کر بوسہ پیامی بہ دھان است و دھان نیست

شعرا جس طرح محبوب کی کمر کو اتنا نازک دکھاتے ہیں کہ گویا اس کا کوئی وجود ہی نہیں اسی طرح معشوق کے ذہن تک کو بھی یوں ہی دکھاتے ہیں۔ مرزا غالب نے اس نازک بیانی سے عجب کام لیا ہے۔ کہتے ہیں:

تو اہل نظر کو جو فریب دے رہا ہے میں اس کی داد دیتا ہوں۔ تیرے ذہن سے ان کو پیام بوسہ تو ملتا ہے لیکن ذہن کا وجود نہیں۔

شاعر کے مد نظر معشوق کے ذہن تک کی کشش کو دکھانا ہے جسے دیکھ کر بے ساختہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔

داغیم ز گلشن کہ بہار است و بقاء هیچ

شادیم بہ گلخن کہ خزان است خزان نیست

لغت: ”گلخن“ = آتش دان، بجٹی۔ اصل میں گل اور خن کا مرکب ہے۔ گل، ترکی میں خاکستر ہے اور خن، خانہ کا مخفف ہے۔ گلخن یعنی خاکستر خانہ۔

ہم اس گلشن سے جل گئے کہ جو سر تا پا بہار تو ہے لیکن اس میں بقاء نہیں اور گلخن سے خوش ہیں کہ بظاہر خزاں ہے لیکن خزاں بھی نہیں، یعنی اس کی خزاں نہیں ہوتی۔ وہ ایک حالت پر رہتا ہے۔

سرمایہ ہر قطرہ کہ گم گشت بہ دریا

سودی است کہ مانا بہ زیان است و زیان نیست

لغت: ”مانا“ = ملتا جلتا، مانا میں الف آخر فاعلی ہے، ملنے جلتے والا جیسے دانا کا الف آخر یعنی جاننے والا۔

ہر اس قطرے کا سرمایہ جو سمندر میں گم ہو گیا، ایک سود (نفع) ہے جو بظاہر زیاں نظر آتا ہے لیکن زیاں نہیں ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا



قطرہ سمندر میں غرق ہو کر بظاہر اپنا وجود کھود دیتا ہے لیکن حقیقت میں وہ قطرے سے سمندر بن جاتا ہے۔

در ہر مرثہ برہم زدن این خلق جدید است

نظارہ سگالد کہ همان است و همان نیست

ہر بار آنکھ کے جھپکنے میں یہ کائنات نئی ہوتی ہے۔ ہماری نظریں سمجھتی ہیں کہ یہ کائنات وہی ہے لیکن وہی نہیں ہوتی۔

اس شعر میں مرزا غالب نے ایک نہایت ہی دقیق نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے۔ انسان اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ مشاہدے اور تجربے سے بدلتا رہتا ہے۔ اور اس بدلنے پر جب وہ کائنات کو دیکھتا ہے تو وہ بظاہر وہی نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں وہ نہیں ہوتی۔

ایک معمولی سی مثال سے قیاس کر لیجئے۔ فرض کیا ہم نے ایک چیز کو پہلی دفعہ دیکھا، اس کے بعد ہم نے آنکھ جھپکائی اور پھر اس پر نظر پڑی۔ اب کے وہ چیز وہ نہیں ہے جو ایک لحظہ پہلے ہم نے دیکھی۔ اب کے اس کے ادراک میں یہ تجربہ بھی شامل ہو گیا ہے کہ یہ وہ چیز ہے جسے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اسی طرح وہ ہر بار دیکھنے پر بدلتی چلی جائے گی۔ پھر کائنات خود بھی تغیر پذیر ہے اگرچہ وہ تغیر نمایاں طور پر نظر نہیں آتا۔

در شاخ بود موج گل از جوش بھاران

چون بادہ بہ مینا کہ خنان است و خنان نیست

بہار آتی ہے تو شاخوں پہ پھول نکل آتے ہیں لیکن پھول بننے سے پہلے ان کا نام شاخوں میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ وہ نظر نہیں آتا لیکن دیکھیں تو نظر بھی آتا ہے شاعر کہتا ہے: جوش بہار سے موج گل شاخ میں موجود ہوتی ہے، اس شراب کی طرح کہ جو شیشہ

نے میں چھپی بھی ہوتی ہے اور چھپی ہوئی نہیں بھی ہوتی۔

ناکس ز تنومندی ظاہر نشود کس

چون سنگ سررہ گران است و گران نیست

ایک ناکس (گھٹیا) انسان ظاہر تنومندی سے کس (عظیم) نہیں بن سکتا، اس راستے کے پتھر کی طرح کہ ہماری تو ہوتا ہے لیکن گران نہیں ہوتا (یعنی اس کی قدر و اہمیت کچھ نہیں ہوتی)۔ انسان کو اس کی ظاہر اُمود و نمائش، بڑا انسان نہیں بناتی۔ بڑا انسان بننے کے لیے اعلیٰ کردار اور بلند شخصیت درکار ہوتی ہے۔

پہلو بشکافید و بہ بینید دلم را

تا چند بگویم کہ چنان است و چنان نیست

میرے پہلو کو چیر ڈالو اور میرے دل کو دیکھ لو۔ میں کب تک کہتا رہوں گا کہ میرا دل کیسا ہے کیسا نہیں ہے۔

غالب ہلہ نظارگی خویش توان بود

زین پردہ برون آ کہ چنان است و چنان نیست

لغت: ”نظارگی“ = نظارہ سے اسم فاعلی ہے جیسے پردگی۔ نظارگی نظارہ کرنے والا اور پردگی پردہ کرنے والا، پردے میں بیٹھنے والا۔ ان کی ”می“ فاعلی کہلاتی ہے۔ غالب! اپنا نظارہ آپ کیا جاسکتا ہے۔ اس پردے سے باہر آ جا کہ ایسا ہے، ایسا نہیں ہے۔

انسان اپنی ذات کی کنہ کے بارے میں قیاس کرتا رہتا ہے لیکن یہ نکتہ قیاس آرائیوں



اور حکمت طرازیوں اور دلائل سے حل نہیں ہوتا۔ ایسا کرنے سے انسان گویا پردے میں پڑا رہتا ہے۔ البتہ اگر انسان چاہے تو اپنے آپ سے باہر آ کر اپنا نظارہ میسر آ سکتا ہے۔



## غزل نمبر (۳۳)

دل برد و حق آن است کہ دلبر نتوان گفت

بیداد توان دید و سنگر نتوان گفت

وہ دل چین کے لے گیا لیکن حق بات تو یہ ہے کہ اسے دلبر (دل چھیننے والا) کہہ بھی نہیں سکتے (کیونکہ اس کا کوئی ظاہری ثبوت بھی نہیں) اس کے جوہر ستم (بیداد) تو دیکھ سکتے ہیں (نظر آتے ہیں) لیکن اسے سنگر نہیں کہا جاسکتا (کیونکہ محبت میں ستم نہیں ہوتا)۔

در رزم گہ اش نا چخ و خنجر نتوان برد

در بزم گہ اش بادہ و ساغر نتوان گفت

لغت: ”نا چخ“ = تبر، چھوٹی کلہاڑی، جسے تبر زین بھی کہتے تھے کیونکہ اس گھوڑے کی زین کے ساتھ لٹکا کر رکھتے تھے۔ آلات جنگ میں سے ایک۔

اس کی رزمگاہ میں (جہاں حسن، عشق سے برسرِ پیکار ہوتا ہے) تبر اور خنجر سے کام نہیں چلتا، کیونکہ وہاں تو غمزہ و عشوہ کے وار ہوتے ہیں۔ اس کی بزم گہ میں (جہاں محبت کی گرجویشیوں کا نشہ ہوتا ہے) شراب اور جام کا نام نہیں لیا جاتا (وہاں تو جام وے کے بغیر ہی سرور طاری ہوتا ہے)

غالب:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

رخشندگی ساعد و گردن نتوان جست

زی بندگی یارہ و پرگر نتوان گفت

لغت: ”ساعد“ = کلائی۔ ”یارہ“ = چوڑی یا بازو بند۔

پرگر = گلو بند یا ہار (ایران کے پرانے بادشاہ گلے میں قیمتی پتھروں سے جڑا ہوا گلو بند پہنتے تھے)۔

کلائی اور گردن کی چمک کا اندازہ نہیں ہو سکتا، اور بازو بند اور گلو بند کی زیبائی بیان نہیں ہو سکتی۔

پیوستہ دھد بادہ و ساقی نتوان خواند

ہموارہ تراشد بت، آذر نتوان گفت

ہمیشہ شراب پلاتا ہے اور اسے ساقی بھی کہہ نہیں سکتے۔

ہمیشہ بت تراشتا ہے اور اسے آذر بھی نہیں کہا جاسکتا۔

محبوب کا حسن، کیف آور ہے جسے دیکھ کر سب مست ہوتے ہیں اور اس کا ہر جلوہ گویا

ایک نیابت ہے جسے وہ تراش کر چاہنے والوں کے سامنے لاتا ہے۔

از حوصلہ یاری مطلب صاعقہ تیز است

پروانہ شو اینجا ز سمندر نتوان گفت



لغت: ”سمندر“ = ایک کیڑا جو آگ ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ اور وہیں نشوونما حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس پروانہ ہے جو شعلہ دیکھتے ہی اس پر لپکتا ہے اور جان دے دیتا ہے۔  
 معشوق کا جلوہ حسن برق تپاں کی طرح ہے جس سے بچنے کا کسی کو حوصلہ نہیں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ برق تیز ہے، حوصلے کا سہارا نہ ڈھونڈ یہاں تو پروانہ بن کر جان قربان کی جا سکتی ہے، سمندر نہیں بنا جا سکتا۔

ہنگامہ سر آمد، چہ زنی دم زتظلم

گر خود ستمی رفت بہ محشر نتوان گفت

محبت ایک ہنگامہ ہے، پاپا ہوا اور ختم ہو گیا۔ اب اُس کے جور و ستم کے ہاتھ دادرسی کے لیے فریاد کیسی؟ اگر واقعہ کوئی ستم ہوا بھی ہو تو یہ وہ ستم ہے جسے محشر میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نہ جو نیم

باما سخن از طوبی و کوثر نتوان گفت

۔ مولانا حالی فرماتے ہیں۔

”ہم کو آگے جانے کی جلدی ہے۔ ہم سایہ اور سرچشمہ یعنی طوبی اور کوثر پر آرام نہیں لے سکتے۔“

مسافر چلتے چلتے جب تھک جاتے ہیں تو کسی سایہ دار درخت یا چشمے کے کنارے دم لیتے ہیں اور پانی پی کر پیاس بجھاتے ہیں۔ مرزا غالب کہتے ہیں کہ ہم وہ تیز رفتار مسافر ہیں کہ طوبی اور کوثر پہ نہیں ٹھہرتے۔ منزل پہ پہنچنے کا شوق ہمیں کشاں کشاں لیے جا رہا ہے۔ جو ان دونوں سے کہیں آگے ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے پرے ہوتا کاٹھکے مکان اپنا

آن راز کہ در سیدہ نھان است نہ وعظ است

میر دار توان گفت بہ منبر نتوان گفت

وہ راز جو ہمارے سینے میں پوشیدہ ہے، وعظ نہیں ہے۔ یہ دار ہی پہ چڑھ کر سنایا جا سکتا ہے، منبر پہ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ راز، حق کا راز ہے جس کا اظہار آسان نہیں۔ منصور نے حق بات کہی، تو دار پہ چڑھنا پڑا۔ صائب کہتا ہے:

گفتار راست باعث آزار می شود

چو حرف بلند دار می شود

کاری عجب افتاد بدین شیفتہ ما را

مومن نبود غالب و کافر نتوان گفت

ایک عجیب مجنوں سے ہمارا واسطہ آ پڑا ہے۔ غالب مومن نہیں مگر اسے کافر بھی نہیں کہا جا سکتا۔

غالب کی ظاہری زندگی، مومن کی سی نہیں تھی لیکن اس کے اشعار سے جو بالخصوص خدا کو خطاب کر کے کہے گئے ہیں، اس کے ایمان اور خلوص کا پتا چلتا ہے اور یوں بھی کسی کافر کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بار ہا

دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں





## غزل نمبر (۳۵)

آتشکدہ خوئی تو نازم کہ ز طریش

رفتیم شرر و داغ، گل و لالہ فرو ریخت

لغت: "رفتن" = جھاڑنا، جھاڑ پونچھ کرنا۔ "رفتیم" = میں نے جھاڑا۔

معشوق کی گرم طبیعت کو آتشکدہ سے تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ آتشکدہ ہوا میں اضافت، اضافت تشبیہی ہے۔ مراد وہ خوب آتشکدہ کی طرح ہو۔ مجھے تیری گرم مزاجی پر جو آتشکدہ کی طرح ہے، بہت ناز ہے کیونکہ جب کبھی بھی کسی طرف سے اس کی چنگاریوں اور داغوں کو جھاڑا اُس میں سے گلاب اور لالے کے پھول گرے۔

یعنی محبوب کی گرم مزاجی ایسی لطف انگیز ہے جیسے پھول جھڑ رہے ہوں۔

بر سادہ دلانت بہ وفا جلوہ ہمی داد

بیداد تو آب از رخ دلالہ فرو ریخت

لغت: "سادہ دلان" = سادہ لوح عاشق۔

"دلالہ" = کسی معاملے میں دلیل پیش کرنے والی۔ یہاں وہ عورت مراد ہے جو معشوق کی اچھی صفات بیان کرنے والی ہو۔ تعریف کرنے والی۔

دلالہ، تیرے سادہ دل عاشقوں کے سامنے تیری خوئے وفا بیان کر رہی تھی۔ تیری بیداد نے دلالہ کی آبرو کھو دی۔ "آب از رخ دلالہ فرو ریخت" کا ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ وہ شرمندہ ہوئی اور اس کے چہرے پر پسینہ آگیا۔

گفتم ز کہ پرسم خبر عمر گذشتہ

ساقی بہ قدح بادہ دہ سالہ فرو ریخت

میں سوچ رہا تھا کہ اپنی عمر گزشتہ کے بارے میں کس سے پوچھوں، ساقی نے پیالے میں دس سالہ شراب ڈال دی۔

شراب دس سال پرانی اسی وقت ہوتی ہے جب دس سال تک اسے کوئی نہ پیے۔ ساقی کا وہ سالہ شراب جام میں ڈالنے کا یہی اشارہ ہے کہ یہ جو شراب دس سال پرانی ہو گئی اور تم نے اتنا عرصہ نہیں پی، یہی حصہ تیری زندگی کا گزر گیا یعنی ضائع ہو گیا۔

بی سعی نگہ مستی آن چشم فسون گر

خونم بہ سیہ مستی دنبالہ فرو ریخت

لغت: "دنبالہ" = سرے کی وہ لکیر جو آنکھ سے باہر کھینچی ہوتی ہے۔

"چشم فسون گر" = جادو بھری آنکھ۔

آنکھیں مست ہوں تو نگاہیں گویا کام نہیں کرتیں۔ اسی لیے شاعر نے "بے سعی نگہ" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یعنی بغیر نگاہوں کی کوشش کے۔

معشوق کی آنکھیں مست ہیں اور مستی کے عالم میں نگاہیں کام نہیں کر رہیں، لیکن سرے کی لکیر اس سے زیادہ مست ہے۔ (سیہ مست)۔ اس دنبالے کی سیہ مستی نے میرا خون بہا دیا۔ یعنی میں مست آنکھوں پر قربان ہونے سے پہلے دنبالہ پر مرنا۔

مشاطہ بہ آرائش آن حسن خدا داد

گل در چمن و قد بہ بنگالہ فرو ریخت



لغت: ”حسن خدا داد“ = فطرتی رعنائی جسے ظاہر آرائش و زینت کی حاجت نہ ہو۔  
 مشاطہ“ = زینت اور آرائش والی عورت مشاطہ نے تیرے حسن خدا داد کی آرائش کے  
 وقت پھولوں کو چمن میں اور شیرینی (قند) کو بنگال میں پھنک دیا۔ حسن خدا داد کو ان چیزوں کی  
 ضرورت ہی نہ تھی۔

با موج خرامش خن از بادہ مگوئید

کآب رخ این جو ہر سیالہ فرو ریخت

لغت: ”جو ہر سیالہ“ = بہہ جانے والا جو ہر یعنی شراب۔

معشوق کے خرام میں ایک مستی ہے۔ جس طرح شراب میں تیزی سے لہریں ابھرتی  
 ہیں، اسی طرح معشوق کے خرام میں بھی گویا لہریں نمودار ہوتی ہیں۔ اسی لیے موج خرام کے  
 الفاظ آئے ہیں۔ کہتا ہے کہ معشوق کے موج خرام کے سامنے شراب کی بات نہ کرو کیونکہ موج  
 خرام کے رو برو اس جو ہر سیالہ کی آبرو جاتی رہی ہے، یعنی شراب بے وقار ہو کر رہ گئی ہے۔

چون انجم و خورشید ز برق دم گرم

شیرازہ جمعیت تنجالہ فرو ریخت

لغت: ”تنجالہ“ = وہ گرمی دانے جو بخار کی حدت سے لبوں پر نمودار ہو جاتے ہیں۔  
 بھری آتش آہوں (دم) سے ستاروں اور سورج کی طرح، گرمی دانوں کا شیرازہ کھڑ کر رہ گیا ہے۔

ریشکِ خط روی تو گر افشرد بدین رنگ

بنی کہ مہاز دارہ حالہ فرو ریخت

لغت: ”خط“ = چہرے پر ہنرے کا نمودار ہونا۔ ”افشردن“ = نچوڑنا۔ ”بدین رنگ“ = اس انداز

سے، اس طرح سے۔

ہنرہ خط کے نمودار ہونے سے رخ معشوق کا حسن دب کر رہ گیا ہے۔ چہرے کے گرد  
 خط یوں نظر آتا ہے جیسے چاند کے گرد ہالہ ہو۔  
 کہتا ہے کہ تیرے ہنرہ خط کے رشک کا اگر یہی عالم رہا تو چاند ہالے کے دائرے سے  
 نیچے آ کرے گا۔

دزدیدہ سر اہل خن از بیم تو غالب

گوئی رگ ابر قلمت ژالہ فرو ریخت

اے غالب تیرے خوف سے اہل خن اپنے سر چھپائے پھرتے ہیں۔ گویا ترے ابر قلم  
 کی رگوں سے ایلے برس رہے ہیں۔ یعنی رشحات قلم الفاظ نہیں ایلے ہیں۔



### غزل نمبر (۳۶)

خواست کز مارنجہ و تقریب رنجیدن نداشت

جرم غیر از دوست پرسیدیم و پرسیدن نداشت

اس نے چاہا کہ ہم سے بگڑ جائے اور بگڑنے کا کوئی موقع مل نہ تھا۔ ہم نے دوست  
 سے رقیب کا جرم پوچھا اور پوچھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔



آمد و از تنگی جاجبھہ پر چین کرد و رفت

برخود از ذوق قدوم دوست بالیدن نداشت

لغت: ”برخود بالیدن“ کسی بات پہ نخر سے پھولنا۔ ”قدوم دوست“ = دوست کی آمد۔

میر محبوب محفل میں آیا، جگہ کی تنگی کو دیکھا، تیوری چڑھائی اور چلا گیا۔ بات یہ تھی کہ وہ اپنے دوست کے آنے کی خوشی میں پھولنا چاہتا تھا اور اس پھولنے کی وہاں گنجائش نہ تھی۔ درحقیقت محبوب بزم میں آیا اور دیکھا کہ وہاں اس کا دوست موجود نہیں، چلا گیا۔

شد فگار از ناز کی چندان کہ رفتار ش نمائد

نازنین پایش بکوی غیر بوسیدن نداشت

ناز کی سے اس کے پاؤں اتنے زخمی ہو گئے کہ وہ چلنے سے رہ گیا کوچہ رقیب میں اس کے نازنین پاؤں کو اس زمین کے چومنے کا موقع نہ مل سکا۔

گل فراوان بود وی پر زور، دوشم بر بساط

خود بخود پیانہ می گردید و گردیدن نداشت

لغت: ”گردیدن“ = دور میں آنا۔ گھومنا = اس کا دوسرا مفہوم ایک حالت سے دوسری حالت میں آ جانا، تیسرا مفہوم ہے پلٹ کے آنا۔ پیانہ می گردید“ کے معنی ہیں کہ پیانہ گردش میں تھا اور ”گردیدن نداشت“ کا مطلب ہے الٹا پھر کے نہیں آتا تھا۔

کل رات میری خلوت سرا میں فرش پر پھول کثرت سے بکھرے ہوئے تھے۔ اور شراب اتنی تیز و تند تھی کہ جام خود بخود گردش میں آ گیا تھا، مسلسل چلا جا رہا تھا۔ اور پلٹ کے نہیں آتا تھا۔

دیر خواندی سوی خویش و زود فہمیدم در بے

بیش ازین پایم ز گرد راه پیچیدن نداشت

تو نے مجھے بڑی دیر کے بعد بلایا اور میں تیرے مقصد کو پا گیا۔ افسوس (تیری راہ میں چلتے چلتے اتنا خستہ و در ماندہ ہو گیا ہوں) کہ اس سے زیادہ غبار راہ میں پیچ و تاب کھانے کی میری ناگوں میں سکت باقی نہیں۔ معشوق کی ستم ظریفی دیکھیے کہ عاشق کی طرف اس وقت توجہ کی جب وہ اس توجہ سے بہرہ ور ہونے کے قابل نہ رہا تھا:

ہائے اس زود پشیمایاں کا پشیمایاں ہوتا

جوش حسرت بر سر خاکم ز بس جا تنگ کرد

ہچو نبض مردہ دود شمع جبیدن نداشت

لغت: ”نبض مردہ“ جو نبض چلنے سے رہ گئی ہو۔

میری قبر پر حسرتوں کا اتنا ہجوم ہے کہ جگہ تنگ ہو گئی ہے یہاں تک کہ شمع مزار کا دھواں بھی مل نہیں سکتا، ”نبض مردہ“ بن کر رہ گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہماری قبر پر شمع بھی نہیں جلتی۔ حسرت برس رہی ہے۔

شمع کے تھمے ہوئے دھوئیں کو نبض مردہ سے تشبیہ دینا حسرت ناک منظر پیش کرتا ہے۔

گر منافق وصل ناخوش و موافق ہجر تلخ

دیدہ داغم کرد روئی دوستان دیدن نداشت

اگر دوست منافق ہے تو اس کا ملاپ دکھ دے گا اگر وہ موافق ہے تو اس کی جدائی سے



صدمہ ہوگا۔ اس احساس نے میری آنکھوں کو جلا دیا اور دوستوں کے دیکھنے سے رو گیا۔ مولانا حالی اس شعر کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

یعنی دوستوں کا منہ دیکھنا اور ان سے تعارف کرنا میں چاہیے تھا کیونکہ جو منافق ہیں ان کا ملنا ناگوار ہے اور جو موافق ہیں ان کی جدائی تلخ ہے۔

برو آدم از امانت ہر چہ گردون برنافت

ریخت نمی بر خاک چون در جام گنجیدن نداشت

انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار امانت سونپا گیا اور اس نے اس بار امانت کو اٹھالیا۔ اس بات کی وضاحت قرآن پاک میں موجود ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

انما عرضنا الامانة على السموات والارض والجبال فابين ان  
تحملننا واشفقن منها وحملها الانسان، انه كان ظلوماً جهولاً؛

ہم نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے بار امانت پیش کیا، لیکن انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اس کو اٹھالیا۔ وہ یقیناً بہت ظلم کرنے والا اور بے خبر تھا (نتائج سے)۔

قرآن نے انسان کو اس بار امانت کے اٹھانے پر کہا کہ انسان نے بہت بھاری فرض اپنے ذمے لے لیا۔ مرزا غالب نے اس پر ایک اور ہی زاویے سے نگاہ ڈالی ہے اور انسان کی بولچھی پر ایک لطیف طنز کی ہے۔ کہتا ہے:

امانت کے سلسلے میں آسمان جس چیز کی تاب نہ لا سکا وہ آدم نے لے لی۔ جام میں جو شراب سمانہ سکی وہ خاک پر گر گئی۔ اصل عطیات الہی تو آسمان زمین اور پہاڑ لے گئے، امانت ایک بچی کھچی شے انسان کے ہاتھ لگ گئی، اسی سے پھولا نہیں سکتا۔

گر نیم آزاد خود را در تعلق با ختم

سود زیر کوه دامانی کہ بر چیندن نداشت

لغت: "دامن بر چیندن" دامن اٹھالینا۔ (دامن جھاڑ کر) کسی شے سے قطع تعلق کر لینا۔ کسی بھاری پتھر کے نیچے دامن کا آجانا، مجبوری کے عالم کو ظاہر کرتا ہے۔

"سود زیر کوه" چٹان یا پتھر کے نیچے رہ کر ٹھس گیا یعنی وہیں کا ہو رہا۔ "در تعلق با ختم" = میں تعلقات (دنیوی) میں الجھ گیا۔

میں آزاد نہ تھا۔ (مجبور تھا) اس لیے چاروٹا چار علاقے دینا میں پھنس گیا۔ جو دامن اٹھایا نہ گیا وہ پتھر کے نیچے آ کر پھنس گیا۔ یعنی انسان فطرۃً مجبور ہے اور اس کا دنیا کے علاقے میں پھنسا ایک فطری بات ہے ورنہ وہ اپنا دامن جھاڑ کر الگ نہ ہو جاتا۔

مرزا غالب نے عشق اور عشق کے جذبہ وفا کی ایسی ہی توجیہ کر کے اس پر ایک طنز کی ہے:

مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت

دست نہ سنگ آمد بیان وفا ہے

عاشق مجبور ہے اور دعویٰ یہ کر رہا ہے کہ دیکھو میں کیسا اسیر الفت ہوں کہ اس سے آزاد نہیں ہونا چاہتا حالانکہ جسے وہ پختہ بیان وفا کہتا ہے وہ اس ہاتھ کی طرح ہے جو بھاری پتھر کے نیچے دب رہا ہے اور نکال نہیں جاسکتا، ورنہ عاشق نکال کر الگ ہو جاتا۔

نامرادی بود نوعی آبرو غالب، دروغ

در ہلاک خویش کوشیدیم و کوشیدن نداشت

ہم نے اپنی بلاکت کی منتہی و بحر کوشش کی، ناکام رہے۔ افسوس اسی ناکامی اور نامرادی ہی کو اپنی آبرو کہنا پڑا۔





## غزل نمبر (۳۷)

بہ بین کہ در گل و مل جلوہ گر برای تو کیست  
 میوش چشم ز حق طالب رضای تو کیست  
 دیکھ کہ گل دے تیرے لیے کون اپنی جلوہ گری دکھا رہا ہے۔ حق سے آنکھیں نہ  
 پھیر، دیکھ کہ کون تیری رضامندی کا طالب ہے، یعنی کون تیری مرضی کے اشاروں پہ چلنے  
 کا منتظر ہے۔  
 کائنات کا ہر ذرہ انسان کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سب اسی  
 ذات کی جلوہ گری ہے جسے انسان تلاش کر رہا ہے۔

چہ نا کسی کہ ز دردِ فراق می نالی  
 نمی رسی کہ درین پردہ ہمنوای تو کیست

لغت: ”پردہ“ کے ایک معنی ”سر“ کے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں پردہ، حجاب اور سر  
 دونوں کے رعایت سے آیا ہے۔

”رسیدن“ = پہنچنا، کسی معاملے کی تہ کو پالینا۔

تو کیسا نا اہل ہے کہ فراق کے دکھوں فریاد کر رہا ہے۔ اس بات کو نہیں سمجھتا کہ اس پردے  
 میں تیرا ہمنوا کون ہے۔

انسان حق کی تلاش میں پریشان ہے اور اسے نہ پا کر جدائی کے ہاتھوں فریاد کرتا  
 ہے۔ اس راز کو نہیں جانتا کہ اس عالم جدائی میں وہی اس کا ہمنوا ہے۔

کلید بستگی تست غم، بجوش ای دل

تو گر چنین نگدازی، گرہ کشای تو کیست

لغت: ”بستگی“ = بند ہونا، طبیعت کی گھٹن۔

”گرہ کشائے“ = گرہ کو کھولنے والا۔ گھٹن کو دور کرنے والا کہتا ہے کہ تیری طبیعت کی  
 گھٹن کو دور کرنے کی کنجی غم ہے یعنی غم ہی تیری افسردگی کا مداوا ہے۔ اے دل غم کا طوفان پھا کر۔  
 اگر تو غم سے گداز نہیں ہوگا تو پھر کون سی شے تیری گرہ کشائی کرے گی۔

شکایتی نفروشی و عشوہ نخری

تو آشنا کہ خواجہ و آشنای تو کیست

لغت: ”شکایت فروختن“ لغوی طور پر شکایت فروشی کرنا یعنی بہت زیادہ شکوہ  
 شکایت کرنا۔

”عشوہ خریدن“ = لغوی طور پر ناز و ادا خریدنا یعنی ناز و ادا کی داد دینا۔

نہ تیرے لب پر کسی محبوب کے جو رستم کے خلاف فریاد ہے اور نہ ہی تو کسی کے ناز و  
 ادا کا چاہنے والا ہے۔ پھر بتا تو سہی، تو کس کا آشنا ہے اور کون تیرا آشنا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے:  
 اپنا کسی کو کر لو یا ہو رہو کسی کے

ترا کہ مو جہ گل تا کمر بود در یاب

کہ غرق خون بہ در بوستا نسرای تو کیست

تو کہ کمر تک پھولوں میں لپٹا ہوا ہے۔ یہ تو معلوم کر کہ تیرے باغ کے دروازے پر  
 کون خون میں غرق ہے۔



محبوب رنگ و بو میں کھیل رہا ہے۔ اُسے یہ معلوم نہیں کہ اُس کا عاشق کس طرح خون میں تڑپ رہا ہے۔

بلا بہ صورت زلف تو رو بھا آورد

بہ بند خصمی دھرم، بتلای تو کیست

لغت: ”رو بھا“ = دولہا جب پہلی دفعہ دلہن کی صورت دیکھتا ہے تو کوئی تحفہ دیتا ہے وہ رو بھا ہے رونمائی۔ ”بند خصمی“ = دشمنی

دنیا کی مصیبتیں تری زلف کی صورت دیکھنے کی رونمائی ہے۔ ہم تو زمانے کی دشمنی میں پھنسے ہوئے ہیں، تیرا سیر کون ہے۔

ہمیں تو محبت نے دنیا کی مصیبتوں میں پھنسا دیا۔ کون ایسا خوش نصیب ہے جسے صرف محبوب ہی کا غم ہوگا۔

تراست جلوہ فراوان درین بساط، ولی

حریف بادۂ میخوارہ آزمای تو کیست

لغت: ”بادۂ میخوارہ آزمای“ = وہ شراب جو میخوار کی نئے نوشی کو آزمائے۔ تند و تیز شراب جسے پی کر بڑے بڑے نوش مست ہو جاتے ہیں۔ محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے:

محفل میں تیرے جلوؤں کی فراوانی تو ہے لیکن ان جلوؤں کی تیز و تند شراب کو برداشت کرنے والا کون ہے، یعنی کوئی نہیں۔ کیست کا استفہام انکاری ہے۔

ز وارثان شہیدان ہراس، یعنی چہ

قوی است دست قضا کشتہ ادای تو کیست

لغت: ”کسی کو مار دیا جائے تو مرنے والے کے وراثت قاتل سے قصاص لیتے ہیں۔ شہیدان محبت کے وارثوں سے ڈر کیسا، یہ سارا کرشمہ تو قضا کے ہاتھوں کا ہے جس سے وہ شہید ہوئے ہیں، تیری ادا کا شہید کون ہے۔

محبت میں جان دینا بھی قضای کا کام ہے

بہ انتظار تو در پاس وقت خوشنم

فریب خوردۂ نیرنگ وعدہ ہای تو کیست

لغت: ”نیرنگ وعدہ“ = وعدوں کا عجیب و غریب انداز جس سے انسان فریب کھا جاتا ہے۔

ہمیں تیرے انتظار میں دراصل اپنے ہی وقت کا پاس ہے۔ تیرے وعدوں کے طلسماتی انداز سے فریب کھانے والا کون ہے۔ یعنی ہم تیرے وعدوں سے فریب کھا کے تیرا انتظار نہیں کرتے بلکہ ہمیں انتظار کرنے میں لطف آتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے وقت کی خوش نصیبی ہے۔

کوئی اور ہوگا جو تیرے وعدے کے فریب میں آجائے۔

ز لال لطف تو سیرابی ہوسناکان

یکی بہ بین کہ جگر تشنہ جفائی تو کیست

لغت: ”زالال“ = آب لذیذ و شیریں۔

تیری مہربانیوں اور نوازشوں کا پانی اہل ہوس کو تو سیراب کرتا ہے، کبھی اس بات کا بھی احساس کر کہ تیری جفاؤں کا پیاسا کون ہے؟ اہل ہوس تیرے لطف و عنایت سے خوش



ہوں تو ہوں، ہمیں تیری جفاؤں میں حزن ملتا ہے۔

ترا ز اہل ہوس ہر کی بجای من است

تو و خدای تو، شاہم، مرا بجای تو کیست

تیری نظر میں تو میں اہل ہوس کی طرح ایک ہوں۔ یعنی تو بھی مجھے انہی کے زمرے میں شمار کرتا ہے۔ تجھے خدا تم اسے میرے شاہ حسن، میرے لیے تیرے سوا کون ہے یعنی میری نظر میں تو تو ہی تو ہے۔

فرشتہ ! معنی ”من ربک“ ”نمی فہمم

بمن بگوی کہ غالب بگو خدای تو کیست

قبر میں آکر سوال کرنے والے فرشتے سے خطاب کر کے کہتا ہے:

میں ”من ربک“ کے معنی نہیں سمجھتا۔ مجھ سے تو تو یہ کہہ غالب بتا تیرا خدا کون ہے۔

”من ربک“ عربی ہے اور خدای تو کیست“ فارسی۔ دونوں کا ایک مفہوم ہے، یعنی

تیرا خدا کون ہے۔؟ یہ شعر غالب کی شوخی طبیعت کو ظاہر کرتا ہے۔



## غزل نمبر (۳۸)

بودی کہ در آن خضر را عصا خفتست

بسینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفتست

لغت: ”خضر“ = ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بھولے بھٹکوں کو راہ دکھاتے ہیں۔ فارسی اور اردو ادب میں خضر کا لفظ رہنمائی اور رہبری کی علامت بن گیا ہے۔

”پا خفتن“ = پاؤں کا سوجانا۔

”خضر را عصا خفتست“ = ”خضر کا عصا سوج گیا ہے“ میں یعنی خضر بھی رہنمائی نہیں

کر سکتا۔ ان الفاظ میں اضافی ہے یعنی اضافت کے معنی دیتا ہے۔ خضر را عصا سے مراد عصا ہے خضر ہے۔

اُس وادی میں جہاں خضر بھی عاجز ہو کر رہ گیا ہے، میں راستے کو سینے کے بل طے کرتا ہوں اگرچہ میرے پاؤں سوج گئے ہیں۔ سفر شوق خضر کے بس کا روگ نہیں۔ اس سفر کو عاشق ہی طے کرتے ہیں۔

بدین نیاز کہ باتست، نازی رسد

گدا بہ سایہ دیوار پادشا خفتست

اس نیاز مندی پر جو مجھے تجھ سے ہے، میں ناز کرتا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ ایک گدا ہے جو بادشاہ کے محل کی دیوار کے سائے تلے سو رہا ہے۔

گدا حقیر انسان ہے لیکن سایہ دیوار بادشاہ میں (بادشاہ کے دیوار کے سایہ میں) سوتا اس کے لیے باعث فخر ہے معشوق سے نیاز مندی کا اظہار عاشق کے لیے ناز ہے۔



بہ صبح حشر چنین خستہ رویہ خیزد

کہ در شکایت درد و غم دوا نداشت

نعت: ”اس شعر میں ”نخست“ کا لفظ بڑا پہلو دار ہے۔ اس کے معنی ایک تو ”سویا ہوا“ ہے۔“ اور پھر لفظ حشر کے اعتبار سے اس کا دوسرا مفہوم ”تہ خاک ہونا“ ہے۔

جو شخص زندگی بھر درد و رنج کی شکایت کرتا رہا اور پھر اس درد کو دور کرنے کے لیے دوا تلاش کرتا رہا اور آخر اسی دھن میں مر گیا۔ ایسا خستہ حال قیامت کے دن، رویا ہوا ٹھے گا۔ سچے عاشق تو درد و محبت کو سینے سے لگا لیتے ہیں اور انھیں چارہ درد کا فکر نہیں ہوتا۔ انہیں اس درد سے راحت ملتی ہے۔ جو شخص یہ نہیں کر سکتا اور درد کے ہاتھوں فریاد کرتا ہے اور مداوے درد تلاش کرتا ہے اور اسی فکر میں مر جاتا ہے، اس کی عاقبت خراب ہوگی۔

خروشِ حلقہٴ رندان ز نازنین پسری است

کہ سر بہ زانوی زاهد بہ بوریا نداشت

۔ زاهد لوگ اکثر رندوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ خود ان کی یہ حالت ہے کہ ایک خوبصورت نازنین لونڈا ایک زاهد کے زانو پر سر رکھے سویا ہوا ہے۔ رندوں کو اس بات کا پتا چل جاتا ہے اور وہ شور مچا رہے ہیں کہ دیکھو کیا ہو رہا ہے۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز

کستہ لنگر کشتی و نا خدا نداشت

ہوا مخالف ہے، رات تاریک ہے اور سمندر میں لہروں کا طوفان ہوا ہے کشتی کا لنگر ٹوٹ گیا ہے اور نا خدا سویا ہوا ہے

اس شعر کو پڑھتے ہی خیال حافظ کے اس شعر کی طرف جاتا ہے:

شب تاریک و بیم موج و گردای چنین حائل

کجا دانند حال ما سبک ساران سا حلھا

دونوں شعروں میں سیاہ رات اور سمندر، طوفان اور کشتی کا نقشہ ہے جن سے مسافروں کی خستہ حالت کا پتا چلتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ حافظ کے یہاں تصویر نامکمل ہے اور مرزا غالب کے یہاں مکمل ہے۔ مسافروں کی حالت کا ذکر نہ کرنے کے باوجود ان کی بے چارگی اور خستہ حالی کی تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

غممت بشہر شبنمیں زنان بہ بنگہ خلق

عسس بخانہ وشہ در حرم سرا نداشت

نعت: ”عسس“ = کو تو ال۔

کو تو ال اپنے گھر میں اور بادشاہ اپنی حرم سرا میں سویا ہوا ہے، اور ادھر تیرا غم ہے کہ (کھلے بندوں) راتوں کو لوگوں کے ٹھکانوں پر ڈاکے ڈال رہا ہے۔

یعنی محبت کی غارت گری کا یہ عالم ہے کہ غم محبوب لوگوں کے دلوں میں سایا ہے اور وہ راتوں کو سونہیں سکتے اور اس ظلم کی روک تھام اور دادرسی کرنے والے دونوں سو رہے ہوتے ہیں۔

دلہ بہ سبجہ و سجادہ و رواء لرزد

کہ دزد مرحلہ بیدار و پار سا نداشت

میرادل تسبیح، مصلے اور چادر تینوں کی حالت زار دیکھ کر لرز رہا ہے۔ عجیب عالم ہے کہ رجزن جاگ رہا ہے اور پار سا، جس کا کام راتوں کو جاگ کر عبادت کرنا ہے، غافل سویا ہوا ہے۔



اس شعر میں بھی مرزا غالب کی شوقی طبیعت نمایاں ہے۔

سورازی شب و بیداری من استنہمہ نیست

ز بخت من خبر آرید تا کجا خفتست

فراق کی طویل راتوں کی درازی اور میری بیداری تو کوئی ایسی بات نہیں۔ میرے نصیبے کا پتا لو کہ وہ کتنی گہری نیند سویا ہوا ہے، یعنی فراق زدہ انسانوں کا راتوں کو جاگنا ہی بتاتا ہے کہ ان کے نصیب سوئے ہوئے ہیں۔

بہ بین ز دور و مجو قرب شہ کہ منظر را

در پچہ باز و بہ دروازہ اژدھا خفتست

لغت: ”منظر“ دیوار کے باہر (خاص کر اوپر کی منزل میں) ایک چھجنا جگہ جس کی تین کھڑکیاں ہوتی ہیں تاکہ وہاں سے سامنے اور دائیں کی چیزیں نظر کے سامنے آجائیں۔

کہتا ہے کہ بادشاہ کے قریب ہونے کی خواہش نہ کر، بس دور ہی سے نظارہ کر۔ دیکھ کہ منظر کے درپے تو کھلے ہیں لیکن محل کے دروازے پہ اژدہا سویا ہوا ہے۔ منظر دعوت نظارہ دے رہا ہے۔ لیکن اس منظر سے کسی کو قرب شاہ کے حصول کی جرأت نہ ہو۔ یہ غلط ہے کیونکہ دروازے پہ ایسا پاسبان ہے جو اژدہا کی طرح راستہ روکے ہوئے ہے۔

شہ سے شاہ حسن بھی مراد ہو سکتی ہے اور دوسرے بادشاہ بھی۔

براہ، خفتن من، ہر کہ بگردد داند

کہ میر قافلہ در کاروان سرا خفتست

میں راستے میں سویا پڑا ہوں، میری اس حالت کو جو کوئی بھی دیکھتا ہے سمجھ جاتا ہے کہ اس قافلے کا سردار، کارواں سر میں سویا ہوا ہے۔

جب میر قافلہ فی یہ حالت ہو تو قافلے کے لوگوں کا کیا حشر ہوگا۔

دگر ز ایمنی راہ و قرب کعبہ چہ حظ

مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

مجھے راستے کے پر امن ہونے اور کعبے کے قریب ہونے سے کیا خوشی ہوگی۔ میری اونٹنی تو تھک کر چور ہو گئی ہے اور میرے اپنے پاؤں سو گئے ہیں۔ یعنی مجھ میں خود چلنے کی سکت نہیں۔

منزل تک رسائی، منزل کے قریب ہونے سے نہیں بلکہ رہروں کی ہمت سے ہوتی ہے۔

بخواب چون خودم آسودہ دل بدان غالب

کہ خستہ غرقہ بخون خفتہ است تا خفتست

اے غالب! مجھے سوئے دیکھ کر اپنی طرح آسودہ دل نہ سمجھ، کہ خستہ دل انسان سویا ہوا بھی ہو تو ایسے جیسے کوئی خون میں ڈوبا ہوا سو رہا ہے۔

دلفگاروں کی نیندیں بھی بیداری کی طرح تلخ ہوتی ہیں۔





## غزل نمبر (۳۹)

کشتہ را رشک کشتہ دگر است  
من و زخمی بر دل از جگر است

یوں تو دل اور جگر دونوں محبت کے مارے ہوئے ہیں، لیکن زخم محبت کے علاوہ، زخم رشک بھی کھائے ہوئے ہیں۔ میرے دل کو دیکھو کہ اس پر جگر نے زخم لگایا ہے اور وہ یہی زخم رشک ہے۔ مراد یہ ہے کہ دل اور جگر دونوں کشتہ محبت ہیں اور پھر دونوں ایک دوسرے کے شہید رشک بھی ہیں:

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے ہوئے ہیں

زند اجزای روز گار زہم  
روز و شب در قفای یکدگر است

لغت: ”اجزائے روزگار زہم“ = زمانے کے اجزا ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے، بکھر جائیں گے۔ زمانہ درہم برہم ہو جائے گا۔  
”ورقفا است“ پیچھے لگا ہوا۔ تاک میں ہے۔

رات دن، ایک دوسرے کے تعاقب میں ہیں زمانے کے اجزا بکھر کر رہیں گے۔

مستی انداز لغزشی دارد

حیف پائی کہ آفتش ز سر است

مستی میں لغزش کا سا انداز ہوتا ہے۔ افسوس اس پاؤں پر جس پر سر سے آفتیں نازل

ہوتی ہیں۔

مستی سر میں ہوتی ہے اور بقول شاعر مستی کیا ہے۔ ایک طرح کی لغزش ہے۔ ایسی حالت میں پاؤں کا کیا حشر ہوگا، وہ کتنی لغزشیں کھائے گا۔

نالہ را مالدار کرد اثر

دل سختش، دکان شیشہ گر است

ہماری فریاد کو، اس کی اثر انگیزی نے مالدار بنادیا۔ محبوب کا دل سخت جو پتھر کی طرح تھا اب نرم ہو کر شیشے کی طرح ہو گیا ہے۔ اس کا ہر ٹکڑا ایک شیشہ بن گیا ہے اور وہ دل نہیں، گویا شیشہ گر کی دکان معلوم ہوتا ہے۔

ایک پتھر شیشہ بن جائے تو اس کی قیمت خود بخود بڑھ گئی۔ یہی مالدار کی نشانی ہے۔

دوستان دشمن اند، ورنہ مدام

تغ او تیز و خون ما ہدر است

لغت: ”ہدر“ = رانگاں۔ ”خون ہدر“ = وہ خون جس کا کوئی قصاص نہ ہو اور رانگاں جائے۔

ہمارے دوست ہی ہمارے دشمن ہیں (جو ایسا ہونے نہیں دیتے) ورنہ محبوب کی تلوار تیز ہے اور ہمارے خون کا کوئی قصاص نہیں۔

پردہ عیب جو دریدہ او

نوک کلکم ز دشنہ تیز تر است

لغت: ”عیب جو“ = عیب نکالنے والا۔ ”کلکم“ = قلم۔ میرے قلم کی نوک ٹخڑے



زیادہ تیز ہے۔ اس نے عیب جو (مخالف) کا پردہ پھاڑ ڈالا ہے۔

عقل و دین بردہ، دل و بان نیز

آنچه از ما نہ بردہ خبر است

تو نے (محبت میں) ہم سے عقل و دین بھی چھین لیے اور دل و جاں بھی۔ ہاں ایک چیز تو ہم سے نہیں چھین سکا اور وہ خبر ہے یعنی اس بات کا راز کسی کو معلوم نہیں ہوا۔ یہ راز صرف ہم جانتے ہیں۔ کسی اور کو اس کی خبر نہیں۔

شہ حریر و گدا پلاس برید

آنچه من قطع کردہ ام نظر است

بادشاہ نے ریشم کو پھاڑ ڈالا اور گدا نے بوریائی لباس۔ جو میں نے قطع کیا ہے وہ نظر ہے، یعنی بڑا چھوٹا انسان سبھی سبھی چیزوں سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ میرے پاس سوائے نظر کے تھا ہی کیا۔ میں نے اسی سے قطع تعلق کر لیا۔ گویا ہر شے سے قطع نظر کر لی۔ یہ بڑا قطع تعلق ہے۔

منت از دل نمی توان برداشت

شکر ایزد کہ نالہ بی اثر است

لغت: "منت" = احسان۔

دل کا احسان نہیں اٹھایا جاتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا نالہ بے اثر ہے۔ جگر وہ اثر انگیز ہوتا

تو دل کا احسان ہم پر ہوتا۔

مراد یہ ہے کہ عاشق دل سے فریاد نہیں کرتا، اسی لیے فریاد بے اثر رہتی ہے۔ یہ بات عاشق کی بے نیازی کو ظاہر کرتی ہے جو اسے ہر طرح کے جوہر و تہمت سہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

نفس و دام را گناہی نیست

ریختن در نہاد بال و پر است

لغت: "ریختن" = گرنا۔ "ریختن بال و پر" = بال و پر کا گر جانا۔ "نہاد" = فطرت، طبیعت۔

نفس ہو یا جال، جب پرندہ اس میں گرفتار ہوتا ہے تو اپنی رہائی اور آزادی کے لیے انتہائی کوشش کرتا ہے اور اس مسلسل کوشش میں اس کے بال و پر جھڑ جاتے ہیں۔ کہتا ہے، نفس و دام کا اس میں کیا تصور، بال و پر کا جھڑ جانا، ان کی سرشت میں ہے۔ نفس و دام نہ ہوں گے تو ویسے ہی جھڑ جائیں گے۔

ریزد آن برگ و این گل افشانند

ہم خزان، ہم بھار در گذر است

لغت: "در گذر است" = گزشتہ اور رفتنی ہے۔ خزاں ہو کہ بہار دونوں گزر جانے والی ہیں۔ خزاں میں پتے جھڑتے ہیں اور بہار میں پھول۔

کم خود گیر بیش شو غالب

قطرہ از ترک خویشتن گھر است

فارسی میں ایک محاورہ ہے "کم چیزے گرفتن"، یعنی کسی چیز کو حقیر سمجھ کر تھج دینا۔ "کم



خود گیر“ یعنی اپنے آپ کو تھ دے۔ ترک خودی کرنا۔

اے غالب اپنے آپ کو کم شمار کر (ترک خودی کر) اور زیادہ ہو جا (قدر و قیمت میں اضافہ کر) قطرہ جب اپنی ہستی کو ترک کرتا ہے تو موتی بن جاتا ہے۔



## غزل نمبر (۴۰)

ہند را رند خن پیشہ گمنامی ہست

اندین دیر کھن میکدہ آشامی ہست

لغت: ”دیر“ معبد ترسایاں۔ آتش پرستوں کی عبادت گاہ۔ چونکہ آتش پرستوں کے ہاں شراب حلال تھی اس رعایت سے ”دیر کھن“ کے لفظ یہاں میکدے کا مفہوم دے رہے ہیں۔ اور پھر ہند کے لفظ کی مناسبت سے بتجانہ بھی مقصود ہے، جو حرم کی ضد ہے۔

ہند میں ایک رند ہے جس کا پیشہ شاعری ہے مگر وہ گمنام پڑا ہے۔ اس میکدے میں ایک میکدہ نوش بیٹھا ہے۔

غالب کی شاعری کی عظمت کو اس کے ہم عصروں نے نہ پہچانا، وہ گمنام رہا۔ وہ شراب پیتا تھا مگر بقدر ظرف میسر نہ آئی۔

خسروی بادہ درین دور گرمی خواہی

پیش ما آئی کہ تو جرہ از جامی ہست

لغت: ”خسروی بادہ“ = بادہ خسروی (خسرو پرویز سے منسوب) جو شراب نوشی اور عیش پرستی کے لیے مشہور تھا۔

”نہ جرہ“ = وہ قطرہ شراب جو جام میں رہ جاتا ہے۔

اگر تو اس دور میں بادہ خسروی کا خواہاں ہے تو ہمارے پاس آ کیونکہ یہاں ہمارے جام کی تہہ میں کچھ سرے باقی پڑے ہوئے ہیں۔

مرزا غالب اپنے دور کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دور میں عیش و نشاط کا سماں کہاں میسر ہے، ہاں اگر کوئی کیفیت نظر آتی ہے تو ہمارے جیسے رندان درویش منش لوگوں کی صحبت میں جہاں چند قطرے ہی سہی لیکن وہ چند قطرے جام خسروی سے زیادہ پر ارزش ہیں۔

نامہ از سوز و رنم، بہ رقم سوختہ شد

قاصد اردم زند از حوصلہ، پیغامی ہست

(میں نے خط لکھنا شروع کیا) خط میرے سوز پنہاں سے لکھتے لکھتے جل گیا۔ اب اگر قاصد حوصلے کا دعویٰ کرے تو ایک پیغام (زبانی) ہے۔

یعنی جو کچھ عاشق کہنا چاہتا ہے وہ احاطہ تحریر میں نہیں آ سکتا۔ ہاں اگر قاصد میں سننے اور سنانے کی تاب ہو تو زبانی پیغام بھیجا جاسکتا ہے۔

چند و آزادی جاوید، ہما را نازم

کش بھر سوکشی از شکن دای ہست

الو کو کون جال میں پھنسانے کی کوشش کرے گا، وہ تو ان مخصوص سے آزاد ہے۔ ہاں، ہمارے مجھے ناز ہے کہ اسے حلقہ دام میں گرفتار کرنے کے لیے ہر طرف سے کش کا سلسلہ جاری ہے۔ چند قسم کے لوگ دنیا میں بے فکر جیتے ہیں، دنیا کے خرنشے تو اہل کمال ہی کا حصہ ہیں۔



گفتہ اند از تو کہ بر سادہ دلان بخشائی

پختہ کاری است کہ مارا طمع خامی هست

لغت: ”طمع خام ایسی خواہش جس کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہ ہو۔ ایسی خواہش رکھنے والے بالعموم بڑے سادہ لوح انسان ہوتے ہیں۔ پختہ کاری“ = طمع خام کی ضد۔ تجربہ کاری۔

یہ عاشق کے پختہ کار ہونے کی دلیل ہے کہ وہ طمع خام لیے بیٹھا ہے کیونکہ اس نے سن رکھا ہے کہ محبوب ایسے سادہ دل لوگوں کو معاف کر دیتا ہے۔ محبوب سے مراد محبوب حقیقی بھی ہو سکتا ہے۔ نظیری اسی قسم کی سادہ دلی کا تذکرہ یوں کرتا ہے۔

مرا بہ سادہ دلی حای من توان بخشد

خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

کہ رخ آرائی و گہ زلف سیہ تاب دہی

یاد ناری کہ مرا تیرہ سر انجام هست

لغت: ”تاب دادن“ = مل دینا، تاب دہی“ اسی سے صیغہ واحد مخاطب ہے۔

”یاد ناری“ = یاد ناری کا مخفف، یعنی تو یاد نہیں رکھتا ”تیرہ سر انجام“ = یعنی انجام سیہ۔

کبھی تو اپنا چہرہ آراستہ کرتا ہے، کبھی اپنی زلفوں میں پیچ و خم ڈالتا ہے۔ تو یہ بھول جاتا ہے کہ میرا انجام بہت سیہ ہے۔

”میرا انجام سیہ ہے“ سے دو مفہوم لیے جاسکتے ہیں، ایک تو یہ کہ تو چہرے کو آراستہ کرے یا زلفوں میں خم ڈالے، انجام کار میرا حال برا ہے۔ دوسرا یہ کہ مجھ سے بخت کے لیے زلف سیہ ہی کے بل موزوں ہے۔

بی تو گر زبستہ ام سختی این درد بسج

بگذر از مرگ کہ وابستہ ہنگامی هست

اگر تیرے بغیر زندہ رہا ہوں تو تجھے یہ اندازہ لگانا چاہیے کہ میں نے یہ دکھ کیسے برداشت کیا ہوگا۔ موت کو چھوڑ دے، موت کا معاملہ تو ایک لمحے کی بات ہے۔ مولا نا حالی فرماتے ہیں: موت کے لیے ایک وقت معین ہے، اس سے قطع نظر کر اور یہ خیال مت کر کہ اب تک مرا کیوں نہیں بلکہ یہ دیکھ کہ اب تک زندہ کیوں کر رہا اور کیوں کربدائی کے رنج اور تکلیف کو برداشت کیا۔

کیست در کعبہ کہ رطلی ز نبیذم بخشد

ور گردگان طلبہ، جامہ احرامی هست

لغت: ”رطل“ = پیانہ شراب۔

”نبیذ“ = کھجور اور جو سے تیار کی ہوئی شراب۔ بعض فقہاء کے نزدیک اس کا پینا جائز تھا۔

”گردگان“ = وہ چیز جو گرو رکھی جائے۔

”جامہ احرام“ = وہ بن سلا کپڑا جو مناسک حج کے ختم ہونے تک حاجی پہنے رہتے

ہیں۔

کعبے میں کوئی ایسا شخص ہے جو مجھے نبیذ کا ایک پیالہ دے دے۔ اگر وہ شخص مجھ سے گرد کے طور پر کوئی چیز طلب کرے تو جامہ احرام حاضر ہے۔

می صافی ز فرنگ آید و شاہد ز تبار

ما ندانیم کہ بغدادی و بسطامی هست



بغداد اور بسطام کے شہر ہیں، ہم نہیں جانتے، ہوں گے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ شراب صاف فرنگ سے آتی ہے اور معشوق تیار سے۔

بر دل نازک دلدار گرانی مکناد

خواہش ما کہ جگر گوشہ ابراہی ہست

لغت: "گرانی مکناد" = گرانی کردن (گراں گزرتا)، کہیں گراں نہ گزرے۔ "مکناد" میں الف دعائیہ ہے۔

"ابراہم" = انتہائی اصرار۔

اللہ کرے کہ ہماری خواہش، جو ہماری اصرار کرنے والی طبیعت کا جگر گوشہ ہے یعنی ہمیں بڑی عزیز ہے، ہمارے محبوب کے نازک دل پر گراں نہ گزرے۔

عاشق کی پیہم خواہشوں سے محبوب کے نازک دل کا گھبرا جانا لازمی ہے۔

شعر غالب نبود وحی و گوئیم، ولی

تو و یزدان، نتوان گفت کہ الهامی ہست

غالب کے شعر وحی نہیں ہیں اور ہم یہ کہتے بھی نہیں، لیکن تجھے اللہ کی قسم کیا یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ الہام ہے۔



## غزل نمبر (۴۱)

نعل تو خستہ اثر التماس کیست

بخت من از تو شکوہ گزار سپاس کیست

لغت: "نعل" = لب سرخ۔ "سپاس" = شکریہ

رقیب، معشوق سے برسوں کے لیے پیہم التماس کرتا ہے، اور آخر اس کا اثر معشوق پر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اثر اس کے سرخ لبوں کی محسوسگی سے ظاہر ہے۔ رقیب معشوق کا سپاس گزار ہے۔ ادھر عاشق بد بخت ہے جو اپنی بد بختی کا رونا روتا ہے اور در پردہ، رقیب کے "سپاس" یا شکریہ کی شکایت کر رہا ہے۔

گیرم ز داغ عشق تو طرفی نہ بست دل

اینم نہ بس بود کہ جگر روشناس کیست

لغت: "طرف بستن" = فائدہ اٹھانا۔

صاحب کہتا ہے:

از سلسلہ زلف کسی طرف نہ بست است

عمرت کہ من ربط باین سلسلہ دارم

میں نے مان لیا کہ ترے داغ عشق سے میرے دل کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا کیا میرے لیے یہی کافی نہیں کہ "جگر کس کا روشناس ہے" یعنی معشوق میرے جگر سے آشنا ہے اور یہی ربط میرے لیے کافی ہے۔

مراد یہ ہے کہ دل کو تو وفا کا کوئی صلہ نہ ملا، البتہ جگر پر داغ لیے بیٹھے ہیں۔



لرزم بکوئی غیر ز بی تابلی نسیم

کندر امید داری بوی لباس کیست

لغت: "غیر" = مراد رقیب۔

میں کوچہ رقیب میں نسیم کے بے تابانہ چلنے سے لرز رہا ہوں کہ یہ کس کی بوی لباس سے سرفراز ہونے کی امید میں سرگردان ہے۔

عاشق کوچہ رقیب میں ہوا کے مستانہ دار چلنے سے اندازہ لگاتا ہے کہ ہونہ ہوسیم کی یہ بے تابلی معشوق کے لباس کی خوشبو کی تلاش کی وجہ سے ہے جو اس وقت رقیب کے ہاں موجود ہے۔

با او بہ ساز وصلی و با من بہ عزم قتل

آہ از امید غیر کہ ہم چشم یاس کیست

ضمیر "او" کا اشارہ رقیب کی طرف ہے۔

محبوب رقیب سے وصل کی ساز باز کر رہا ہے اور میرے قتل کی تدبیر سوچ رہا ہے۔ رقیب پر امید ہے اور میں یاس کا مارا ہوں۔ رقیب کی امید اور میری یاس دونوں ہم چشم ہیں یعنی حریف ہیں اس بارے میں مجھے رقیب کی حالت امید پر افسوس آ رہا ہے کہ میری یاس کی حریف ہے۔

از بی کسان شہرم و از ناکسان دھر

گر کشتہ سر تو سلامت، ہراس کیست

میں تو شہر کے بے کسوں میں سے ہوں اور دنیا کے حقیر انسانوں میں شمار ہوتا ہوں اگر

تو نے مجھے مار ڈالا ہے تو تیرا سلامت رہے۔ تجھے کس کا ڈر ہے، ایک لاوارث اور بے مایہ انسان کے خون کی کسی کو کیا پروا ہو سکتی ہے۔

از پرنیان بہ عربده راضی نمی شود

خار رہ تو چشم بہ راہ پلاس کیست

لغت: "پرنیاں" = ریشم و حریر۔ "پلاس" ناٹ۔

تیری راہ کا کانٹا ریشم سے الجھنے پر راضی نہیں ہوتا۔ یہ کس کے ناٹ کی تاک میں ہے۔

معشوق کی راہ کا کانٹا بھی عاشق کے ناٹ کے کپڑوں کے درپے ہے۔

لطف بہ شکوہ از ہوس بی شمار من

شوقم بہ نالہ از ستم بی قیاس کیست

تیرے لطف و عنایت کا جذبہ میری بے شمار خواہشات کا شاکہ ہے۔ میرا شوق کس کے بے حساب جو رستم سے نالاں ہے؟

معشوق کو عاشق کی تمنائوں کا گلہ ہے، وہ ان سب کو پورا نہیں کر سکتا اور عاشق معشوق کے بے حساب جو رستم سے فریاد کر رہا ہے۔ دونوں برابر کی چوٹ ہیں۔

گیرم کہ رسم عشق من آو ردہ ام بہ دھر

ظلم، آفریدہ دل حق ناشناس کیست

میں نے تسلیم کر لیا ہے کہ میں نے ہی دنیا میں رسم عشق کی بنیاد ڈالی ہے۔ آخر یہ جو



و ستم کس کے دل حق ناشناس کا پیدا کردہ ہے۔

یہاں کیست کا استفہام معشوق کے لیے ہے۔

صحن چمن نمونہ بزم فراغ تو

باد سحر علاقہ ربط حواس کیست

صحن چمن کیا ہے؟ تیرے سکون و راحت کا ایک نمونہ ہے۔ یہ باد سحری جو یوں (باغ میں) خراماں خراماں چل رہی ہے، اس کا تعلق کس کے بار ربط حواس کے ساتھ ہے۔

باغ محبوب کے سکون قلب و فراغت ذہن کا منظر پیش کر رہا ہے۔ باغ میں باد سحری کی خوش خرامی، اس منظر میں رقیب کی طرح سکون کے ساتھ گھومنے کو ظاہر کر رہی ہے۔

چنانچہ کیست کا استفہام، غیر رقیب کی طرف ہے۔ اسی کے حواس بجائیں۔ عاشق بے چارہ تو پریشان ہے۔

غالب، بت مرا نگہ ناز، قحط نیست

تا با منش مضائقہ چندین، بپاس کیست

اے غالب میرے محبوب کے پاس نگاہ ناز کی کمی نہیں ہے۔ پھر میرے ساتھ اس نگاہ ناز کو جو اتنی تنگی اور مضائقہ سے استعمال کیا جاتا ہے یہ کس کے پاس خاطر ہے؟ مراد رقیب کی خاطر۔



## غزل نمبر (۳۲)

آنکہ بی پردہ بہ صدر داغ نمایانم سوخت

دیدہ پوشید و گمان کرد کہ پنہانم سوخت

جس نے علی الاعلان سینکڑوں نمایاں داغ لگا کر مجھے جلایا، اُس نے (میرے جلنے سے) چشم پوشی کی اور خیال کر لیا کہ چپکے چپکے جلایا ہے یعنی کسی کو اس بات کا پتا نہیں چلا۔ کیا تم ظریفی ہے

نہ بدر جتہ شرار نہ بجا ماندہ رماد

سو ختم لیک نہ دامن بچہ عنوانم سوخت

لغت: ”سوختن“ = جلنا، لازم اور متعدی، دونوں کا مفہوم دیتا ہے چنانچہ اس شعر میں سوختم لازم ہے اور سوخت متعدی ہے۔

میں جل تو گیا لیکن مجھے معلوم نہیں، اُس نے مجھے کس طرح جلا دیا کہ نہ کوئی چنگاری ہی نظر آئی، نہ ہی راکھ باقی رہی۔

عبدالرحیم خان خاناں کا شعر ہے:

مرا فروخت محبت ولی ندانم

کہ مشتری چه کس است و بھائی من چند است

سینہ از اشک جدا دیدہ جدا می سوزد

این رگ ابر شرر بار پریشانم سوخت



شاعر نے آنسوؤں کے تار کو ”رگ ابر شر بار“ کہا ہے یعنی یہ آگ برسانے والا بادل ہے۔ کہتا ہے:

کہ ان آتیش آنسوؤں نے مجھے اتنا پریشان کر کے جلایا ہے کہ سینا لگ جل رہا ہے اور آنکھیں الگ۔

آنسوؤں نے آنکھوں کو تو جلانا ہی تھا، سینے کو بھی جہاں سے یہ آگ ابھر رہی ہے، جلا دیا ہے۔

حاجت افتادہ بروزم ز سیاہی بہ چراغ

دل بہ بی رونقی، مہر در خشناںم سوخت

میرا دل مہر در خشناں کی بے رونقی سے جل گیا، اتنی تاریکی تھی کہ دن کے وقت مجھے چراغ جلانا پڑا۔

ایک لطیف پہلو اس شعر کا یہ ہے کہ جو چراغ جلایا گیا، وہ یہی دل تھا جو مہر در خشناں کی بے رونقی پہ جل اٹھا تھا۔

دل جلوں کو دن بھی تاریک نظر آتا ہے۔ وہ سورج کو بے رونق دیکھ کر جل جاتے ہیں۔ یہی جلنا ہی گویا چراغ جلانا ہے کہ دن ذرا روشن ہو جائے۔

سودم از ارزشم افزون بود، آن خار و خشم

کز پی پشہ توان در چمنستانم سوخت

لغت: ”ارزش“ = قیمت۔ ”سود“ = نفع۔ خار و خشم = کوڑا کرکٹ۔

میری قیمت سے میرا نفع زیادہ ہے، میں وہ خار و خشم ہوں کہ مجھے ایک چھڑکے لے چمن میں جلایا جاسکتا ہے۔

کانٹوں اور ٹکڑوں کی باغ میں کچھ قدر وقیمت نہیں ہوتی، ہاں انھیں جلا کر چھڑوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ یہی فائدہ کافی ہے۔

کافر عشقم و دوزخ نہ بود در خور من

غیرت گرمی ہنگامہ صنعاںم سوخت

لغت: ”صنعاں“ = یمن میں ایک شہر جہاں کے شیخ صنعاں مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ وہ خدا رسیدہ بزرگ تھے لیکن ایک دختر ترسا پر عاشق ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت غوث الاعظم کی بددعا کا نتیجہ تھا۔ آخر بخشش ہو گئی۔ شاعر کہتا ہے:

میں کافر عشق ہوں، دوزخ میرے لیے مناسب جگہ نہیں۔ مجھے شیخ صنعاں کی عاشقانہ سرگرمیوں پر رشک آتا ہے۔ اور اس رشک کی آگ نے مجھے جلا دیا ہے۔

پایم از گرمی رفتار نمی سوخت براہ

در قدم سوختن خار بیابانم سوخت

میرے پاؤں میری گرمی رفتار سے نہیں جلتے۔ میرے قدموں کے نیچے جو کانٹے آئے ان کے جلتے نے مجھے جلا دیا۔





## غزل نمبر (۳۳)

در بذل لالی و رقم دست کریم است

نی نی نی، کلکم رگ مرگان یتیم است

لغت: "لالی" = لولو کی جمع، موتی۔ بذل لالی = موتی لٹانا۔

بخشش کرنا۔ موتی لٹانے میں میرا ورق، ایک غنی کے ہاتھ کی طرح ہے۔ نہیں نہیں، میرے قلم (کلک) کی نے، ایک یتیم کی مرگاں ہیں جن سے ہمیشہ آنسو بہتے ہیں۔ گویا شاعر کے اشعار گوہر ہائے آبدار کی طرح ہیں لیکن وہ دراصل اشکباے گرم ہیں جو اس کے سینے سے ابھرے ہیں۔

رُخ کف جم می چکد از مغز سفالم

سیرابی نطقم اثر فیض حکیم است

لغت: "سفال" = ٹھیکری، مراد جام سفالیں۔

رُخ = قطرہ قطرہ ٹپکنا۔ قطرہ۔

میرے جام سفالیں سے جو قطرہ ٹپکتے ہیں وہ گویا دست جمید سے ٹپکتے ہوئے قطرے ہیں۔ میرے نطق کی سیرابی فیض خداوندی کا اثر ہے، یعنی میری شاعری عطیہ ایزدی ہے۔

از آتشن لھر اسپ نشان می دهد امروز

سوزی کہ بہ خاکم ز تو در عظم رمیم است

لغت: "آتش لہر اسپ" = آتشکدہ لہر اسپ۔ "عظم رمیم" = گلی سڑی ہڈیاں۔

کہتا ہے کہ تیری محبت نے میرے جسم مردہ کی ہڈیوں میں آگ بھڑکائی ہوئی ہے۔ وہ لہر اسپ کا آتشکدہ معلوم ہوتی ہے۔

از حرف من اندیشہ گلستان خلیل است

از روی تو آئینہ کف دست کلیم است

میرے اشعار (حرف) سے میرے افکار گلستان خلیل بن گئے ہیں۔ حیرے چہرے کے عکس سے آئینہ کلیم کی تھیلی نظر آتا ہے یعنی میرے اشعار تخیل کو گلستان خلیل کی طرح گلفت کرتے ہیں اور محبوب کے عکس سے آئینہ ید بیضا بن جاتا ہے۔ "گلستان خلیل" اور "کف دست کلیم" سے شعر میں صنعت تلمیح آگئی ہے۔

چشم و نگہت گردش جامی زنبید است

کلک و ورقم تاب سھیلی بر ادیم است

لغت: "ادیم" = چڑا۔ "سھیل" = ایک ستارہ۔

عرب میں ایک جگہ طائف ہے جہاں کا چڑا بہت مشہور ہے کہ اس میں بجائے ہڈیوں خوشبو پائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سھیل ستارے کی چمک پڑنے سے اس میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔

مولانا جامی، رسول پاک کی نعت و مناجات میں رسول پاک سے کہتے ہیں:

ادیم طائفی نعلین پا کن

شراک از رشتہ جان ہای ما کن

(ادیم طائف کی نعلین زیب پا کر لے اور ہماری رگ جاں کو نعلین کا تہہ بنا لے)۔

حیری آنکھیں اور نگاہیں ایسی ہیں جیسے جام شراب گردش میں ہو۔ میرے قلم اور



کاغذ، ایسے ہیں جیسے سہیل کی روشنی ادیم پر پڑ رہی ہو۔

در جستن مانند تو نظاره زبون است

در زاون همجای من اندیشه عقیم است

لغت: ”عقیم“ = بانجھ عورت۔ ”مانند“ = مثل۔ نظیر۔ ”ہمتا“ = برابر کا شریک۔

تیرا نظیر ڈھونڈنے میں نظرس عاجز ہو کر رہ جاتی ہیں اور میرا ہمسر پیدا ہونے کے بارے میں تصور بانجھ ہو کر رہ جاتا ہے۔

یعنی محبوب کے حسن کا کوئی ثانی نہیں اور میرے جیسا عاشق اور شاعر بھی پیدا نہ ہوگا۔

ذوق طلبت، جنبش اجزای بھار است

شورن قسم، رعشہ اعضای نسیم است

تیری طلب و تلاش میں وہ لذت ہے جیسے اجزائے بہار حرکت میں آگئے ہوں اور میرے سانس کا شور ایسا ہے جیسے نسیم کے اعضا میں تھر تھری پیدا ہو گئی ہو۔

اس غزل کے دوسرے اشعار کی طرح اس شعر میں بھی دو مصرعوں کے الفاظ کا اتار چڑھاؤ اور اندرونی ترنم پایا جاتا ہے۔ اس شعر میں صنعت موجود ہے یعنی پہلے مصرعے میں جو الفاظ آئے ہیں وہ دوسرے مصرعے کے الفاظ کے ساتھ علی الترتیب ہم وزن ہیں۔ ذوق طلب کے لیے جنبش اجزائے بہار کا استعارہ اور شور نفس کے لیے رعشہ اعضائے نسیم کا استعارہ بے حد خوبصورت ہیں۔

در نطق میجا دم، از محصم چه باک است

در ناز خودی رمی، از غیر چه نیم است

میری قوت گویائی میں میجا کے سانس کا سا اعجاز ہے، مجھے دشمن کا کیا خوف۔ تو ناز میں اپنے سے بھی کھو جاتا ہے، تجھے رقیب کا کیا ڈر۔

شعر میں ”ز خودی رمی“ کے لفظی معنی ”اپنے آپ سے بھاگنا“ ہے، اس کا اردو ترجمہ بے خودی ہی ہے۔ یعنی معشوق اپنے ناز کے عالم میں بخود اور سرشار رہتا ہے۔ اسے رقیب کی طرف توجہ کرنے کی بھی فرصت نہیں۔

بی پردہ ستم کن، رخت از بادہ دورنگ است

بی صرفہ بنالم، دلم از غصہ دو نیم است

محبوب کا چہرہ شراب سے دورنگ ہے، یعنی چہرے کی سرفی سے ظاہر نہیں ہوتا کہ نشے کا اثر ہے یا غصے کا۔ دورنگی سے مقصود یہ ہے کہ چہرے کی سرفی میں نشے اور غصے کی آمیزش ہے۔ کہتا ہے کہ کھل کے ستم کر، تیرے چہرے میں نشے سے دورنگی آگئی ہے (ہمیں ستم اٹھانے میں مزہ نہیں آتا۔ پتا نہیں چلتا کہ تو نشے میں ایسا کر رہا ہے یا واقعی ستم ڈھانا چاہتا ہے)۔ میں بے فائدہ فریاد کر رہا ہوں، میرا دل غم سے دو نیم ہو رہا ہے۔ دو نیم دل سے فریاد کیا نکلے گی۔ پورا دل ہو تو کوئی بات بھی ہے، اس لیے بے صرفہ کا لفظ لایا ہے۔

بختم نہ دھد کام دل غم زدہ غالب

گوئی لب یار است کہ در بوسہ نسیم است

لغت: ”کام دل دادن“ = دل کی خواہش پوری کرنا۔ ”نسیم“ = کنبوس۔

غالب! میری بد نصیبی میرے غم زدہ دل کی تمنائیں پوری ہونے نہیں دیتی، گویا میرا بخت، لب یار ہے کہ بوسہ دینے میں کنبوس ہے۔





## غزل نمبر (۴۴)

در بند تو چشم از دو جہاں دوختہ ہست

ہشدار کہ شہباز تو آموختہ ہست

لغت: "چشم از دو جہاں دوختن" = دونوں جہاں سے آنکھیں بند کر لینا۔

"چشم از دو جہاں دوختہ" = دونوں جہاں سے بے پروا۔

"شہباز آموختہ" = سدھایا ہوا شہباز۔

شکاری شہباز کی دونوں آنکھوں پہ پٹیاں بندھی ہوتی ہیں، گویا اس کی آنکھیں دونوں جہاں سے بند ہو جاتی ہیں (سوائے وقت شکار) شہباز کے دونوں پاؤں ڈوری سے بندھے ہوتے ہیں، اسی لیے شاعر بند کا لفظ لایا ہے۔

کہتا ہے: تیری قید محبت میں ایک ایسی ہستی ہے جس نے دونوں دنیاؤں سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں لیکن ہوشیار کہ یہ شہباز سدھایا ہوا ہے۔

شہباز دنیا جہاں سے غافل ہو تو، شکار سے غافل نہیں ہوتا۔ اسی طرح عاشق، دونوں جہاں سے بے نیاز رہ سکتا ہے لیکن معشوق سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، وہ اس کی زد میں آکر رہے گا۔

افغان مرا بی ہستی ساختہ نیست

در زمزمہ بوی جگر سوختہ ہست

لغت: "افغان" = فغان۔ بے ہشی ساختہ" = بناؤٹی بیہوشی۔ "زمزمہ" = وہ بھجن جو

آتش پرست عبادت کے وقت اپنے معبدوں میں، مدھم مروں میں گاتے تھے۔ نذہ۔

میری دہلی دہلی سی فریاد، مصنوعی نہیں ہے۔ اس زمزمے میں (میرے) جگر سوختہ کی بو

لشال ہے۔

شعر میں نکتہ یہ بھی ہے۔ آتش پرست زمزمہ گاتے وقت بخور بھی جلاتے تھے۔ اسی رعایت سے شاعر نے بوئے جگر سوختہ کہا ہے۔

در دیدہ ز رخ پردہ بر انداختہ نیست

در سینہ دو صد عربدہ اندوختہ ہست

نظروں کے سامنے کوئی ایسا معشوق نہیں جس نے چہرے سے پردہ اٹھالیا ہو، ایسا معشوق ہے جو سینے میں ہمارے خلاف لڑائی کے سینکڑوں ہنگامے سمیٹے ہوئے ہے۔

ز آنسوی بمیدان وفا تاختہ نیست

زمین سو ہوس جانسپری توختہ ہست

لغت: "تاختن" = بھاگ دوڑ کرنا اور تاخت و تار کرنے والا۔

"توختن" = حاصل کرنا اور دینا۔ "توختہ" = جمع کیا ہوا اور ادا کیا ہوا، دونوں۔ یہ لفظ

اضداد میں سے ہے، یعنی اس کے معنی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

اس طرف سے میدان وفا میں تگ و تار کرنے والا کوئی نہیں اس طرف جانسپاری کی ہوس جمع کیے بیٹھے ہیں۔

یعنی ادھر معشوق میں کوئی جذبہ وفا نہیں کہ وہ میدان وفا میں اتر آئے اور لوگوں کے دلوں کو تاخت و تار کرے۔

ادھر عاشق کے دل میں بے پناہ جاں نثاری کا جذبہ ہے۔



در راه ثوابش قد افراخته نیست  
در رسم عتابش رخ افروخته هست  
لغت: "ثواب" = نیک عمل یا صلہ نیک عمل۔  
"عتاب" = ثواب کا الٹ، براصلہ۔

یہاں ثواب و عتاب دونوں ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ اس کے لطف و عنایت سے کسی کی اتنی نوازش نہیں ہوتی کہ وہ اپنا قد بلند کر سکے اور اس کی بزم عتاب میں غصے سے بھڑکا ہوا چہرہ موجود ہے۔

یعنی معشوق کسی کو لطف و محبت سے نہیں نوازتا، ہاں عتاب سے ضرور پیش آتا ہے۔

در تاب مرد، غالب اگر بےحدہ گردد  
در کوی تو گوئی سگ پا سونجہ هست  
اگر غالب بیہودہ ہو جائے تو غصے میں نہ آتا، یہ سمجھ لینا کوپے میں کوئی پاؤں جلا کر  
آگیا ہے۔



### غزل نمبر (۴۵)

بامن کہ عاشقم سخن از ننگ و نام چوست

در امر خاص حجت دستور عام چوست

میں عاشق ہوں، میرے ساتھ ننگ و ناموس کی بات کرنا کیسا؟ یہ ایک خاص معاملہ

ہے اس معاملے کو عام دستور کے معیار سے نہیں پرکھا جاسکتا۔

مستم ز خوب دل کہ دو چشم ازان پُر است  
گوئی مخور شراب و نہ بینی بہ جام چست

میں اپنا خون دل پی کر مست ہو گیا ہوں اور اسی خون دل کی سرخی میری آنکھوں میں  
بھری ہوئی ہے۔ تو (یہ سمجھ کے میں شراب کے کہ نشے میں ہوں) کہتا ہے شراب نہ پی اور یہ نہیں  
دیکھتا کہ میرے جام میں کیا ہے (شراب نہیں ہے، خون دل ہے)۔

بادوست ہر کہ بادہ بہ خلوت خورد مدام  
داند کہ حور و کوثر و دار السلام چست

جو شخص ہمیشہ اپنے دوست کے ساتھ خلوت میں بیٹھ کے شراب پیتا ہے، جانتا ہے کہ  
حور کیا ہے، کوثر کس شے کا نام ہے اور دار السلام کسے کہتے ہیں۔

شاعر نے دوست کو حور، شراب کو کوثر اور خلوت کو جنت کہا ہے۔ مدام کا لفظ یہاں بہت  
موزوں ہے کہ اس کا ایک مفہوم شراب (مدام) ہے اور دوسرا (مدام) ہمیشہ۔ چونکہ جنت کی  
لذتیں ہمیشہ رہنے والی ہیں اس لیے یہ لفظ بڑا پر معنی ہے۔

دلخستہ غمگین و بود می دوائی ما

با خستگان حدیث حلال و حرام چوست

ہم غم کے مارے ہوئے ہیں، شراب ہی ہمارا علاج ہے۔ شراب کے حرام و حلال  
ہونے کے بارے میں دیکھی لوگوں سے باتیں کرنا بے کار ہے۔



جو چیز دوا کے طور پر پنی جائے اس کا حلال و حرام ہونا خارج از بحث ہوتا ہے:

نی است چارہ غم، هو شمند را چه خبر

در روز تیرہ از شب تارم نہ ماند بیم

چون صبح نیست خود چه شناسم کہ شام چیست

میرادن اتنا سیاه ہے کہ سیاہ رات کا خوف ہی نہ رہا۔ جب صبح ہی نہ ہو تو پھر میں کیا جانوں کہ شام کیا ہوتی ہے۔

با خیل مور می ری از رہ خوش است فال

قاصد بگو کزان لب شیرین پیام چیست

لغت: ”خیل“ = اسم جمع ہے، خصوصاً گروہ اسپان کے لیے آتا ہے لیکن اس لفظ کا اطلاق، انسان، حیوان، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ مرزا غالب نے اس شعر میں ”خیل مور“ استعمال کیا ہے۔ مراد انہوہ و ہجوم مور ہے۔

اے قاصد تو آ رہا ہے اور تیرے ہمراہ چیونٹیوں کا ایک اڑدھام ہے، یہ اچھی فال معلوم ہوتی ہے۔ بتا تو کسی میرے محبوب کے لب شیریں سے کیا پیغام لے کے آ رہا ہے۔

گفتی قفس خوش است، توان بال و پر کشود

باری علاج خستگی بند دام چیست

تم نے یہ تو کہہ دیا کہ قفس نہایت اچھا ٹھکانا ہے، یہاں بال و پر کے کھولنے کی گنجائش ہے۔ ہاں یہ بھی تو بتا دے کہ جال کی بندھنوں کے کنزور ہونے کا کیا علاج ہے۔

یعنی بال و پر کھولیں گے تو قفس کے بند ٹوٹ جائیں گے اور ہم لذت قید و بند سے محروم ہو جائیں گے۔

نیکی ز تست از تو نخواہیم مزد کار

در خود بدیم کار تو ایم، انتقام چیست

نیکی تیرا عطیہ ہے، اس لیے ہم نیکی کا تجھ سے صلہ (مزدوری) نہیں مانگتے، اور اگر ہم برے ہیں تو یہ بھی تیرا ہی کام ہے، پھر بدی کی سزا کیسی۔

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف ہم فروخت

پر سد چرا کہ نرخ می لعل قام چیست

غالب نے اگر اپنا خرقہ اور قرآن بیچ نہیں دیے تو وہ شراب ناب کا نرخ کس لیے پوچھ رہا ہے۔

گو یا یہ چیزیں بیچ کر وہ شراب خریدنا چاہتا ہے۔



## غزل نمبر (۴۶)

گل را بہ جرم عربدہ رنگ و بو گرفت

راہ خن بہ عاشق آزر م جو گرفت

لغت: ”عربدہ“ = جنگبوی و بدخوی۔ اس کا ایک مفہوم فریب دہی اور حقہ بازی۔



”آزرم“ = مریدہ کی ضد ہے نرمی و آشتی و صلح۔ ایک معنی انصاف بھی ہے۔ ”آزرم جو“ = انصاف طلب کرنے والا۔

پھول کو رنگ و بو کا فریب دینے میں پکڑا اور وہاں سے انصاف طلب کرنے والے عاشق کی بات کرنے کا سلسلہ نکلا۔

لطفِ خدایِ ذوقِ نشاطش نمی دهد

کافرِ دلی کہ باستم دوستِ خو گرفت

لغت: ”خو گرفتن“ = عادی ہو جانا۔

وہ کافر دل جو معشوق کے جوہر و ستم کا عادی ہو گیا ہو، اسے اللہ تعالیٰ کا لطف اور مہربانی کوئی خوشی اور لذت عطا نہیں کرتے۔

چو اصل کار در نظر ہمنشین نہ بود

بی چارہ خردہ بر روش جستجو گرفت

لغت: ”خردہ گرفتن“ = نکتہ چینی کرنا۔

چونکہ میرے ہمنشین کی نظر میں معاملہ کی اصل غایت نہ تھی، بے چارے نے یونہی میری تلاش و جستجو کے انداز پر نکتہ چینی شروع کر دی۔

در خلوتی کشود خیالم رہ دعا

کز تنگی بساط، نفس در گلو گرفت

لغت: ”نفس در گلو گرفتن“ = سانس گلے ہی میں اٹک کر رہ گیا، سانس نہ لینے

پائے۔

میرے تصور نے ایک ایسی خلوت کی طرف دعا کا راستہ کھولا کہ جہاں کی تنگی کے باعث سانس لینا بھی دشوار تھا۔

یعنی میں نے دعا مانگنا چاہی لیکن وہ دعا ایسی تھی کہ لب تک نہ آسکی۔

شرمندہ نوازشِ گردون نما منداہم

گر چاکِ دوخت، جامہ بہ مزدِ رفو گرفت

شکر ہے، مجھے آسمان کی نوازشات کا شرمندہ احسان نہ ہونا پڑا۔ اگر اس نے میرے

چاک جامہ کو سیا بھی تو اصل جامہ رفو کرنے کی مزدوری کے طور پر لے لیا۔

قدرت کچھ عطا کرتی ہے تو اس کے عوض اس سے کہیں زیادہ چھین لیتی ہے۔

با خویشتن چه مایہ نظر باز بودہ است

کز من دل مرا بہ ہزار آرزو گرفت

میرا محبوب، اپنے حسن کے دیکھنے میں بھی کتنا نظر باز ہے کہ اس نے میرا دل چھینا اور

ہزاروں آرزؤں کے ساتھ چھینا۔

معشوق کو اپنے حسن کا کس قدر احساس ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ عاشق اس کی ہر ادا پر

مرے۔

گفتم خود از مشاہدہ بخائش آورد

خوش باد حال دوست کہ عالم نگو گرفت

میں نے سوچا تھا کہ میرا محبوب میری حالت زار کا مشاہدہ کرے گا تو اسے خود میرے



حال پر رحم آئے گا۔ اللہ اسے خوش رکھے، اس نے مجھے دیکھا اور سمجھا کہ میرا حال اچھا ہے:

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

از یک سیبوست بادہ و قسمت جدا جدا

جمشید جام برد و قلندر کدو گرفت

شراب تو ایک ہی خم سے آتی ہے لیکن ہر ایک کا حصہ الگ الگ ہے۔ جمشید کو ایک جام

ملا، اور قلندر نے کدو بھر لیا۔

قدرت اپنی نعمتیں، شاہ و گدا سب پر نچھاور کرتی ہے لیکن گدا کو جو میسر آتا ہے وہ شاہ

کے نصیب میں کہاں۔

فرمان روانہ گشت مسلمان بہ ہیچ قصر

گر رفت مغ ز میکدہ ترسا فرد گرفت

مسلمان کو کبھی کسی محل میں فرماں روا ہونے کا موقع نہ ملا۔ میکدے سے پیر مغان چلا گیا

تو اس کی جگہ ترسا زادہ آ بیٹھا۔

یعنی میکدے میں سلا کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ عالی ظرفوں ہی کا مقام ہے۔

ایمان گر بہ خوف و رجا کردم استوار

اخلاص در نمود و فایم دو رو گرفت

اگر میں اپنے ایمان کی بنیاد کو امید و بیم پر استوار کرتا تو میری وفاداری کے خلوص میں

دورخی آ جاتی ہے۔

عام لوگ یا تو جنت کی امید میں یا دوزخ کے خوف سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔

ایسے ایمان میں اخلاص نہیں ہوتا۔

هر فتنه در نشاط و سماع آورد مرا

گوئی فلک بہ عربده هنجار او گرفت

لغت: ”ہنجار“ = طور طریقہ۔ ”ہنجار گرفتن“ = طریقہ لے لینا۔

آسمان کی طرف سے جو فتنہ بھی نازل ہو، مجھے اس سے انتہائی مسرت ہوتی ہے۔ میں

خوشی میں رقص کرنے لگتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان نے دشمنی کے انداز اسی معشوق سے سیکھے

ہیں۔

رضوان چون شہد و شیر بہ غالب حوالہ کرد

بی چارہ باز داد و می مشکبو گرفت

دربان جنت (رضوان) نے جب جنت میں غالب کو شہد و شیر پیش کیے تو بے چارے

نے یہ چیزیں واپس کر دیں اور شراب مشکبو لے لی۔





## غزل نمبر (۴۷)

غبارِ طرفِ مزارم بہ پیچ و تابِ ہست

ہنوز در رگِ اندیشہ اضطرابِ ہست

عاشق، اپنے محبوب کے عشق میں عمر بھر صحراؤں کی خاک چھانتا رہا اور اسی دھن میں جان دے دی، لیکن دل کا اضطراب اور جنوں خیز خیالات کا طوفان کم نہ ہوا۔ چنانچہ اس کی قبر سے جو گرد و غبار اٹھتا ہے وہ بھی پیچ و تاب کھائے ہوئے ہے۔

بہ نانگِ صور سر از خاک بر نمی دارم

ہنوز در نظر م چشم نیم خوابی ہست

لغت: ”چشم نیم خواب“ = وہ آنکھ جو نیند کی وجہ سے پوری نہ کھلی ہو، یا سوتے میں نیم وا ہو۔ چشم نیم خواب کا ایک مستانہ انداز ہوتا ہے جو دل لبھاتا ہے:

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے

فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

میں قیامت کے دن صور پھونکنے جانے پر بھی خاک سے سر نہیں اٹھاؤں گا کیونکہ ابھی تک محبوب کی نیم خواب آنکھیں میری نظروں کے سامنے ہیں۔ ناصر سرہندی نے اسی طری کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

روز محشر ہم نخواہد دید روئی آفتاب

ہر کہ زیر سایہ زلفی شمی در خواب شد

ز سردی نفسِ نامہ بر توان دانست

کہ نارسیدہ پیامِ مرا جوابی ہست

لغت: ”سردی نفس“ = ٹھنڈا سانس، یا سرد آہیں۔

قاصد کے ٹھنڈے سانس بتا رہے ہیں کہ میرے نہ پہنچے ہوئے پیغام کا کچھ نہ کچھ جواب ہے۔

نامہ بر عاشق کا پیغام لے کر گیا ہے۔ لیکن معشوق کے سخت رویے کے باعث پیغام پہنچا نہیں سکا، اور جو کچھ اسے پیش آیا ہے عاشق سے کہتے ہوئے گھبرا رہا ہے۔ نامہ بر کی حالت زاری ظاہر کر رہی ہے کہ جواب ملا، جسے شاعر نے ”جوابی“ کے بڑے خوبصورت لفظ میں ظاہر کیا ہے۔

بہ ہر زہ جان بہ غلطِ دادم و ندانستم

کہ یارِ دیرِ پسندی و زودِ یابی ہست

لغت: ”دیر پسند“ اور ”زود یاب“ دونوں اسم فاعل ترکیبی ہیں۔ دیر پسند وہ شخص ہے جو دوسروں کو دیر کے بعد پسند کرتا ہے۔ اسی طرح زود یاب کسی شے کو جلدی سے حاصل کرنے والا۔ ”جاں بہ غلط دازن“ = غلطی سے جان دینا۔ ”بہ ہرزہ“ = بے فائدہ۔

میں نے یونہی بے فائدہ اپنی جان محبوب کی نذر کر دی، مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ دیر پسند ہے اور زود یاب ہے۔

زود یاب تو اس لیے ہے کہ اسے میری جان فوراً مل گئی اور دیر پسند اس لیے کہ ایک عرصہ کے بعد اسے یہ احساس ہو گا کہ جان قربان کرنے والا اچھا انسان تھا: ہائے اس زود پشیاں کا پشیاں ہو نا



نظر فروز اداھا بدشمن ارزانی

بمن سپار اگر داغ سینہ تابٰی ہست

لغت: ”ارزانی“ = یہ لفظ محاورہ آیا ہے۔ بدشمن ارزانی کا مفہوم ہے دشمن کو عنایت کر

دے۔

”سینہ تاب“ = اس کے دو معنوی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک سینہ کو جلا دینے والا اور

دوسرے سینے کو روشن کرنے والا یہاں دونوں موزوں ہیں۔

کہتا ہے:

نظروں کو روشن کر دینے والی ادا نہیں رقیب کو عطا کر دے۔ ہاں اگر تیرے پاس سینے کو  
چمکانے والا داغ ہے تو وہ میرے پردہ کر دے۔

عاشق کے لیے داغ محبت اور داغ فراق ہی کافی ہے۔

ز شورِ نمک پرشِ نھانی تست

اگر مرا جگر تشنہ عتابی ہست

اگر میرا جگر تیرے عتاب کا بیا سا ہے تو یہ بھی تیری عنایت ہے اس لیے کہ اس عتاب  
میں تیری پرش نہان کی نمک ریزی کی آمیزش شامل ہے۔

یعنی محبوب کا عتاب سے پیش آنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مجھے اس قابل سمجھتا  
ہے۔ اگر عتاب بھی نہ ہو تو پھر کیا ہوگا۔

خود اولین قدحِ می بنوش و ساقی شو

کہ آخر از طرفِ تست گر حجابی ہست

پہلے خود ایک جامِ مے پی لے اور پھر ساقی بن کر ہمیں پلا۔ آخر تیرے اور میرے  
درمیان جو حجاب ہے وہ تیری طرف سے ہے اور وہ یونہی دور ہوگا۔

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن

مگر دھم جگر تشنہ رادلی بہ دروغ

نشان دھید براہش اگر سراپی ہست

لغت: ”سراپ“ = وہ ریت جو دور سے دھوپ میں پانی کی طرح چمکتی ہے۔

اگر میرے محبوب کی راہ میں کوئی سراپ ہو تو اس کی نشان دہی کر دو۔ شاید وہ سراپ  
دکھا کر میں اپنے پیاسے جگر کی تسکین کر سکوں۔

یہاں ”دل“ کا لفظ حوصلے کا مفہوم دیتا ہے۔

ز سرد مھری ایامِ نیستیم نژند

کہ در خرابہٴ ما روی آفتابی ہست

ہمیں زمانے کی سرد مہری سے کوئی رنج نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے برباد اور اجڑے  
ہوئے گھر میں دھوپ تو آ جاتی ہے۔ قدرت کا یہی عطیہ کافی ہے۔

بھارِ ہند بود بر شگال، ہان غالب

درین خزان کدہ ہم موسمِ شرابی ہست

غالب، برسات کا موسم ہندوستان کی بہار ہے۔ ہاں اس خزان کدے میں بھی موسم

شراب ہوتا ہے۔





## غزل نمبر (۳۸)

تا بسویم نظرِ لطف جس تاسمن است  
سبزہ ام گلبن و خارم گل، خاکم چمن است  
جب تک مجھ پر جس تاسمن کی نگاہِ لطف ہے، میرا سبزہ پھولوں کی کیاری، میرا کاٹا  
پھول اور میری خاک چمن کی حیثیت رکھتی ہے۔

ای کہ تا نام تو آرائش عنوان بخشید  
صفحہ نام بہ شادابی برگ سمن است  
جب سے تیرا نام ("میری تحریر") کا زیب عنوان بنا ہے، تو وہ صفحہ اپنی شادابی اور  
تازگی سے چنبیلی کا پھول نظر آتا ہے۔

کلکم از تازگی مدح تو در بارہ خویش  
شارح ائیمہ اللہ نباتا حسن است  
تیری مدح و ستائش کی تازگی سے میرا قلم اپنے بارے میں "اللہ نے اسے میٹھا پھل  
دیا" کے الفاظ و برار رہا ہے۔

گھر افشانی مدح تو بجنہش آورد  
خامہ ام را کہ کلید در گنج خنن است  
تری مدح کی گہرا فاشانی سے میرے قلم میں جنہش آگئی ہے۔ وہ قلم جو شعر و سخن کے

نثرانے کی کنجی ہے۔

ہردم از رای منیر تو کند کسب ضیا  
مھر تابان کہ فروزندہ این انجمن است  
یہ مہر تاباں، جو اس دنیا کی محفل کو روشنی بخشتا ہے، ہمیشہ تیری روشن رائے ہی سے کسب  
نور کرتا ہے۔

بخیال تو بہ محتابِ حکیم کہ مگر  
عکس روی تو درین آئینہ پر تو قلن است  
تیرے تصور میں میں چاندنی (چاند) کو دیکھ کر تسکین پاتا ہوں، شاید اس لیے کہ اس  
آئینے میں تیرے چہرے کا عکس پڑ رہا ہے۔

راست گفتارم و یزدان نہ پسندد جز راست  
حرف ناراست سرودن روش اھرمن است  
میں سچ بات کہتا ہوں اور خدا سچ بات کے سوا کچھ اور پسند نہیں کرتا۔ جھوٹ بات کہنا  
تو شیطان کا طریق کار ہے۔

آنچنان گشتہ یکی دل بہ زبانم کہ مرا  
میوان گفت کہ لختی ز دل اندر دھن است  
میرا دل اور میری زبان اس طرح ایک ہو گئے ہیں کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ میری



زبان، میرے دل کا ہی ایک ٹکڑا ہے۔

راستی این کہ دمِ مهر و وفای تو بدل

باہم آمیختہ مانند روان با بدن است

کچ تو یہ ہے کہ تیری محبت میرے دل میں اس طرح سرایت کر گئی ہے جیسے بدن میں روح سمائی ہوئی ہو۔

دوری از دیدہ اگر روی دهد، دور نہ

زانکہ پیوستہ ترا در دل زارم وطن است

اگر تیرے اور میرے درمیان کوئی دوری نظر آتی ہے تو تو واقعی دور نہیں ہے، اس لیے کہ تو میرے میں ہمیشہ کھین رہتا ہے۔

داورا گرچہ ہمایم بہ ہمایون سختی

لیک در دھر مرا طالع زاغ و زغن است

اے آقا اگرچہ میں مبارک کلامی کے باعث ہما ہوں لیکن اس دنیا میں مجھے کوئے اور چیل کا سانصبہ میسر آیا ہے۔

جز بہ اندوہ دل و رنج تم نفزاید

نالہ ہر چند ز اندوہ دل و رنج تن است

اگرچہ میں غم دل اور رنج تن ہی کے ہاتھوں فریاد کرتا ہوں، فریاد کرنے سے اس رنج و غم میں اضافہ ہو جاتا ہے (کی نہیں ہوتی)۔

سینہ می سوزد از آن اشک کہ در دامن نیست

بہ جگر می خلد آن خار کہ در پیرھن است

میرا سینہ ان آنسوؤں سے جل رہا ہے جو بہ کر دامن میں نہیں ٹپکے اور میرے جگر میں وہ کانٹا چھ رہا ہے جو میرے پیراہن میں ہے۔

بی کسی حای من از صورت حالم در یاب

مردہ ام بر سر راہ و کفِ خاکم کفن است

میری نیکی کا اندازہ میری صورت حال سے ہو سکتا ہے۔ میں سر راہ پڑا ہوا مردہ ہوں اور ایک مشت خاک میرا کفن ہے۔

حیف باشد کہ دلم مردہ و پرش کنی

بہ جھان پرش ماتم زدہ رسم کھن است

کتنے افسوس کی بات ہے کہ میرا دل مردہ ہو اور تو پرسان حال نہ ہو حالانکہ دینا میں ماتم زدہ انسان کی پرش کرنا پرانی رسم ہے۔

چشم دارم کہ فرستی بہ جواب غزلم

آن رضا نامہ کہ از لطف تو مطلوب من است

میں امید کرتا ہوں کہ میری اس غزل کے جواب میں تو ایک ایسا ہامی نامہ بھیجے گا جس کی مجھے تیری مہربانیوں سے توقع ہے۔



غالب خستہ، بہ جان، جای بر آن در دارد

گر بہ تن معتمد، گوشہ بیت الحزن است

اگر چہ غالب، جسمانی طور پر ایک نمکدے کا مبین ہے تاہم ذہنی طور پر (یہ جاں) اس دور وازے پر (یعنی ممدوح کی) اُس کا مقام ہے۔



### غزل نمبر (۴۹)

نہ ہرزہ ہچونی از مغزم استخوان خالی است

کہ جائی نالہ زاری درین میان خالی است

لغت: "از مغزم استخوان" = از مغز استخوان من۔

میری ہڈیاں (بانسری) کی طرح مغز سے بے فائدہ خالی نہیں ہیں بلکہ یہ جگہ نالہ و فریاد کے لیے خالی رکھی ہوئی ہے۔ یعنی میری ہڈیاں تک فریاد سے لبریز ہیں۔

روم بہ کعبہ ز کوئی تو و ز حق خجل

ز سجدہ جہم و از پوزشم زبان خالی است

لغت: "جہم" = جہیں "خجل" = شرمندہ۔

نیرے کوچے کو چھوڑ کر کعبے کی طرف جا رہا ہوں لیکن حق تعالیٰ سے شرمندہ ہوں کہ میری جہیں سجدے سے اور زباں عذر خواہی سے خالی ہے۔

کہا معشوق کے کوچے کی سرزمین میں کہ قدم قدم پر سجدہ بے قرار ہے اور ساتھ ساتھ زبان سے معذرت بھی کی جا رہی ہے۔ اور کہاں کعبے کی راہ کہ یہ دونوں باتیں غائب ہیں اور سفر بے دلی سے طے ہو رہا ہے۔

ہجوم گل بہ گلستان ہلاک شوقم کرد

کہ جا نمائدہ و جای تو ہچیمان خالی است

باغ میں پھولوں کا ہجوم دیکھ کر مجھے میری بے تابی شوق نے مار ڈالا کہ سارا باغ تو پھولوں سے چنپڑا ہے لیکن تیری جگہ خالی پڑی ہے۔

بہار کا موسم ہے، جدھر نظر دوڑاؤ پھول ہی پھول ہیں، عاشق اس منظر کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے کہ اس ہجوم گل میں اس کا اپنا پھول یعنی محبوب موجود نہیں۔ اس سے اس کی بے تابی شوق دیدار بڑھ جاتی ہے اور وہ ہلاک شوق ہو جاتا ہے۔

گر یستم نگرستی، بخون تپم امروز

ز پارہ جگرم چشم خونچکان خالی است

میں تیرے لیے رو یا اور تو نے دیکھا تک نہیں، میں خون میں تڑپ رہا ہوں۔ آج یہ عالم ہے کہ میری خوں فشاں آنکھیں، میرے جگر کے ٹکڑوں سے خالی پڑی ہیں۔

یعنی رو رو کر جگر کا خون بہا دیا اور محبوب کی بے نیازی دیکھیں کہ اس نے دیکھا تک نہیں۔ اب میں اس خون جگر میں پڑا تڑپ رہا ہوں اور آنکھیں خشک ہو کر رہ گئی ہیں۔

نہ شادی بہ تماشا نہ بیدی بہ نوا

ز غنچہ گلبن و از بلبل آشیان خالی است



نہ کوئی معشوق جلوہ گر ہے، نہ کوئی عاشق بیدل ہی مصروف فریاد۔ پھولوں کی کیاری کلی سے اور آشیاں بلبل سے خالی پڑا ہے۔

شاعر نے پہلے مصرعے میں جو بات کہی ہے وہی دوسرے مصرعے میں استعارۂ دہرائی ہے۔ گویا شاہد کے لیے غنچہ اور بیدل کے لیے بلبل کا استعارہ لایا ہے۔

وہ بھی کیا افسردہ فضا ہوگی جہاں نہ حسن کی جلوہ گری ہو اور نہ عشق کی نوا گری۔

کنم بہ جنبش دل شیشہ از پری لبریز

سرم ز بادِ فسون سنجی زبان خالی است

لغت: ”باد“ = ہوا، غرور و نخوت۔

”فسون سنجی زبان“ = زبان کی خوش گفتاری اور سحر طرازی۔ میرا سر زبان کی خوش گفتاری کے خیال سے خالی ہے (میں باتوں کے جادو سے نہیں) دل کی حرکت کے ذریعے پری کو شیشے میں اتار لیتا ہوں۔

پری کو شیشے میں اتار نے سے کسی کو رام کرنا مقصود ہوتا ہے، لوگ اس کے لیے کوئی افسوں پڑھتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں زبان کی فسون طرازی کا قائل نہیں ہوں۔ میں یہ کام دل سے لیتا ہوں۔

معشوق پر لفظوں کا جادو نہیں چلاتا، دل کے خلوص سے اسے مسخر کر لیتا ہوں۔

گرش بدیدن من گریہ رو نداد چہ جرم

نهاد آتش شوق من از دخان خالی است

اگر مجھے دیکھ کر میرے معشوق کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تو اس کی کیا خطا، میری

محبت کی آگ کی طینت ہی ایسی ہے کہ وہ دھوئیں سے خالی ہے۔ اس سے کوئی دھواں نہیں اٹھتا کہ جس کے گلنے سے آنکھوں میں آنسو آجائیں۔

آتش دل یا آتش عشق جلی ضرور ہے۔ لیکن نظر نہیں آتی۔ اس سے عام آگ کی طرح دھواں ہی نہیں اٹھتا کیونکہ اس کی فطرت ہی کچھ اور ہے۔

مقصود یہ ہے کہ عشق کی آگ عشق کو تو جلاتی ہے، معشوق پر اثر انداز ہوتی ہے کہ نہیں یہ اور بات ہے۔

پر از سپاس ادای تو دفتری دارم

کہ یکسر از رقم پرش نھان خالی است

لغت: ”سپاس ادا“ = معشوق کے ناز و ادا کا شکریہ۔

تیرے ناز و ادا کے شکرانے کا ایک ایسا دفتر موجود ہے جو پرش نہاں کی تحریر سے یکسر خالی ہے۔

محبوب کے ناز و ادا کا کوئی شمار نہیں ہے اور عاشق ہر ادا کے لیے شکر گزار ہے۔ ان شکر گزار یوں کا ایک دفتر (طویل فہرست) بن چکا ہے لیکن اس دفتر میں کوئی ایسی ادا شامل نہیں جسے پرش نہاں کہا جاسکے یعنی وہ ایسی ادا ہو کہ جس سے معشوق کا لطیف سا التفات اور عنایت نکلتی ہو۔

امام شھر بہ مسجد اگر رھم ندد

بہ جائی من بہ نیایش کہ مغان خالی است

لغت: ”نیایش“ = ستائش و تحسین، دعا و آفرین، عاجزی و زاری۔



اگر امام شہر مجھے مسجد میں داخل ہونے نہیں دیتا تو نہ سہی، میرے لیے پیر مغاں کے معبد خانے میں جگہ خالی ہے، وہاں چلا جاؤں گا۔

مسجد میں کسی اللہ کے حضور عجز و نیاز ہوتا ہے، معبد و مغاں میں بھی اسی کا اصرار ہے۔ نیایش کا لفظ یہاں بڑا موزون ہے۔

خراب ذوق برو دوش کیستم غالب؟

کہ چون ہلال سراپایم از میان خالی است

لغت: ”برو دوش“ سینہ اور کندھا، مراد جسم (معشوق)۔

کبھی عاشق اپنے معشوق کے جسم ناز میں کو آغوش میں لیے ہوئے تھا۔ معشوق جا چکا ہے اور عاشق اس لذت کا مارا ہوا ابھی تک گویا اسی انداز میں بیٹھا ہے اور اس کا جھکا ہوا الاغریڈن ہلال کی طرح ہے جو بیچ میں سے خالی ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

میں کس کے برو دوش کی لذت کا مارا ہوا ہوں کہ میرا وجود ہلال کی طرح درمیان میں سے خالی ہے۔



## غزل نمبر (۵۰)

زمن گستی و پیوند مشکل افتاد است

مرا مکیر بہ خونی کہ در دل افتاد است

لغت: ”خون در دل افتادن“ = انتہائی دکھ درد کی حالت میں ہونا۔

”مرے بہ خون مکیر“ = مجھ سے مواخذہ نہ کر۔

تو نے مجھ سے محبت کا رشتہ توڑ لیا اور اب ٹوٹے ہوئے رشتے کا پیوند مشکل ہو گیا۔

بہ قدر ذوق تپیدن بہ کشتہ جا بخشد

خن بہ محکمہ در کیش قاتل افتاد است

لغت: ”محکمہ“ = وہ جگہ جہاں قاضی اپنا حکم سناتا ہے۔ عدالت۔ ”کیش“ = مذہب۔

مقتول کو اُس کے تڑپنے کے ذوق کے مطابق دفن کرنے کی جگہ دی جاتی ہے چنانچہ (عاشق کے بارے میں جو قتل کر دیا گیا ہے) عدالت میں یہ پوچھا جا رہا ہے کہ قاتل کا مذہب کیا تھا۔ قاتل کے متعلق استفسار اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اُس نے مقتول کو تڑپنے کی یہ لذت عطا کی۔ گویا یہ ذوق تپیدن، مقتول کا کمال نہیں، بلکہ قاتل کا کارنامہ ہے۔

شگافی ار جگر ذرہ نم برون ندد

بہ وادی کہ مرا پائی در گل افتاد است

جس وادی (عشق) میں پا در گل ہو کر رہ گیا ہوں، وہاں کی خاک میری گرمی شوق سے اتنی آتشناک ہو گئی ہے کہ اگر کسی ذرے کا جگر چیرا جائے تو وہ اس قدر خشک ہو گیا ہوگا کہ اُس میں سے ایک قطرہ پانی یا خون کا نہیں نکلے گا۔

اپنی گرمی عشق کا اظہار کیا ہے۔

درین روش بہ چہ امید دل توان بستن

میانہ من و او شوق حائل افتاد است

اس حالت میں کسی امید پر اُس سے دل لگایا جاسکتا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان

شوق حائل ہو گیا ہے۔ یعنی حالت یہ ہے:



ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار

بہ ترکِ گریہ برمِ دہشتِ اثرِ ز دلش

کہ خود ز شہروی نالہ غافل افتاد است

لغت: ”شہروی“ = راتوں کا سفر۔ ”شبِ روی نالہ“ = راتوں کی فریادیں۔

میں رونے کو ختم کر کے محبوب کے دل سے اثرِ گریہ کی دہشت دور کرنا چاہتا ہوں اور اس کا یہ عالم ہے کہ وہ عاشق کی راتوں کی فریاد و فغاں سے غافل ہے۔

عاشق اپنی گریہ و زاری کو بند کر کے معشوق کی گھبراہٹ کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور معشوق کے دل کی یہ کیفیت ہے کہ وہ فریاد ہی سے بے خبر ہے۔

بہ صبر کم نیم اما عیارِ ایوبی

بقدرِ آنکہ گرفتہ کامل افتاد است

حضرت ایوب کا صبر ضرب المثل ہے۔

کہتا ہے:

صبر کرنے میں میں کم نہیں۔ بہر حال صبرِ ایوبی جتنا بھی پرکھا اپنے انداز میں کامل تھا۔

مراد یہ ہے کہ صبرِ ایوبی جو بھی تھا، ہوگا، ہمارا صبر کسی طرح اس سے کم نہیں۔ لوگوں

نے صبرِ ایوبی کو مثالی صبر قرار دیا اور یہ لوگوں کا معیارِ صبر تھا، صبر کی انتہا نہ تھی۔

چرد نھنگ و سمندر در آب و آتش من

تم بہ قلزم و کشتی باطل افتاد است

مگر مجھ اور سمندر (آگ کا کیزا) میرے ہی پانی اور آگ میں پرورش پاتے ہیں۔ میرا

جسمِ سمندر میں ڈوبا ہوا ہے اور میری کشتی ساحل پر پڑی ہے۔

برری صید تو از ذوقِ استخوانِ تنش

ہما ز تیزی پرواز، بکل افتاد است

ہمارے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہڈیاں کھاتا ہے۔

صید سے مراد یہاں صیدِ عشق ہے، یعنی عشق کا مارا ہوا عاشق کہتا ہے:

تمھارے شکار کی ہڈیاں کھانے کے شوق میں، ہمارے اس تیزی سے پرواز کی ہے کہ وہ شکار کے اوپر نیم بکل ہو کر آگرا ہے۔

چو اندر آئینہ با خویش لایہ ساز شوی

ز خود بجوی کہ مارا چہ در دل افتاد است

جب تو آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر اپنے حسن پر فریفتہ ہوتا ہے اور بڑے نیاز مندانہ

انداز میں اس سے پیش آتا ہے، عین اس وقت تمہیں اپنے آپ میں سوچنا چاہیے کہ ہمارے

دل کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔

حریفِ ماہمہ بی بذلہ می خورد غالب

مگر ز خلوتِ واعظ بہ محفل افتاد است

لغت: ”حریف“ = ہم پیشہ۔ یہ لفظ دوست اور مقابل دونوں مفہوم دیتا ہے۔ ہم پیشہ

لوگ باہم دوست بھی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ پیشہ ورانہ رقابت بھی رکھتے ہیں۔

لغت: حریف کا لفظ یہاں باہم مل کر پینے والوں کے لیے آیا ہے۔ کہتا ہے:



غالب! ہمارا حریف، شراب پی رہا ہے لیکن اس میں کوئی شوخی، شگفتگی، بذلہ نخی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے واعظ کی خلوت سے اٹھ کر محفل، رنداں میں آ بیٹھا ہے (اور ابھی اس غیر موافق صحبت کے اثر سے نجات نہیں ملی)۔



### غزل نمبر (۵۱)

اینیم از مرگ تا تیغ جراحات بار ہست

روزی تا خوردہ ما در جہان بسیار ہست

لغت: ”روزی تا خوردہ“ = بے نصیب لوگ۔

”تیغ جراحات بار“ = زخم برسانے والی تلوار، زخم لگانے والی تلوار۔

جب تک تیری تلوار زخم لگائے چلی جا رہی ہے ہم موت سے محفوظ ہیں۔ ہمارے جیسے

بے نصیب لوگ دنیا میں بہت ہیں۔

معشوق اپنی تیغ ناز سے زخم لگائے چلا جا رہا ہے اور لوگ بھل پڑے تڑپ رہے ہیں

لیکن بد نصیبوں کو موت نہیں آتی۔

ما و خاک رہگذر بر فرق عریان ریختن

گل کسی جوید کہ او را گوشہ دستار ہست

پرانے زمانے میں لوگ دستار پہنتے تھے اور زینت کے لیے پھول دستار کے ایک طرف ناک لیتے تھے۔ عاشق کو دستار کہاں نصیب، وہ ننگے سر (فرق عریاں) ہے اور وہ وحشت جنوں میں ادھر ادھر محکوم رہا ہے اور رہگذر کا غبار سر پر پڑ رہا ہے۔ کہتا ہے: ہم ہیں اور رہگذر خاک سر عریاں پر ڈالنا ہمارا مشغلہ ہے۔ پھول تو وہ تلاش کرے جس کی دستار ہو اور گوشہ دستار۔

پارہ امید وارستم تکلف بر طرف

باہمہ بی التفاتی درد مند آزار ہست

لغت: ”درد مند آزار“ (ترکیب فاعلی) دکھی لوگوں کو ستانے والا۔ تکلف کیا، صاف

بات یہ ہے کہ میں تھوڑا سا دوست سے محبت کا امیدوار بھی ہوں۔ باوجود اس کی اتنی بے توجہی

کے وہ درد مند لوگوں کو ستانے کا خوگر ہے۔ دوست کا یہ انداز بھی امید افزا ہے۔ اسی لاگ سے

لگاؤ کا پہلوا بھرے گا۔

بر سر کوی تو با مہرم بہ جنگ آردھمی

این هجوم ذرہ کاندہ روزن دیوار ہست

جب میں تیرے کوچے میں جاتا ہوں اور تیرے روزن دیوار پر ذروں کا ہجوم دیکھتا

ہوں تو مجھے سورج پہ رشک آتا ہے اور میں اس سے آمادہ جنگ ہو جاتا ہوں۔

عام مشاہدے کی بات ہے کہ سورج کی روشنی جب روزن دیوار (روشن دان) سے اندر

آتی ہے تو ہزاروں ذرے جو یوں دکھائی نہیں دیتے نظر آتے ہیں۔

عاشق ان ذروں کو روزن دیوار میں رقص کرتے ہوئے خلوت دوست میں جاتے

دیکھتا ہے تو اسے اپنی نامرادی اور ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ روزن دیوار تک اس کی رسائی



کہاں۔ وہ ذروں کی کامیابی کو سورج سے منسوب کرتا ہے اس لیے اس سے برسر پر خاش ہے۔

در خموشی تابش روی عرقا کش نگر

تا چھا ہنگامہ سر گرمی گفتار ہست

لغت: ”روئے عرقا ک“ = پسینہ سے آلودہ چہرہ۔

حالت خموشی میں معشوق کے پسینے سے شرابور چہرے کی تابانی کو دیکھو۔ اللہ اللہ اس خموشی میں کتنی گویائیوں کے ہنگامے سمائے ہوئے ہیں۔

بی نوائی بین کہ گر در کلبہ ام باشد چراغ

بخت را نازم کہ با من دولت بیدار ہست

لغت: ”دولت بیدار“ = ایسی دولت جس سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ میری بے سرو سامانی کو دیکھ کہ اگر میری کتیا میں چراغ (روشن) ہو تو میں اسے اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں اور فخر کرتا ہوں کہ مجھے دولت بیدار مل گئی۔ شمع کو دولت بیدار کہنا، بہت طبع استعارہ ہے۔

در پرستش سستم و در کا مجبوی استوار

بادشاہ را بندہ کم خدمت و پر خوار ہست

لغت: ”پرستش“ = اللہ تعالیٰ کی عبادت۔ ”کا مجبوی“ = خواہشات کا پورا کرنا۔

”بندہ کم خدمت و پر خوار“ = وہ غلام جو خدمت کم کرے اور کھائے زیادہ۔

میں خدائے پاک کی عبادت کرنے میں مست ہوں اور اس کی دی ہوئی نعمتوں سے تمتع حاصل کرنے میں بڑا چست۔ میں بادشاہ کا ایک ایسا غلام ہوں جو کا پچور ہے اور پر خور ہے۔

راز دیدن ہا مجبوی و از شنیدن ہا مگوی

نقشہا در خامہ و آہنگ ہا در تار ہست

دیکھنے اور سننے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا راز نہ پوچھ۔ بے شمار نقش ہیں جو ابھی خامہ (قلم) میں پوشیدہ ہیں اور ہزار ہا سر ہیں جو ساز کے تار میں سوئے ہوئے ہیں۔

قدرت نے کیا کیا نقش سنوارے ہیں، کیا کیا نغمے ہیں جو ساز کائنات سے ابھرتے ہیں لیکن قدرت کی کرشمہ سازیاں یہیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ نہ جانے مصور ازلی کے قلم میں ابھی کتنے نقش ہیں جو صفحہ قرطاس پہ نہیں آئے اور کتنے نغمے ابھی ساز فطرت سے نہیں ابھرے۔

اس شعر کا اطلاق، مرزا غالب جیسے مفکر شاعر کے کلام پر بھی ہوتا ہے کہ اس نے کیا کچھ نہیں کہا، کیا کیا معنی طرازیوں میں نہیں کیے لیکن اس کے سینے میں ابھی ہزاروں گنجینہ ہائی معنی پوشیدہ ہیں۔

باد برد آن گنج باد آورد و غالب را ہنوز

نالہ الماس پاش و چشم گوہر بار ہست

لغت: ”گنج باد آورد“ = خسرو پرویز کے سات خزانوں میں سے ایک خزانے کا نام باد آورد تھا۔

”الماس“ = ہیرا۔ ہیرا سخت پتھر ہوتا ہے اور چھب جائے تو جسم کو چیرتا چلا جاتا ہے۔

”نالہ الماس پاش“ وہ فریاد ہے جو سننے والوں کے دلوں کو چیرتی چلی جاتی ہے۔

باد آورد خزانے کو ہوا اڑا کر لے گئی (یعنی وہ دولت جاتی رہی) لیکن غالب کی الماس پاش فریادیں اور گوہر باز آنکھیں بدستور وہی ہیں۔





## غزل نمبر (۵۲)

چشم از ابر اشکبار تر است

از عرق جھہ بہار تر است

ابر رو رہا ہے لیکن میری آنکھیں ابر سے بڑھ کر اشکبار ہیں۔ بہار کی پیشانی تر ہے یعنی شرم سے پسینہ پسینہ ہوئی ہے۔

ابر بہار برس رہا ہے لیکن مجھے اشکبار دیکھ کر شرمندہ ہو گیا ہے۔ غالب کے قصیدے کا ایک مقطع ہے:

ابر اشکبار و من قبل از نا گریستن

دارد تفاوت آب شدن تا گریستن

یہ شعر پہلے شعر کی ضد ہے :

گریہ کرد از فریب و زارم کشت

نگہ از تیغ آبدار تر است

اس نے فریب سے آنسو بہائے اور مجھے ان آنسوؤں نے مار ڈالا۔ سبحان اللہ! نگہ تلواری سے کتنی زیادہ تیز (آبدار) ہوتی ہے۔ حسن کی بھیگی ہوئی آنکھوں سے جو نگاہیں نکلتی ہیں وہ تلواری کی دھار سے زیادہ قاتل ہوتی ہیں۔

غالب:

کرے ہے قتل لگاؤٹ میں تیرا رو دینا

کوئی تری تیغ گمبہ کو آب تو دے

می بر انگیزش بہ کشتن من

دشمن از دوست نغمسار تر است

رقیب، میرے محبوب کو میرے قتل پر ابھارتا ہے، دشمن رقیب دوست سے زیادہ نغمسار نکلا۔ محبوب عاشق کو قتل نہیں کرتا۔ وہ عاشق کی حالت زار سے پیچھے کی بجائے خوش ہوتا ہے۔ اگر رقیب اسے عاشق کے قتل پر اکساتا ہے تو وہ گویا عاشق کا ہمدرد ہے کیونکہ مر کر عاشق کے دکھ ختم ہو جائیں گے۔

دی مگر مست بودہ کامروز

شکرم از شکوہ نا گوار تر است

لغت: ”دی“ = کل رات۔

کل رات تو شاید مستی کے عالم میں تھا کہ آج میں جو تیرا شکر ادا کر رہا ہوں، وہ میرے شکوے سے زیادہ ناگوار محسوس ہوتا ہے۔

عاشق بالعموم معشوق سے شکوہ و شکایت کا اظہار کرتا رہتا تھا، نہ جانے کیا بات تھی کہ معشوق صبح اٹھ کر غیر معمولی طور پر مہربان تھا صبح اٹھ کر غور کیا تو دل میں شکوک پیدا ہوئے کہ معشوق کے اس انداز لطف و کرم کی تہ میں کیا تھا۔ کہیں یہ سب کچھ مستی کا نتیجہ تو نہیں تھا کہ رقیب کی بجائے مجھ پر نظر عنایت رہی اس لیے شکرگزاری میں ایک تلخی سی آگئی ہے اور اس کے اظہار میں شکوے کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

ای کہ خوی تو ہنچو روی تو نیست

دیدہ از دل اُمیدوار تر است



انسان کی نظر تو چہروں کو دیکھتی ہے، طبیعت کی افتاد کا اندازہ دل ہی کر سکتا ہے معشوق حسین صورت تو ہے لیکن حسن طبیعت سے عاری ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

تیری خوتیرے چہرے جیسی نہیں۔ میری آنکھیں دل سے زیادہ پر امید ہیں۔ آنکھیں ظاہری صورت سے فریب کھا کر امید میں باندھ سکتی ہیں، دل سے ایسا نہیں ہو سکتا۔

نو بدولت رسیدہ را نگرید

نخش از زلف مشکبار تر است

لغت: ”نو بدولت رسیدہ“ = جسے تازہ تازہ دولت میسر آئی ہو۔

اردو میں ہم اس کے لیے ”نو دولتی“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ایسا شخص اکثر اپنی دولت کی غیر معمولی نمائش کرتا ہے۔ شاعر نے حسن محبوب کو نو دولتی کہا ہے جسے سبزہ خط کی نئی دولت نصیب ہوئی ہے۔ سبزہ خط کی دل کشی زلف کی دل کشی سے بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے: اس نو دولتی کو دیکھو، اس کا سبزہ خط زلف سے زیادہ سیاہ اور معطر ہے۔ ”مشکبار“ میں سیاہی اور خوشبو دونوں عنصر شامل ہیں۔

طفلی و پر دلیر می شکنی

آہ عہدی کہ استوار تر است

لغت: ”پر دلیر“ = بہت دلیر۔ یہاں دلیرانہ کا مفہوم دے رہا ہے۔ معشوق کسن ہے اس لیے جو عہد وفا باندھتا ہے، بڑی سادگی اور آسانی سے باندھتا ہے اور پھر بے تکلفی اور بے پروائی سے توڑ بھی دیتا ہے۔ ان سب باتوں میں ایک ادا اور دل کشی ہے۔ اگر عہد ذرا زیادہ استوار ہو تو وہ ٹوٹ نہ سکے گا، اور معشوق اسے توڑ نہ سکے گا اسے مایوسی ہوگی۔ اسی لیے ”آہ“ کا

لفظ لا کر اظہار افسوس کیا ہے۔

ہمہ عجز و نیاز می خواہند

زار تر ہر کہ حق گزار تراست

ہر شخص عجز و نیاز کا طلب گار ہے۔ چنانچہ عجز و نیاز کا حق پہچاننے والا عجب مصیبت میں ہے۔ وہ کس کس کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار کرے۔

خدا بھی عجز و نیاز کو پسند کرتا ہے اور معشوق بھی۔ عاشق کیا کرے، کدھر جائے۔

خستہ از راہ دور می آیم

پا ز تن پارہ فگار تر است

لغت: ”خستہ“ = تھکا ماندہ۔

تھکا ماندہ ہوں اور دور سے آرہا ہوں۔ جسم کی جو حالت ہے سو ہے، پاؤں اس سے بھی قدرے زیادہ زخمی ہیں۔

شاعر کا اصل مقصود، شوق کی بیابان نوردی کو ظاہر کرنا ہے۔

شکوہ از خوی دوست نتوان کرد

بادہ تند ساز گار تر است

دوست کی (تند) طبیعت کا کیا شکوہ۔ شراب تند ہی اچھی ہوتی ہے۔

تندی طبیعت کو تند ہی شراب سے تشبیہ دی ہے۔ معشوق کی اس طرز جفا میں خاص مزہ

ہوتا ہے۔



می رسد گر بخویشتن نازد

غالب از خویش خاکسار تراست

غالب کو جب اپنے آپ تک رسائی ہوتی ہے تو وہ فخر کرتا ہے کیونکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ خیال کرتا ہے اس سے زیادہ حقیر ہے (خاکسار)۔

غالب کا فخر کرنا دو وجہ سے ہے۔ ایک تو عرفانِ نفس کی وجہ سے کہ اسی میں انسان کو اپنے آپ کا پتا چلتا ہے۔ دوسرے یہ احساس کہ میں ایک خاکسار ہوں اور خاکساری انسان کا بڑا وصف ہے۔



### غزل نمبر (۵۳)

ظہور بخشش حق را بھانہ بی سببی است

دگر نہ شرم گنہ در شمار بی ادبی است

خدا کے حضور گناہگار کا اپنے گناہوں پر نادم ہونا ایک طرح کی بے ادبی ہے کیونکہ بندوں پر حق تعالیٰ کی بخششیں بغیر کسی سبب کے نازل ہوتی ہیں۔

زگیر و دار چہ غم، چون بہ عالمی کہ منم

هنوز قصہ حلاج حرف زیر لبی است

لغت: ”گیر و دار“ = محاسبہ یا مواخذہ۔

”حرف زیر لبی“ = وہ بات جو زیر لب ہو۔ زباں پر نہ آئی ہو۔

”قصہ حلاج“ = مشہور قصہ ہے کہ منصور بن حلاج نے علانیہ ”انا الحق“ کہا اور اس کی پاداش میں دار پر چڑھا دیا گیا۔ فتویٰ دینے والوں کی نظر میں یہ کلمہ کفر تھا۔ بعض صوفیہ نے بھی اسے قبل از وقت قرار دیا ہے۔

مجھے محاسبے کا کیا ڈر کیونکہ جس مقام پر میں ہوں وہاں ابھی تک قصہ منصور زبان پر نہیں آیا۔

گویا ابھی مقام بے خودی اور حیرت ہے۔ ابھی عرفانِ نفس کی تکمیل نہیں ہوئی۔

رموز دین فتنہ سم درست و معذورم

نهاد من عجمی و طریق من عربی است

مولانا حالی اس کی شرح یوں فرماتے ہیں:

میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے، اگر اصول مذہب سے واقف نہ ہوں تو مجھ کو معذور سمجھنا چاہیے۔

نشاط جم طلب از آسمان نہ شوکت جم

قدح مباحش زیا قوت، بادہ گر غمی است

جھشید کو شان و شوکت بھی حاصل تھی اور عیش و نشاط بھی وہ یا قوت کے پیالے میں شراب پیتا تھا۔ لیکن شراب، یا قوت کے پیالے میں ہو یا مٹی کے، اصل شے تو شراب ہے جو سرور بخشی ہے۔ اس سرور و نشاط کے مقابلے میں ساغر یا قوت، یا دوسرے لفظوں میں شوکت جھشید کیا شے ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:



آسمان سے نشاط جمید طلب کرنے کہ (بظاہری) شان جمید۔ یا قوت کا پیالہ اگر نہیں ہے تو نہ سہی، شراب تو انگوری ہے (یعنی شراب ناب)

بالتفات نیرزم در آرزو چه نزاع

نشاط خاطر مفلس ز کیمیا طلبی است

میں تو محبوب کی توجہ کے بھی قابل نہیں، آرزو کا کیا تقاضا۔ ایک مفلس انسان کے دل کی خوشی یہی ہے کہ بچارے کو کیمیا مل جائے۔

محبوب توجہ نہیں کرتا نہ سہی، ہم آرزو تو کرتے ہیں۔

بود بہ طالع ما آفتاب تحت الارض

فروغ صبح ازل در شراب نیم شمی است

آفتاب جب غروب ہو جاتا ہے تو گویا زمین کے نیچے چلا جاتا ہے، اسی لیے آفتاب تحت الارض کہا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارے نصیب کے زائچے میں (جام شراب) آفتاب تحت الارض ہے جو طلوع ہونے والا ہے، یعنی جو ہمارے افقِ بخت پر سے ہویدا ہوگا۔ ہماری نیم شمی شراب میں صبح ازل کی فروغ ہے۔

نہ ہم پیا لگی ز اعدان بلائی بود

خوش است، گرمی بیغش خلا فشرع نبی است

لغت: ”مے بیغش“ = شراب ناب، ایسی شراب جس کے پینے میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ کہتا ہے کہ اچھا ہوا کہ شراب شرع نبوی کے خلاف ہے ورنہ زاہدوں کے ساتھ بیٹھ کے

پینا (یعنی اس کا ہم پیالہ ہونا) عذاب ہو۔

هر آنچه در نگری جز بہ جنس مائل نیست

عیار بیکسی ما شرافت نسبی است

مولانا حالی لکھتے ہیں جس کو دیکھیے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافت نسب میں کوئی میری مثل نہیں اس لیے میری طرف کوئی مائل نہیں اور یہی میری بیکسی کی وجہ ہے۔

کسی کہ از تو فریب و فا خورد، داند

کہ بی وفائی گل در شمار بوالعجبی است

جس شخص نے تجھ سے فریب و فاکھایا ہو، وہ خوب جانتا ہے کہ تیری بے وفائی کے مقابلے میں گل کی بے وفائی عجب طرح کی نادانی معلوم ہوتی ہے۔

میان غالب و واعظ نزاع شد ساقی

بیا بہ لایہ کہ هیچان قوت غضبی است

اے ساقی! غالب اور واعظ الجھ پڑے ہیں۔ تو ذرا خوشامد انداز میں آ کہ یہ نزاع، محض قوت غضب کے جوش کا نتیجہ ہے۔





## غزل نمبر (۵۴)

نشاط معنویان از شراب خانہ تست

فسونِ بابلیان فصلی از فسانہ تست

بقول مولانا حالی اس تمام غزل میں معشوق حقیقی کی طرف اشارہ ہے۔

لغت: ”فسونِ بابلیان“ = بابل عراق میں کونے کے قریب ایک شہر تھا جو اب برباد ہو چکا ہے۔ یہاں کے لوگ سحر و شراب کے لیے مشہور تھے۔ اسی لیے ”فسونِ بابلیان“ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

”معنویان“ بابلیان کی ضد۔ اہل معنی۔ اہل طریقت۔

اہل طریقت بھی تیری ہی شراب سے سرشار ہیں اور بابلیان کا سحر و فسون بھی تیرے ہی فسانے کا حصہ ہے، یعنی حق و صداقت اور کفر اور ضلالت کے سب ہنگامے اسی ذات حق سے وابستہ ہیں۔

بجام و آئینہ حرف جم و سکندر چست

کہ ہر چہ رفت بہ ہر عہد، در زمانہ تست

مولانا حالی لکھتے ہیں:

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جام جہاں نما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں، کیونکہ جو کچھ جس زمانے میں گزرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

فریب حسن بتان پیشکش اسیر تو ایم

اگر خطست و گر خال، دام و دانہ تست

ہم جو حسن بتاں کا فریب کھا رہے ہیں، یہ تو محض ظاہری بہانہ ہے۔ دراصل ہم تیرے ہی اسیر محبت ہیں۔ بتوں کے یہ خط و خال کیا ہیں، تیرا ہی دام و دانہ ہیں۔

ہم از احاطہ تست این کہ در جہان مارا

قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانہ تست

مولانا حالی فرماتے ہیں:

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو بتکدے میں مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر ہے۔

پھر را تو بتاراج ما گماشتہ

نہ ہر چہ دزد ز ما برد در خزانہ تست؟

آسمان کو تو نے ہمیں لوٹنے پر مامور کیا ہوا ہے لیکن کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہم سے لوٹ کے لے گیا ہے وہ تیرے خزانے میں موجود ہے۔

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسمان پیاست

نہ تیز گامی تو سن ز تازیانہ تست

لغت: ”اگر میرا تخیل، آسمان کی سیر کرتا ہے“ (یعنی وہاں اسرار و رموز میں دخل دیتا ہے) تو میرا کیا قصور ہے؟ یہ تیرا ہی تازیانہ تو ہے جس نے میرے تخیل کے گھوڑے کو تیز رفتار کر رکھا ہے۔



## غزل نمبر (۵۲)

چشم از ابر اشکبار تر است

از عرق جھہ بھار تر است

ابر رو رہا ہے لیکن میری آنکھیں ابر سے بڑھ کر اشکبار ہیں۔ بہار کی پیشانی تر ہے یعنی شرم سے پسینہ پسینہ ہوتی ہے۔

ابر بہار برس رہا ہے لیکن مجھے اشکبار دیکھ کر شرمندہ ہو گیا ہے۔ غالب کے قصیدے کا ایک مقطع ہے:

ابر اشکبار و من جبل از نا گریستن

دارد تفاوت آب شدن تا گریستن

یہ شعر پہلے شعر کی ضد ہے:

گریہ کرد از فریب و زارم کشت

نگہ از تیغ آبدار تر است

اس نے فریب سے آنسو بہائے اور مجھے ان آنسوؤں نے مار ڈالا۔ سبحان اللہ! نگہ تلواری سے کتنی زیادہ تیز (آبدار) ہوتی ہے۔ حسن کی بیگی ہوئی آنکھوں سے جونگا ہیں نکلتی ہیں وہ تلواری کی دھار سے زیادہ قاتل ہوتی ہیں۔

غالب:

کرے ہے قتل لگاوت میں تیرا رو دینا

کوئی تری تیغ نگہ کو آب تو دے

می بر انگیزش بہ کشتن من

دشمن از دوست نغمسار تر است

رقیب، میرے محبوب کو میرے قتل پر ابھارتا ہے، دشمن رقیب دوست سے زیادہ نغمسار نکلا۔ محبوب عاشق کو قتل نہیں کرتا۔ وہ عاشق کی حالت زار سے پیچھے کی بجائے خوش ہوتا ہے۔ اگر رقیب اسے عاشق کے قتل پر اکساتا ہے تو وہ گویا عاشق کا ہمدرد ہے کیونکہ مر کر عاشق کے دکھ ختم ہو جائیں گے۔

دی مگر مست بودہ کا مروز

شکرم از شکوہ نا گوار تر است

لغت: ”دی“ = کل رات۔

کل رات تو شاید مستی کے عالم میں تھا کہ آج میں جو تیرا شکر ادا کر رہا ہوں، وہ میرے شکوے سے زیادہ ناگوار محسوس ہوتا ہے۔

عاشق بالعموم معشوق سے شکوہ و شکایت کا اظہار کرتا رہتا تھا، نہ جانے کیا بات تھی کہ معشوق صبح اٹھ کر غیر معمولی طور پر مہربان تھا صبح اٹھ کر غور کیا تو دل میں شکوک پیدا ہوئے کہ معشوق کے اس انداز لطف و کرم کی تہ میں کیا تھا۔ کہیں یہ سب کچھ مستی کا نتیجہ تو نہیں تھا کہ رقیب کی بجائے مجھ پر نظر عنایت رہی اس لیے شکرگزاری میں ایک تلخی سی آگئی ہے اور اس کے اظہار میں شکوے کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

ای کہ خوی تو ہچو روی تو نیست

دیدہ از دل اُمیدوار تر است



انسان کی نظر تو چہروں کو دیکھتی ہے، طبیعت کی افتاد کا اندازہ دل ہی کر سکتا ہے معشوق حسین صورت تو ہے لیکن حسن طبیعت سے عاری ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

تیری خوتیرے چہرے جیسی نہیں۔ میری آنکھیں دل سے زیادہ پر امید ہیں۔ آنکھیں ظاہری صورت سے فریب کھا کر امید میں باندھ سکتی ہیں، دل سے ایسا نہیں ہو سکتا۔

نو بدولت رسیدہ را نگرید

نطش از زلف مشکبار تر است

لغت: ”نو بدولت رسیدہ“ = جسے تازہ تازہ دولت میسر آئی ہو۔

اردو میں ہم اس کے لیے ”نو دولتی“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ایسا شخص اکثر اپنی دولت کی غیر معمولی نمائش کرتا ہے۔ شاعر نے حسن محبوب کو نو دولتی کہا ہے جسے سبزہ خط کی نئی دولت نصیب ہوئی ہے۔ سبزہ خط کی دل کشی زلف کی دل کشی سے بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے: اس نو دولتی کو دیکھو، اس کا سبزہ خط زلف سے زیادہ سیاہ اور معطر ہے۔ ”مشکبار“ میں سیاہی اور خوشبودنوں غنصر شامل ہیں۔

طفلی و پر دلیر می شکنی

آہ عہدی کہ استوار تر است

لغت: ”پر دلیر“ = بہت دلیر۔ یہاں دلیرانہ کا مفہوم دے رہا ہے۔ معشوق کسن ہے اس لیے جو عہد وفا باندھتا ہے، بڑی سادگی اور آسانی سے باندھتا ہے اور پھر بے تکلفی اور بے پروائی سے توڑ بھی دیتا ہے۔ ان سب باتوں میں ایک ادا اور دل کشی ہے۔ اگر عہد ذرا زیادہ استوار ہو تو وہ ٹوٹ نہ سکے گا، اور معشوق اسے توڑ نہ سکے گا اسے مایوسی ہوگی۔ اسی لیے ”آہ“ کا

لفظ لا کر اظہار افسوس کیا ہے۔

ہمہ عجز و نیاز می خواہند

زار تر ہر کہ حق گزار تر است

ہر شخص عجز و نیاز کا طلب گار ہے۔ چنانچہ عجز و نیاز کا حق پہچاننے والا عجب مصیبت میں ہے۔ وہ کس کس کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار کرے۔

خدا بھی عجز و نیاز کو پسند کرتا ہے اور معشوق بھی۔ عاشق کیا کرے، کدھر جائے۔

خستہ از راہ دور می آیم

پا ز تن پارہ فگار تر است

لغت: ”خستہ“ = تھکا ماندہ۔

تھکا ماندہ ہوں اور دور سے آ رہا ہوں۔ جسم کی جو حالت ہے سو ہے، پاؤں اس سے بھی قدرے زیادہ زخمی ہیں۔

شاعر کا اصل مقصود، شوق کی بیابان نوردی کو ظاہر کرنا ہے۔

شکوہ از خوی دوست نتوان کرد

بادہ تند ساز گار تر است

دوست کی (تند) طبیعت کا کیا شکوہ۔ شراب تندی اچھی ہوتی ہے۔

تندی طبیعت کو تندی شراب سے تشبیہ دی ہے۔ معشوق کی اس طرز جفا میں خاص مزہ

ہوتا ہے۔



می رسد گر بخویشتن نازد

غالب از خویش خاکسار تراست

غالب کو جب اپنے آپ تک رسائی ہوتی ہے تو وہ فخر کرتا ہے کیونکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ خیال کرتا ہے اس سے زیادہ حقیر ہے (خاکسار)۔

غالب کا فخر کرنا دو وجہ سے ہے۔ ایک تو عرفانِ نفس کی وجہ سے کہ اسی میں انسان کو اپنے آپ کا پتا چلتا ہے۔ دوسرے یہ احساس کہ میں ایک خاکسار ہوں اور خاکساری انسان کا بڑا وصف ہے۔



### غزل نمبر (۵۳)

ظہور بخشش حق را بھانہ بی سہمی است

دگر نہ شرم گنہ در شمار بی ادبی است

خدا کے حضور گناہگار کا اپنے گناہوں پر نادم ہونا ایک طرح کی بے ادبی ہے کیونکہ بندوں پر حق تعالیٰ کی بخششیں بغیر کسی سبب کے نازل ہوتی ہیں۔

زگیر و دار چہ غم، چون بہ عالمی کہ منم

هنوز قصہ حلاج حرف زیر لبی است

لغت: ”زگیر و دار“ = محاسب یا مواخذہ۔

”حرف زیر لبی“ = وہ بات جو زیر لب ہو۔ زباں پر نہ آئی ہو۔

”قصہ حلاج“ = مشہور قصہ ہے کہ منصور بن حلاج نے علانیہ ”انا الحق“ کہا اور اس کی

پاداش میں دار پر چڑھا دیا گیا۔ فتویٰ دینے والوں کی نظریں یہ کلمہ کفر تھا۔ بعض صوفیہ نے بھی اسے قبل از وقت قرار دیا ہے۔

مجھے محاسبے کا کیا ڈر کیونکہ جس مقام پر میں ہوں وہاں ابھی تک قصہ منصور زباں پر نہیں آیا۔

گویا ابھی مقام بے خودی اور حیرت ہے۔ ابھی عرفانِ نفس کی تکمیل نہیں ہوئی۔

رموز دین فشنا سم درست و معذورم

نهاد من عجمی و طریق من عربی است

مولانا حالی اس کی شرح یوں فرماتے ہیں:

میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے، اگر اصول مذہب سے واقف نہ ہوں تو مجھ کو معذور سمجھنا چاہیے۔

نشاط جم طلب از آسمان نہ شوکت جم

قدح مباحش ز یا قوت، بادہ گر غمی است

جمشید کو شان و شوکت بھی حاصل تھی اور عیش و نشاط بھی وہ یا قوت کے پیالے میں

شراب پیتا تھا۔ لیکن شراب، یا قوت کے پیالے میں ہو یا مٹی کے، اصل شے تو شراب ہے جو سرور بخشی ہے۔ اس سرور و نشاط کے مقابلے میں ساغر یا قوت، یا دوسرے لفظوں میں شوکت جمشید کیا

شے ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:



آسمان سے نشاط جمید طلب کرنے کہ (بظاہری) شان جمید۔ یا قوت کا پیالہ اگر نہیں ہے تو نہ کسی شراب تو انگوری ہے (یعنی شراب ناب)

بالتفات نیزم در آرزو چه نزاع

نشاط خاطر مفلس ز کیمیا طلبی است

میں تو محبوب کی توجہ کے بھی قابل نہیں، آرزو کا کیا تقاضا۔ ایک مفلس انسان کے دل کی خوشی یہی ہے کہ بچارے کو کیمیا مل جائے۔

محبوب توجہ نہیں کرتا نہ کسی، ہم آرزو تو کرتے ہیں۔

بود بہ طالع ما آفتاب تحت الارض

فروغ صبح ازل در شراب نیم شمی است

آفتاب جب غروب ہو جاتا ہے تو گویا زمین کے نیچے چلا جاتا ہے، اسی لیے آفتاب تحت الارض کہا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارے نصیب کے زائچے میں (جام شراب) آفتاب تحت الارض ہے جو طلوع ہونے والا ہے، یعنی جو ہمارے افق بخت پر سے ہویدا ہوگا۔ ہماری نیم شمی شراب میں صبح ازل کی فروغ ہے۔

نہ ہم پیالگی زاحدان بلائی بود

خوش است، گرمی بنفش خلا فشرع نبی است

نفت: ”مے بنفش“ = شراب ناب، ایسی شراب جس کے پینے میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ کہتا ہے کہ اچھا ہوا کہ شراب شرع نبوی کے خلاف ہے ورنہ زاہدوں کے ساتھ بیٹھ کے

چینا (یعنی اس کا ہم پیالہ ہونا) عذاب ہو۔

هر آنچه در نگری جز بہ جنس مائل نیست

عیار بیکسی ما شرافت نسبی است

مولانا حالی لکھتے ہیں جس کو دیکھیے اپنی جنس کی طرف مائل ہے۔ چونکہ شرافت نسب میں کوئی میری مثل نہیں اس لیے میری طرف کوئی مائل نہیں اور یہی میری بیکسی کی وجہ ہے۔

کسی کہ از تو فریب و فا خورد، داند

کہ بی وفائی گل در شمار بوالعجبی است

جس شخص نے تجھ سے فریب و فاکھایا ہو، وہ خوب جانتا ہے کہ تیری بے وفائی کے مقابلے میں گل کی بے وفائی عجب طرح کی نادانی معلوم ہوتی ہے۔

میان غالب و واعظ نزاع شد ساقی

بیا بہ لایہ کہ ہیجان قوت غضبی است

اے ساقی! غالب اور واعظ الجھ پڑے ہیں۔ تو ذرا خوشامد انداز میں آ کہ یہ نزاع، محض قوت غضب کے جوش کا نتیجہ ہے۔





## غزل نمبر (۵۴)

نشاط معنویان از شراب خانہ تست

فسونِ بابلیان فصلی از فسانہ تست

بقول مولانا حالی اس تمام غزل میں معشوق حقیقی کی طرف اشارہ ہے۔

لغت: ”فسونِ بابلیاں“ = بابل عراق میں کونے کے قریب ایک شہر تھا جو اب برباد ہو چکا ہے۔ یہاں کے لوگ سحر و شراب کے لیے مشہور تھے۔ اسی لیے ”فسونِ بابلیاں“ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

”معنویان“ بابلیاں کی ضد۔ اہل معنی۔ اہل طریقت۔

اہل طریقت بھی تیری ہی شراب سے سرشار ہیں اور بابلیاں کا سحر و فسون بھی تیرے ہی فسانے کا حصہ ہے، یعنی حق و صداقت اور کفر اور ضلالت کے سب ہنگامے اسی ذات حق سے وابستہ ہیں۔

بجام و آئینہ حرفِ جم و سکندر چست

کہ ہر چہ رفت بہ ہر عہد، در زمانہ تست

مولانا حالی لکھتے ہیں:

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جامِ جہاں نما جشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں، کیونکہ جو کچھ جس زمانے میں گزرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا۔

فریبِ حسنِ بتان پیشکشِ اسیر تو ایم

اگر خطست و گر خال، دام و دانہ تست

ہم جو حسنِ بتان کا فریب کھا رہے ہیں، یہ تو محض ظاہری بہانہ ہے۔ دراصل ہم تیرے ہی اسیر محبت ہیں۔ بتوں کے یہ خط و خال کیا ہیں، تیرا ہی دام و دانہ ہیں۔

ہم از احاطہ تست این کہ در جہان مارا

قدم بہ بجلدہ و سر بر آستانہ تست

مولانا حالی فرماتے ہیں:

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو بجلدے میں مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر ہے۔

پھر را تو بتاراج ما گماشتہ

نہ ہر چہ دزد ز ما برد در خزانہ تست؟

آسمان کو تو نے ہمیں لوٹنے پر مامور کیا ہوا ہے لیکن کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہم سے لوٹ کے لے گیا ہے وہ تیرے خزانے میں موجود ہے۔

مرا چہ جرمِ گر اندیشہ آسمان پیاست

نہ تیز گامی تو سن ز تازیانہ تست

لغت: ”اگر میرا تخیل، آسمان کی سیر کرتا ہے (یعنی وہاں اسرار و رموز میں دخل دیتا ہے) تو میرا کیا قصور ہے؟ یہ تیرا ہی تازیانہ تو ہے جس نے میرے تخیل کے گھوڑے کو تیز رفتار کر رکھا ہے۔



کمان ز چرخ و خدنگ از بلا و پر ز قضا

خدنگ خوردۀ این صید کہ نشانہ تست

چرخ کماں کی طرح ہے، مصیبتیں تیر کی طرح اور قضا اس تیر کے پر ہیں۔ اس دنیا میں جو ایک صید کہ کی طرح ہے، تیر کھانے والا، تیرے ہی نشانے کی زد میں ہوتا ہے۔

نام قضا، اور آسمان کا لیا جاتا ہے حالانکہ تیر چلانے والا تو ہے۔

سپاس جود تو فرض است آفرینش را

درین فیریضہ دو گیتی همان دو گانہ تست

اس مخلوق کو تیری بخشش کا شکر بجالانا فرض ہے۔ اس فریضے میں یہ دو جہاں، شکرانے کے دو نفل ہیں۔

تو ای کہ محو خن گستران پیشینی

مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

تو قدیم اساتذہ خن کے کلام کا مداح ہے اور اس کے مطالعے میں محو ہے۔ غالب کی شاعری اور کمال فن سے اس لیے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تیرے عہد میں ہے۔



## ردیف (ث)

### غزل نمبر (۱)

مخو خود است لیک نہ چون من درین چہ بحث

او چون خودی نداشته دشمن درین چہ بحث

اس ساری غزل میں ردیف ”ردیف چہ بحث“ محاورہ آئی ہے اور شاعر نے اسے مختلف مفہوم دے کر حسن بیان کا رنگ پیدا کیا ہے۔ ”بحث“ نزاع، جھگڑا، تکرار ہے، درین چہ بحث“ کا مفہوم، ”اس میں اختلاف کی کیا گنجائش“ ”اس میں اختلاف کیسا؟“ ”دریں چہ شک“ وغیرہ وغیرہ کے ہیں۔

میرا محبوب اپنے آپ میں کھویا ہوا ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ میری طرح نہیں۔ یہ اس لیے کہ اسے کسی اپنے جیسے حریف (مقابل) سے واسطہ نہیں پڑا۔

محبوب اپنے حسن کے تصور میں گم ہے اور کسی کو اپنا ثانی نہیں سمجھتا اور یہی اس کی محویت کا جواز ہے لیکن میرا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ میں خود اپنے نفس سے مقابل ہو رہا ہوں۔ ”میرا معاملہ اس سے مختلف ہے“ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میں تو محبوب کے حسن میں محو ہوں۔

افسانہ گو ست غیر چہ مھر افگنی برد

غم برنمابد این ہمہ گفتن درین چہ بحث

لغت: ”غیر“ = مدعی، رقیب۔

رقیب اپنے عشق کے بارے میں جتنے بھی دعوے کرتا ہے، محض افسانے ہیں۔ ایسے



شخص پر محبت نثار کرنا فضول ہے سچا عاشق تو کبھی باتیں نہیں بناتا۔ جو شخص غم عشق کا مارا ہوا ہو، اس میں تاب گفتار کہاں۔

جیون و نیل نیست، دل است، از خدا بترس

گر نیست خون دیدہ بہ دامن، درین چہ بحث

محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے:

خدا سے ڈر، یہ (میرا) دل ہے۔ کوئی دریا جیوں اور دریاے نیل تو نہیں ہے۔ اگر میری آنکھوں سے خون کے آنسو میرے دامن پر نہیں بہے تو کیا ہوا۔

عاشق کامل درد محبت سے خون ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود وہ ضبط سے کام لے رہا ہے اور آنسو تک نہیں بہاتا۔ سنگدل معشوق ہے کہ اسے عاشق کی حالت زار کا یقین نہیں آتا اور کہتا ہے کہ تمہارے دامن پر تو کوئی قطرہ خون نظر نہیں آتا۔ پھر یہ دعوائے عشق کیسا؟ اسی لیے کہتا ہے کہ اللہ سے ڈر، یہ دل کا معاملہ ہے۔ دل ہے کوئی دریا تو نہیں ہے کہ اس سے خون کے دھارے جیوں و نیل کے پانی کی طرح بہتے چلے جائیں۔

بی چارہ بین کہ جان بہ شکر خندہ دادہ است

خویشانش از روند بہ شیون، درین چہ بحث

نعت: ”خویشان“ خویش کی جمع، عزیز و اقارب۔ ”شکر خندہ“ = خندہ شیریں۔

بیچارے عاشق نے محبوب کی میٹھی ہنسی پر (جو دل کو بے طرح موہ لیتی ہے) جان دی ہے۔ اب اگر اس کے خویش و اقارب اس کے مر جانے پر نالہ و فریاد کرتے ہیں تو اس پر اعتراض کیسا؟

بی پردہ شو ز غصہ و الزام دہ مرا

گفتم کہ گل خوش است بہ گلشن، درین چہ بحث

عاشق نے پھول کی تعریف کی اور کہہ دیا کہ باغ میں پھول بہت خوبصورت لگتا ہے۔ معشوق کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے اس لیے کہ پھول کا حسن اس کے آگے کیا ہے۔ عاشق اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے:

بے شک میں نے یہ کہہ دیا کہ پھول خوبصورت چیز ہے۔ میں نے غلطی کی ہے۔ سزا کے لائق ہوں۔ غصے میں آ کے چہرے سے نقاب اٹھا دے اور پھر مجھے ملزم ٹھہرا۔ محبوب کا چہرہ غصے سے متملاً اٹھے گا تو پھول کی ساری رنگینیاں اور رعنائیاں ماند پڑ جائیں گی۔ اس شعر میں حسن طلب ہے۔ عاشق پھول کا ذکر اس لیے کرتا ہے کہ معشوق برہم ہو جائے اور نقاب اٹھا کے کہے، دیکھو اس چہرے کے مقابلے میں کی پھول کیا حیثیت ہے۔

یہ شعر مرزا غالب کے تصور حسن پر روشنی ڈالتا ہے کہ حسن ہر حال میں حسیں ہوتا ہے۔

مژگان بدل ز ذوق نگہ می رود فرد

بی رشتہ نیست جنبش سوزن، درین چہ بحث

مژگاں کو سوزن یعنی سوئی سے تشبیہ دی ہے اور محبوب کی نگاہوں کو دھاگا (رشتہ)

قرار دیا ہے۔

بظاہر معشوق کی مژگاں عاشق کے دل میں اترتی جا رہی ہیں لیکن دراصل یہ معشوق کی دل آویز نگاہیں ہیں۔ چنانچہ اس خیال کو یوں ادا کیا کہ مژگاں، ذوق نگہ کے باعث دل میں اترتی جا رہی ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ یہ سوئی جو چل رہی ہے بغیر دھاگے کے نہیں چل رہی۔



بت را بہ جلوہ دیدہ و بر جای ماندہ است

گر بحث می کنم بہ برہمن، درین چہ بحث

برہمن کو دیکھو، بت اس کے رو برو ہے، ہمنشین پھر بھی اس پر کچھ نہیں ہوتا۔ اب اگر

میں اس بارے میں برہمن سے بحث کروں تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔

ہمسایہ ناخوش است، خوشم ہمنشین خوش

ار نامہ ام نہاد بہ روزن، درین چہ بحث

ہمسایہ خوش نہیں ہے، میں خوش ہوں۔ ہمنشین ناموش رہ، اگر اس نے میرا خط روزن

میں رکھ دیا تو کیا ہوا۔

بعد از حزین کہ رحمت حق بر روانش باد

ما کردہ ایم پر ورش فن درین چہ بحث

”علی حزیں“ مشہور فارسی کا شاعر جس کی زندگی کا بیشتر حصہ پاک وہند کی سرزمین میں

بسر ہوا۔ حزیں کے بعد (اس پر اللہ کی رحمت ہو) ہم ہی نے فن (شعر) کی پرورش کی ہے۔

اوجتہ جتہ غالب و من دستہ دستہ ام

عرفی کسی است لیک نہ چون من درین چہ بحث

لغت: ”جتہ جتہ“ = تھوڑا تھوڑا۔ دستہ دستہ = جتہ جتہ کی ضد یعنی بہت

اس سے پہلے شعر میں حزیں کا ذکر آیا تھا جس میں غالب نے حزیں کو خراج عقیدت

پیش کرتے ہوئے اپنی عظمت کی طرف بھی اشارہ کیا۔ اس شعر میں عرفی سے اپنا مقابلہ کرتے

ہوئے کہتا ہے کہ وہ تھوڑا تھوڑا غالب سے (یعنی مجھ سے) مشابہ ہے لیکن میں تو سرتاپا غالب ہی ہوں۔ عرفی کوئی ہے، لیکن وہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی ہی میری عظمت کو پہنچتا ہے۔



## ردیف (ج)

### غزل نمبر (۱)

نقشم گرفتہ دوست، نمودن چہ احتیاج

آئینہ مرا بہ زدودن چہ احتیاج

لغت: ”زدودن“ = صاف کرنا۔ جلا کرنا۔

میرے دوست میں میرا رنگ آ گیا ہے، اس کے ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

میرے آئینے کو جلا کر حاجت نہیں۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ انسان کا دل جتنا صاف ہوگا اتنا ہی صاف

اس میں اللہ کا عکس نظر آئے گا لیکن جب خدا خود ہی دل میں سما جائے تو پھر آئینہ دل کو جلا دینے

کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

با پیرھن ز ناز فرو می رود بہ دل

بند قبای دوست کشودن چہ احتیاج

محبوب، حجاب پیرہن کے وجود دل میں اترتا جا رہا ہے، اس لیے اس کے بند قبا کو

کھولنے کی کیا حاجت؟ محبوب کے جسم حسین کے خط و خال لباس ہی میں نمایاں ہو رہے ہیں۔



چون می توان به رهگذر دوست خاک شد

بر خاک راہ نا صیہ سودن چه احتیاج

انسان جب دوست کی راہ میں سر تا پا خاک ہو سکتا ہے تو پھر اس کی راہ میں جہیں سائی کی کیا ضرورت۔

بگر کہ شعلہ از نفسم بال می زند

دیگر ز من فسانہ شنودن چه احتیاج

لغت: ”بال زند“ = پرزدن، پر پھڑ پھڑانا، اڑنا، ابھرنا۔

دیکھ کہ میرے سانس سے شعلے ابھر رہے ہیں۔ پھر مجھ سے میری روداد سننے کی کیا ضرورت ہے۔

از خود بہ ذوق زمزمہ میتوان گذشت

چندین ہزار پردہ سرودن چه احتیاج

لغت: ”زمزمہ“ = اصل میں اس بھجن کو کہتے تھے جو آتش پرست اپنے معبدوں میں دھیمے سروں میں گاتے تھے۔ اب یہ لفظ عام نغمے کے معنوں میں آتا ہے اس شعر میں اصلی معنوں کا پہلو بھی موجود ہے۔

”پردہ“ حجاب بھی ہے اور سر کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ یہاں موخر الذکر کے معنوں میں آیا ہے انسان تو ایک نغمہ سے لذت اندوز ہو کر بے خود ہو سکتا ہے۔ اس لیے اتنے ہزار نغمے گانے کی کیا حاجت ہے۔

اس شعر میں رکی اور نمائشی طریق کار پر طنز کی گئی ہے۔ نام نہاد صوفی جو نغمے سن کر اپنے

پہ حال طاری کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سے واقف نہیں ہوتے کہ بخودی کی کیفیت تو ایک دل کش لے لی سے طاری ہو سکتی ہے۔ دیوانہ راہوئے بس است۔

در دست دیگر است سیاہ و سفید ما

با روز و شب بہ عربدہ بودن چه احتیاج

کہا جاتا ہے کہ گردش روز و شب سے انسانی قسمتیں متاثر ہوتی ہیں، اس لیے لوگ اسے کوستے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارا سیاہ و سفید تو کسی اور کے ہاتھ میں ہے، پھر گردش روزگار کا شکوہ کیسا اور اس سے الجھنے کی کیا ضرورت!

تائب کشودہ، مزہ در دل دویدہ است

بوس لب ترا بہ ربودن چه احتیاج

محبوب سے خطاب کر کے کہتا ہے: تیرے لبوں کے چومنے کی کیا حاجت؟ تو نے تو ابھی لب ہی نہیں کھولے کہ لذتیں دل میں اتر گئی ہیں:

بفگن در آتش و تب و تابم نظارہ کن

غنمائے مرا بکشودن چه احتیاج

لغت: ”غنمائے“ = خط جس میں درد بھری داستان درج ہے۔ میرے غم نامے کو کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اے آگ میں ڈال دو۔ (یہ جملے گاتو) تمہیں میرے دل کی تڑپ کا اندازہ ہوگا۔

آن کن کہ در نگاہ کسان محتشم شوی

بر خویش ہم ز خویش فزودن چه احتیاج



لغت: ”برخویشن فرودن“ نخوت سے اپنے آپ پر ناز کرنا۔ وہ جو ہر دکھا کہ تو لوگوں کی نظروں میں قابل احترام ہو جائے یونہی اپنے آپ ہی اپنی عظمت کا احساس پیدا کر لینا کوئی معنے نہیں رکھتا۔

خواب است وجہ ہمت آوارہ بینشان

محو رخ ترا بہ غنودن چہ احتیاج

لغت: ”آوارہ بینش“ = وہ لوگ جن کی نظریں آوارہ ہوں۔ کبھی کہیں پڑیں کبھی کہیں۔ ہر جائی لوگ۔ ”غنودن“ = اوجھنا۔

نیند تو ان لوگوں کی ہمت افزائی کرتی ہے جو آوارہ نظر ہیں۔ جو شخص تیرے جلوہ رخ کے دیکھنے میں محو ہے، اس کی آنکھوں میں نیند کہاں!

تاب سموم فتنہ گر این است غالبا

کشت امید را بدرودن چہ احتیاج

لغت: ”دروودن“ = کاٹنا۔ فصل کاٹنا۔ ”سموم“ = گرم ہوا۔ ”فتنہ“ = ناموافق حالات۔ تباہ کن فضا۔

غالب! اگر فتنہ جہاں کی سموم کی گرمی کا یہی عالم ہے تو امیدوں کی کھیتی کو کاٹنے کی امید لگائے رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔



## غزل نمبر (۲)

جلوہ می خواہم آتش شو، هوای ماسخ

دستگاہ خویش بین و مدعای ماسخ

لغت: ”سجیدن“ = بھانپنا۔ وزن کرنا۔ اندازہ لگانا۔ اسی سے ”سج“ فعل نہیں ہے یعنی اندازہ نہ کر ”ہوا“ = انتہائی خواہش، حرص و آرز ہو باد۔ یہاں یہ لفظ بڑا ذومعنی آیا ہے۔ ”دستگاہ“ اثاثہ استطاعت، بساط اور حوصلہ۔

ہماری خواہشات کے عالم کو نہ دیکھ۔ ہم تیرے جلوے کے طالب ہیں۔ سرتاپا شعلہ بن کر نمودار ہو جا۔ دیکھ کہ تیرے حسن کی وسعت کتنی ہے۔ یہ مت دیکھ کہ ہمارا مدعا کیا ہے۔ یعنی جلوہ حسن کے شعلے پوری شدت سے بھڑکنے چاہئیں۔ ہم جلتے ہیں تو کوئی پروا نہیں۔

گر خودت مہری بجنبد کام مشتاقان بدہ

ورنہ نیروی قضا اندر رضای ماسخ

لغت: ”کام کسے دادن“ = کسی کی خواہش پوری کرنا۔

”اگر محبت خود تجھے اکسائے تو عاشقوں کی دل جوئی کرورنہ یہ خیال نہ کر کہ قضا ہماری رضا کا ساتھ دے گی۔ یعنی ہماری خواہشات کو پورا کرنے میں ہمارا ساتھ دے گی۔

همنشین دارو دہ و دل در خدائی پاک بند

میروی از کار درد بی دوائی ماسخ



اے ہمیش تو ہمارے درد کا مداوا کرنا چاہتا ہے تو کر لے اور دارودے دے لیکن (اس کے لیے) خدا پر بھروسہ کر، ہمارے درد لا دوا کا اندازہ لگانے کی کوشش نہ کر۔ تیری یہ کوشش رانگاں جائے گی۔

قدرت ہی چاہیے تو چارہ درد عشق کا گر ہو جائے ورنہ یہ کام کسی چارہ گر کے بس کا نہیں۔

مرگ ما را تا کہ تمہید شکایت کردہ است

رنج و اندوہی کہ دارد از برای ما مسخ

یہ کون ہے جس نے ہماری موت کو تمہید شکایت بنا لیا ہے۔ موت میں ہمارے لیے کیا دکھ درد پنہاں ہیں، ان کا اندازہ لگانے کی کوشش نہ کر۔

عاشق کی موت پر لوگوں کو شکایت کا موقع ملا کہ اس پچارے کو ناحق مار دیا گیا۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ موت میں وہ دکھ درد نہیں تھے جو زندگی میں لاحق تھے۔ موت نے ہمیں ان سے نجات دلوائی۔ شکایت کیسی۔

ای کہ نغش ما بری پندارم از ما بودہ

دستزد او چہ داری خون بھائی ما مسخ

لغت: ”دست مزد“ = ہاتھوں کی مزدوری۔ محنت کا صلہ۔

خون بھا = کسی کے خون بہانے کا معاوضہ۔ او کا اشارہ معشوق کی طرف ہے جس نے عاشق کو قتل کیا ہے۔

عاشق، نغش اٹھانے والے سے خطاب کر کے کہتا ہے:

تو نے ہماری نغش کو اٹھایا اور ہم نے سمجھا کوئی ہم میں سے ہے۔ معشوق سے تجھے کیا مزدوری ملی ہے جو تو ہمارے خوں بہا کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ معشوق جفا پیشہ، عاشق کو قتل کرنے کے بعد اس کی نغش کو اٹھوانے کے لیے کسی کو مزدوری دینے پر آمادہ نہیں۔ جو عاشق اس کسمپرسی کے عالم میں مرے گا، اس کے خوں بہا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب جو کوئی اس کی نغش اٹھائے تو سمجھ لیجے یہ اس کا کوئی خیر خواہ ہے اور اس کا ہمدردی سے نغش کو اٹھانا ہی اس کی مزدوری ہے اور عاشق کے قتل کا خوں بہا بھی۔

خویش را شیرین شمردی خصم را پرویز گیر

سرگزشت کو ہلکن با ماجرائی ما مسخ

معشوق سے خطاب کر کے کہتا ہے: تو نے اپنے آپ کو شیریں سمجھ لیا، (ٹھیک ہے) اب ہمارے دشمن (رقیب) کو خسرو پرویز سمجھ لے لیکن کو ہلکن (فرہاد) کی سرگزشت سے ہمارے ماجرائے غم کا اندازہ نہ کر۔

حسب معمول مرزا غالب نے اس شعر میں فرہاد پر لطیف طنز کی ہے کہتے ہیں کہ میرا محبوب شیریں اور رقیب خسرو پرویز سہی لیکن مجھے فرہاد کا نام دینا میری توہین ہے۔ میرا مقام اس سے کہیں بلند ہے۔

آہ از شرم تو و ناکامی ما، زود باش

در سلائی پایہ مهر و وفای ما مسخ

اس شعر کا پس منظر یہ ہے کہ عاشق، عشق میں سخت ناکام رہا اور معشوق کو اپنی بے اتفاقی اور جو رو جھٹا پر ندامت ہوئی مگر دیر کے بعد۔ اب وہ اپنے گزشتہ رویے کی عاشق کی وفاداریوں کو



مذہب نظر رکھ کر تلافی کرنا چاہتا ہے اور یہ بات مشکل ہے۔ معشوق کا اپنے کیے پر نادم ہونا ہی کافی ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے:

افسوس تمہاری ندامت پر اور ہماری ناکامی پر، اب جو التفات پر مائل ہوئے ہو تو جلدی کرو اور اس غمخیزے میں پڑو کہ ہماری وفاداریوں کی کہاں تک تلافی کر سکو گے۔ جو کچھ ہم پر گزر چکی ہے، اس کی تلافی تو کیا ہوگی، ہاں تمہارا احساس ندامت ہی بڑی تلافی ہے۔

زاری ما در غم دل دید و شادی مرگ شد

مردن دشمن ز تاثیر دعای ما مسخ

دشمن سے مراد رقیب ہے۔ یہ نہ سمجھ کہ رقیب کی موت ہماری دعاؤں کے اثر سے واقع ہوئی ہے۔ اس نے غم دل کے ہاتھوں ہماری حالت زار کو دیکھا اور خوش ہوا اور اتنا خوش ہوا کہ مر گیا (شادی مرگ شد)۔

کامھا محو است عیب بھا زوال ما پرس

دیدہ ہا کور است جنس ناروای ما مسخ

لغت: ”کام“ = خواہش۔

ہم خواہشات میں کھو گئے ہیں اور یہ ہمارا ایک ایسا عیب ہے جس میں کوئی فرق نہیں آتا (بے زوال ہے) دیکھنے والی آنکھیں اندھی ہیں، ہماری جنس ناروا کا اندازہ نہ کر۔

مرزا غالب کو اپنی شاعرانہ اور فنکارانہ عظمتوں کا شدید احساس تھا اور اس احساس کے ساتھ انھیں یہ توقع تھی کہ لوگ ان کی قدر کریں گے۔ لیکن ان کے جو ہرگز پر رکھنے والی آنکھیں نہ تھیں، اس لیے ان کی شاعری ایک جنس ناروا بن کر رہ گئی۔ مگر تو قعات کا ہجوم بدستور قائم رہا اور

یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

در گذر زین پرده چون د ساز غالب نیستی

مدعی ہنجار خود گیر و نوائی ما مسخ

لغت: ”پردہ“ = حجاب کے علاوہ اس لفظ کے ایک معنی سر کے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں اسی مفہوم میں آیا ہے۔

”دمساز“ = ہمسرا، ہمنوا، یہاں موخر الذکر معنی موزوں نہیں۔

”نوا“ = آواز، نغمہ۔ یہاں بھی نغمہ کا مفہوم درکار ہے۔

”مدعی“ = دعویٰ کرنے والا، مقابل یا حریف۔

مرزا غالب اپنے مقابل سے جو شعر و سخن کے فن میں ان کا ہمسرا ہونے کا دعوے دار ہے، خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں ”چونکہ تو غالب کا ہمنوا نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ نغمہ جو تو الاپ رہا ہے، چھوڑ دے اور اپنی راہ لے۔ اور ہمارے نغمے کو بھانپنے اور اس کے پرکھنے کی کوشش نہ کر۔ میری نوا کے صحیح مقام سے تو آشنا نہیں ہو سکتا۔





## ردیف (ج)

## غزل نمبر (۱)

در پردہ شکایت ز تو داریم و بیان هیچ  
زخم دل ما جملہ دھان است و زبان هیچ  
ہمیں در پردہ تم سے شکایت ہے لیکن یہ شکایت حرف و بیان میں نہیں آتی۔ ہمارا زخم  
دل منہ (دہان) کی طرح کھلا ہے لیکن اس میں زبان نہیں (کہ اپنا حال دل کہہ سکیں)

ای حسن گر از راست زنجی، سخی ہست  
ناز این ہمہ یعنی چہ، کمر هیچ و دھان هیچ  
معشوق کے دہن کی تنگی اور کمر کی نازی کو حسن کی خوبی میں شمار کیا جاتا ہے۔ شعرا اکثر  
اس امر میں مبالغہ کرتے ہوئے دہن اور کمر کو ہیچ کہہ دیتے ہیں یعنی سرے سے ہے ہی نہیں۔ کہتا  
ہے: اے حسن اگر تو ہیچ بات سے خفا نہ ہو تو ایک بات کہنے کی ہے۔ اتنا ناز کس چیز پر ہے، نہ تمہاری  
کمر ہے نہ دہن۔

در راہ تو ہر موج غباری است روانی

دل تنگ نہ گردم ز ہر افشاندن جان هیچ

”ہیچ دل تنگ نہ گردم“ = میں بالکل افسردہ خاطر نہیں ہوتا۔

تیری راہ میں گرد و غبار کی جو لہر اٹھتی ہے وہ ایک روح (رواں) ہے (خود جان ہے،

زندہ ہے) اس لیے میں (اس راہ میں) ہر مرتبہ جان دینے سے گھبراتا۔ عشق میں جان دینا مرنا  
نہیں، یہ ایک جان تازہ حاصل کرنا ہے۔

کار فرمائی شوق تو فیست آورد  
مردم و باز بایجاد دل و جان رتم غالب

برگریہ بیافزود ز دل ہر چہ فرو ریخت  
در عشق بود تفرقہ سود و زیان هیچ  
عشق میں ہمارے دل سے جو کچھ کم ہوا (فرو ریخت) اسی قدر آنسوؤں میں اضافہ  
ہوا۔ عشق میں نفع و نقصان (سود و زیان) کا کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔

تن پروری خلق فزون شد ز ریاضت  
جز گرمی افطار ندارد رمضان هیچ

لوگ ریاضت کے لیے روزہ رکھتے ہیں، لیکن روزہ افطار کرتے وقت اتنا زیادہ کھاتے  
ہیں، گویا تن پروری کر رہے ہیں۔ کہتا ہے:  
ریاضت سے لوگوں کی تن پروری اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ رمضان جوش افطار کے سوا  
کچھ بھی نہیں۔

دنیا طلبان، عربدہ مفت است بجوشید

آزادی ما هیچ و گرفتاری تان هیچ

اے دنیا طلب لوگو، یہ نزع بے کار ہے، جس سرگرمی سے چاہو، دنیا طلب کرو۔ ہم اگر  
دنیا سے خود کو آزاد سمجھتے ہیں تو کیا اور تم اگر خواہشات دنیاوی میں مبتلا ہو تو کیا۔



بیانہ رنگی ست درین بزم بہ گردش  
 ہستی ہمہ طوفان بہار است، خزان مہج  
 اس بزم دنیا میں ایک رنگین جام ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ زندگی تو ایک (مسلسل)  
 طوفان بہار ہے، خزاں کوئی شے نہیں۔

عالم ہمہ مرآت وجود است عدم چیست  
 تا کار کند چشم، محیط است، کران مہج  
 لغت: "تا کار کند چشم" = جہاں تک نظر کام کرتی ہے۔  
 "محیط" = "سمندر"۔ "کران" = کنارہ۔

یہ کائنات سرتاپا آئینہ حیات ہے، عدم کیا ہے (یعنی کچھ نہیں) جہاں تک نظر کام کرتی  
 ہے، زندگی کا ایک سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

در پردہ رسوائی منصور نوائی است

رازت نہ شنودیم ازین خلوتیان مہج

خدا سے خطاب کر کے کہتا ہے: منصور انا الحق کہہ کر بدنام ہوا، لیکن اس کی رسوائی میں  
 ایک پتے کی بات تو تھی (نوا) اس نے ایک آواز تو بلند کی۔ یہ خلوت نشین لوگ تو ترے راز سے  
 یکسر نا آشنا ہیں، ہم نے ان سے کوئی حکمت کی بات نہیں سنی۔

غالب ز گرفتاری اوہام برون آ

باللہ جہان مہج و بد و نیک جہان مہج

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کائنات کا وجود، محض انسان کی قوت واہمہ کی تخلیق  
 ہے۔ درحقیقت کچھ نہیں، چنانچہ کہتا ہے:  
 غالب خدا کی قسم یہ جہاں اور اس جہاں کے نیک و بد سب ہیچ ہیں۔ ان اوہام اور  
 وہم پرستیوں سے باہر آ جا (انہیں چھوڑ دے)۔



### غزل نمبر (۲)

ای کہ نبوی ہرچہ نبود در تماشائش مہج

نیست غیر از سیما عالم، بسودائش مہج

تیری اپنی ہستی کچھ نہیں۔ اس لیے جس چیز کا وجود کچھ نہ ہو، اس کے نظارے میں  
 نہ الجھ۔ یہ عالم تو فریب نظر کے سوا کچھ نہیں، اس کی محبت میں نہ الجھ۔

موجہ از دریا، شعاع از مہر، حیرانی چراست

محو اصل مدعا باش و بہ اجزائش مہج

لہروں کا وجود سمندر سے ہے، شعاعوں کا سورج سے، پھر حیرانی کیسی۔ تو اصل حقیقت  
 کی طرف مائل ہو۔ اس کے اجزا کو چھوڑ دے۔

آسمان و ہم است از برجیس و کیوانش مگوی

نقش ما مہج است بر پنهان پیدائش مہج



آسمان تو ایک وہم ہے، اس کے برجیں اور کیوان (سیاروں) کا تذکرہ کیسا۔ ہماری ہستی کچھ نہیں، اس کے ظاہر اور باطن کا کیا تذکرہ۔

آخر از مینا بجاہ و پایہ افزون نیستی

بندۂ ساقی شو و گردن ز ایمانش میچ

تو قدر و منزلت میں صراحی سے بڑھ کر تو نہیں ہے۔ بندۂ ساقی ہو جا، اور اس کے اشارے سے روگردانی نہ کر۔

صورتی باید کہ باشد نغز و زیبا روزگار

گو بہ اکسوفش پوش و گو بد بیانش میچ

کوئی صورت (حسن) ہونی چاہیے کہ جس سے زندگی دلکش اور زیبا ہو جائے۔ اسے قیمتی سائن اور کجواب میں کیا لپیتا ہے۔

نامہ عنوانش بنام تست، زان رُو تازہ است

داغ غم دارد سوادش بر سراپانش میچ

”سواد“= سیاہی، تحریر۔

میرے خط کا عنوان تیرے نام ہے، اس لیے اس میں تازگی ہے خط کی تحریر میں میرے غم کے داغ ہیں، اس میں مت الجھ۔

یعنی خط کا حسن معشوق کے نام سے ابھرا ہے۔ خط کا مضمون تو غم انگیز ہے۔ (تحریر کی سیاہی کو داغ غم سے تشبیہ دی)۔

دل از آن تست و نعمت های الوانش تراست

سخت درہم چون ساط خوان بنمائش میچ

”ساط“= دسترخوان۔ خوان ”یغما“= لوٹ کا مال

دل تیری ملکیت ہے اور دل کی گونا گوں نعمتیں بھی تیرے لیے ہیں۔ ان کو لوٹ کے مال کی طرح مت لپیٹ۔

ای ہوس کارت ز گستاخی بہ بی رحمی کشید

ناز کی های میانش بین، بہ بالائش میچ

اے ہوس اب تیری کار فرمایاں گستاخی سے گزر کر بے رحمی تک جا پہنچیں محبوب کی کر کی نزاکتوں پر نظر رکھ اور اس کے قد و قامت میں نہ الجھ۔

یعنی لطافت حسن سے اس طرح لذت اندوز ہونا چاہیے کہ اس میں ہوس کا شائبہ نہ ہو۔

پیش ازین کی بود این ہم التفاتی بودہ است

این قدری بر خود ز رنجش های بی جانش میچ

”بر خود میچ“= پیچ و تاب نہ کھا۔

محبوب کی بے جا رنجشوں سے کیوں آزرده ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے بھی کیا عالم تھا۔ اب بھی ان سب باتوں کو محبوب کے التفات پر محمول کرنا چاہیے۔

یعنی دوست کے بے جا آزرده خاطر ہونے میں بھی ایک توجہ کا پہلو تو ہے۔



نعلش غالب ہم چین بر جا گزار، آخر شب است

خیز و در کھلی پرند گوهر آماش میچ

لغت: ”کھلی پرند“= سیاہ ریشم۔ گوہر آما“= موتیوں بھرا۔

تاروں بھری رات اور اس کی سیاہی کو سیاہ ریشم سے جس میں موتی نکلے ہوں تشبیہ دی ہے۔ رات کا وقت ہے، غالب کی نعلش کو یونہی پڑا رہنے دے۔ چھوڑ دے اس نعلش کو موتیوں بھری سیاہ چادر میں مت لپیٹ۔



## ردیف (ج)

### غزل نمبر (1)

بادہ پر تو خورشید و ایاب دم صبح

مفت آنان کہ در آیند بباغ دم صبح

بادہ پر تو خورشید“= سورج کی طرح روشن شراب۔ ”ایاب“= جام و ساغر۔

”دم صبح“= صبح کا سانس، صبح کی تازہ ہوا۔ ”مفت آنان“= اُن کا حصہ۔

صبح کی تازہ ہوا کا جام ہو اور اس میں سورج کی روشن کرنوں کی شراب انڈیلی جا رہی ہو، یہ نعتیں ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں جو صبح کی تازگیوں کے چمن میں سیر کرتے ہیں۔

آفتابیم بھم دشمن و ہمدرد ای شمع

ما ہلاک سر شامیم تو داغ دم صبح

”اے شمع تو اور میں ایک دوسرے کے دشمن بھی ہیں اور ہمدرد بھی۔ ہم دھوپ کی طرح

ہیں کہ شام کے آتے ہم ہلاک ہو جاتے ہیں اور تجھے صبح بچھا دیتی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے حریف (دشمن) اس لیے ہیں کہ سورج کا غروب عاشق کے

لیے پیام مرگ (شب فراق لاتا ہے) اور شمع کے لیے پیام زندگی (وہ رات کو جلنے لگتی ہے) اور

آہرد اس لیے کہ دونوں اس کے ہاتھوں دکھ اٹھاتے ہیں۔ عاشق غروب کے باعث اور شمع طلوع

کے باعث۔



بعد آنا نکہ قریب اند بما نوبت ماست

آخرِ کلفتِ شبِ هاست فراغِ دمِ صبح

لغت: "ان لوگوں کے بعد" جو ہمارے قریب ہیں، ہماری باری ہے۔ راتوں کی کلفتوں کے بعد ہی صبح کی فراغت آتی ہے۔

زین سپس جلوۂ خور جای چراغان گیرد

شبِ اندیشہ ز ما یافت سراغِ دمِ صبح

ہماری فکر مند یوں کی رات کو ہماری ہی وساطت سے صبح کے نمودار ہونے کا سراغ ملا ہے۔ اب اس کے بعد چراغان کی جگہ سورج لے لے گا۔

یعنی دوسو سال کی رات ختم ہوگی اور امید کا سورج طلوع ہوگا۔

پیش ازین باد بھار این ہمہ سرمست نبود

شبِ نیم ماست کہ تر کردہ دماغِ دمِ صبح

اس سے پہلے باد اتنی سرمست کہاں تھی۔ یہ ہماری شبِ نیم ہی ہے کہ جس نے صبح کے دماغ کو تر کیا۔ یعنی ہماری طبیعت کی کلفتگی نے صبح کو تازہ تر کر دیا۔

خنن ما ز لطافتِ ہمہ سر جوش می است

کہ فرو ریختہ از طرفِ ایامِ دمِ صبح

ہمارا کلام لطافت میں سر بسر شرابِ ناب کی طرح ہے جو صبح کے جام سے ٹپک پڑی ہے۔ گویا صبح کی کیفیت نے ہم پر بھی کیفیتِ طاری کی ہے اور ہم مستانہ وار شعر کہہ رہے ہیں۔ یہ

فیضانِ صبح ہے۔

ذوقِ مستی زہم آہنگی بلبلِ نیرد

مفلکِ آواز پر آوازِ کلاغِ دمِ صبح

صبح کے کوئے کی آواز پر آواز نہ لگاؤ۔ مستی کی کیفیت تو بلبل کی ہموائی سے پیدا ہوتی ہے۔

حق آن گرمی ہنگامہ کہ دارم شناس

ای کہ در بزمِ تو ماتم بچراغِ دمِ صبح

صبح نے تو میری طبیعت میں جذبات کی ہنگامہ خیز کیفیت پیدا کر دی ہے۔ تجھے اس کی قدر کرنی چاہیے۔ تیری بزم میں چراغِ صبح سے ماتم کی ہی افسردگی کیوں ہے۔

بوئی گلِ گر نہ نویدِ کرمِ داشت، چہ داشت؟

ای بشبِ کردہ فراموشِ جناغِ دمِ صبح

لغت: "جناغ" = استخوانِ سینہ مرغ۔

وہ تسمہ جو رکابِ زین میں ہوتا ہے چونکہ اس کی شکل استخوانِ سینہ مرغ سے ملتی ہے، اسے جناغِ زین کہتے ہیں۔

"جناغِ دمِ صبح" = سے مراد سینہ صبح۔

پھولوں کی خوشبو میں تیری بخشش کی خوشخبری ہی تھی اور کیا تھا۔ تو نے رات کو صبح کے سینے سے ابھرے ہوئے سانس کو بھلا دیا۔



یعنی صبح سویرے پھولوں کی خوش بو، سینہ صبح سے ابھرا ہوا معطر سانس تھا اور وہ تیری نوازشوں کی بشارت تھی، مگر رات آئی تو تو اسے بھول گیا:

غالب امروز بوقتی کہ صبوحی زدہ ام

چیدہ ام این گل اندیشہ ز باغ دم صبح

لغت: "صبحی" = صبح کی شراب۔ اس کے برعکس شام کو جو شراب پی جائے اسے سبوحی کہتے ہیں۔

"گل اندیشہ" = افکار (شاعرانہ) کے پھول۔

غالب آج جب میں نے صبوحی پی تو یہ شاعرانہ افکار کے پھول میں صبح کے باغ میں پھنے یعنی صبوحی سے مست ہوتے وقت صبح کی تازہ فضا نے مجھے یہ اشعار کہنے پر اکسایا۔



### غزل نمبر (۲)

آہی بھٹق فاتح خیر کنیم طرح

در گنبد سھر مگر در کنیم طرح

"طرح" = صورت و پیکر۔ "طرح کردن" = بنانا۔ بنیاد رکھنا۔ "فاتح خیر" = حضرت علیؑ

حضرت علیؑ (فاتح خیر) کی محبت میں ایک آہ کھینچیں۔ شاید اس آہ سے گنبد آسمان میں (دروازہ وا ہو جائے) شکاف پڑ جائے۔

در فصل دی کہ گشتہ جہان ز مہریر ازو

بنشین کہ آب گردش ساغر کنیم طرح

لغت: "دے" = خزاں کے مہینوں میں سے ایک مہینا۔ سردی میں پت جھڑکا موسم۔  
"ز مہریر" = زم اور ہریر سے مرکب ہے زم بمعنی سخت سرد اور ہریر بمعنی کندہ۔ "ز مہریر" بمعنی سخت سرد کر دینے والا۔

پرانی حکمت کے مطابق کرہ ہوائی کے ایک حصے کا نام زمہریر ہے جہاں بخارات پہنچ کر ٹنجد ہو جاتے ہیں۔

زمہریر اس طبقہ دوزخ کا بھی نام ہے جو بے انتہا سرد ہے اور کافروں کو عذاب پہنچانے کے لیے ہے۔

آہیٹھ جائیں اور اس موسم زمستان (دے) میں جب کہ دنیا زمہریر بن گئی ہے، ساغر کو گردش میں لائیں اور شراب پیئیں۔

تا چند نشوی تو و ما حسب حال خویش

افسانہ های غیر مکرر کنیم طرح

لغت: "غیر مکرر" = نہ دہرائے ہوئے۔ تازہ۔

کب تک تو ہماری داستان (دل) نہیں سنے گا اور ہم اپنے حسب حال نئے نئے افسانے بناتے رہیں گے۔

مارا زبون مگر اگر از پا در آمدیم

از ما عجب مدار گر از سر کنیم طرح



لغت: ”اگر از پا در آیم“ = اگر ہم گر پڑے ہیں۔ اپنے پاؤں کے سہارے چل نہیں سکتے۔

”مارا زبوں مگیر“ = ہمیں حقیر نہ سمجھ۔

اگر چلتے چلتے تیری راہ میں ہمارے پاؤں تھک کر رہ گئے ہیں تو ہمیں حقارت سے نہ دیکھ۔ اسے عجب بات نہ سمجھنا، ہم سر کے بل بھی چل سکتے ہیں۔

ھوئی بخرخ دادن گردون بر آوریم

عیشی بداغ کردن اختر کنیم طرح

لغت: ”ہوئی“ = نعرۂ مستانہ۔ ”بخرخ دادن“ = گھمانا، رقص میں لانا۔

ایک ایسا نعرۂ مستانہ بلند کریں کہ آسمان رقص میں آجائے۔ ایک ایسی بزم نشاط آراستہ کریں کہ ستارے رشک سے جل جائیں۔

یعنی ہماری محفل نشاط کی درختانیاں ستاروں کی بزم کومات کرے۔

خود را بشاہدی پرستیم زین سپس

در راہ عشق، جادۂ دیگر کنیم طرح

اس کے بعد خود معشوق بن جائیں اور خود ہی اپنی پرستش کریں اور یوں راہ محبت میں ایک نیا راستہ نکالیں۔

از داغ شوق پردہ نشینی نشان دھیم

در زخم رشک روزنہ در کنیم طرح

لغت: ”روزنہ در“ یا ”روزن در“ = دروازے کا چھوٹا سا سوراخ جس میں سے اندر

جھانکتے ہیں۔

اپنے داغ محبت کو (جو ہمارے دل میں نہاں ہے) ایک پردہ نشیں محبوب قرار دیں، اور اپنے زخم رشک کو روزنہ در تصور کریں۔

یعنی اسی روزنہ سے چپکے چپکے محبوب کو دیکھیں۔

از تار و پود نالہ نقابی دھیم ساز

وز دود سینہ زلف معنم کنیم طرح

اپنے درد بھرے نالوں کے تار و پود (تانے بانے) سے اس محبوب کا نقاب بنائیں اور اپنے سینے سے ابھرتے ہوئے دھوئیں کو اس کی زلف معنم سمجھ لیں۔

برگ حلل ز شعلہ و آذر بھم نصیم

پیرایہ از شرارہ و اخگر کنیم طرح

لغت: ”برگ“ = پتا بھی ہے اور ساز و سامان بھی۔

”آذر“ = آگ۔ ”پیرایہ“ = آرائش و زیور۔ ”حلل“ = (حلہ کی جمع) لباس۔

شعلوں اور آگ سے اس کا لباس مہیا کریں اور چنگاریوں سے اس کی آرائش کریں۔

از زخم و داغ لالہ و گل در نظر کشیم

از کوہ و دشت مجلہ و منظر کنیم طرح

اپنے دل کے زخموں اور داغوں کو لالہ و گل تصور کریں اور کوہ و بیاباں کو ایوان اور دریچہ سمجھ لیں۔



از سوز و ساز محرم و مطرب کنیم جمع

از خار و خارہ بالاش و بستر کنیم طرح

سوز و ساز ہمارے ندیم اور مطرب ہوں اور کانٹوں کا بستر ہو اور پتھر کا تکیہ۔

آئین برہمن بہ نہایت رساندہ ایم

غالب بیا کہ شیوہ آذر کنیم طرح

لغت: ”آذر“ = حضرت ابراہیمؑ کے باپ جو بت تراش تھے۔

طریق برہمن کی تو ہم نے تکمیل کر لی، غالب آ اب مسلک آذر اختیار کریں یعنی اب تک بتوں کی پوجا کرتے رہے اور اس میں کمال حاصل کر لیا۔ اب خود بت تراشیں گے۔ اس ساری غزل میں مرزا غالب نے ایک تصورات کی دنیا قائم کی ہے جس کا مرکز خود ان کی ذات ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی منفرد شخصیت کا احساس انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ غزل مسلسل ہے ایک اور ہی جذبے اور کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔



## ردیف (خ)

### غزل نمبر (۱)

ای جمال تو بتا راج نظرہا گستاخ

وی خرام تو پامالی سرہا گستاخ

اس غزل کے تقریباً تمام اشعار میں محبوب سے خطاب کیا گیا ہے۔ ”گستاخ“ بے ادب، دلیر، بے باک کا مفہوم دیتا ہے۔ چنانچہ اس غزل میں گستاخ کی ردیف کا مرکزی مفہوم موجود رہتا ہے، لیکن ہر شعر میں اس مفہوم کے لطیف پہلو الگ الگ ابھرتے رہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ تیرا حسن، عاشقوں کی نظروں کو بڑی بے باکی سے لوٹتا ہے اور خرام (ناز) عاشقوں کے سروں کو پامال کرتا چلا جاتا ہے۔

داغ شوق تو بہ آرائش دلہا سرگرم

زخم تیغ تو بہ گلکشت جگرہا گستاخ

تیری محبت کا داغ عاشقوں کے دلوں کی آرائش میں سرگرم ہے اور تیری تلوار کا زخم ان کے جگر میں دلیرانہ چلتا ہے۔

جگر کے خون کی سرفی کے اعتبار سے گلکشت (باغ یا پھولوں کی سیر) کہا، یعنی دلوں میں تیرا شوق سما یا ہے اور تیرے زخم سیدھے جگر پر لگتے ہیں۔



مردم از درد تو دور از تو داغم از غیر

کہ رساند بتو این گونه خبرها گستاخ

میرا یہ عالم ہے کہ تجھ سے دور ہوں، اور تیرے درد محبت کا مارا ہوا ہوں، پھر رقیب کو دیکھ کر شک آتا ہے کہ وہ کس بے باکی سے میرے بارے میں اس قسم کی (غلط) خبریں پہنچاتا ہے (اور تو انھیں سچ مان لیتا ہے)

با خبر باش کہ دردی کہ ز بیدروی تست

نالہ را کرد در اظہار اثرها گستاخ

تجھے خبردار رہنا چاہیے کہ تیری بے مہری سے جو دردِ عالم میرے دل کو ملا ہے اس سے میری فریاد میں بلا کی اثر انگیزی آگئی ہے (یہ اثر انگیزی آخر تجھے بھی درد میں مبتلا کر دے گی)۔

خواہش وصل خود از غیر اخلاص مسخ

کاین گدائی است بدر یوزہ درها گستاخ

رقیب جو تجھ سے وصل کا طلب گار ہے، اس کی اس خواہش وصل کو اخلاص پر مبنی نہ سمجھ کیونکہ وہ ایک ایسا بے شرم گدا ہے جو درد کی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔  
یعنی اس میں وفا نہیں، وہ تو جگہ جگہ عشق جتنا پھرتا ہے۔

شاد گردم کہ بخلوت نرسید است رقیب

بینمش چون بتو در راہ گزرها گستاخ

جب میں رقیب کو راہوں میں تجھ سے بے تکلف انداز میں ملتا دیکھتا ہوں تو خوش ہوتا ہوں کہ چلو اچھا ہوا رقیب تیری خلوت گاہ میں باریاب نہ ہوا۔ (ورنہ جس طرح کھل کر باتیں کر رہا ہے وہ سر بازار نہ کرتا، تجھ سے میں کرتا)

گریہ ارزانی آن دل کہ بہ نیرو باشد

بہ شنا ورزی سیلاب خطرہا گستاخ

لغت: "شناورزی" = تیرنا، غوطہ زن ہونا۔ "نیرو" = طاقت، حوصلہ۔

محبت میں آنسو بہانا صرف اُسی دل کا حصہ ہے جس میں خطروں کے طوفانوں سے (تیرنے) بے محابا گزرنے کا حوصلہ اور طاقت ہو۔

ہای این پنجه کہ با جیب کشاکش دارد

بود با دامن پاکت چه قدرها گستاخ

افسوس میرا یہ پنچہ (ہاتھ) جو آج میرے جیب و گریباں سے الجھا ہوا ہے، کبھی تیرے دامن پاک کو کس کس قدر دلیری (گستاخ دہی) سے تھامے ہوئے تھا۔

ناز دلہای نزارش چه محابا باشد

سر زلفی کہ بہ پیچد بہ کمرها گستاخ

لغت: "دلہائے نزار" = کمزور اور لاغر دل، عاشقوں کے دل۔

وہ زلف جو عاشقوں کے جسم (کمر) سے بڑی دلیری سے لپٹی رہتی ہے، اس کا اپنے ان چاہنے والوں کے دل نحیف پر نام کرنا بھی بڑے حوصلے کی بات ہے۔



محبوب ظاہر پیار سے، چاہنے والوں کے دلوں کو ستا کر کتنا ناز کرتا ہے اور اخلاص کا نام نہیں۔

طوطیان در شکر آیند بہ غالب کاو راست

لبی از نطق بہ تاراج شکرہا گستاخ

لغت: ”طوطیان“ = طائران خوشنوا۔ ”نطق“ = قوت گویائی۔

غالب کے پاس بڑے بڑے خوشنویان شیریں بیان آتے ہیں کیونکہ اس کو ایسے لب عطا ہوئے ہیں جن کی قوت گویائی شیرینیوں (شکرہا) کو لوٹ لیتی ہے۔  
یعنی غالب کے اشعار شیریں پر ہزاروں شیریں بیابیاں قربان ہیں۔



## غزل نمبر (۲)

تا بشوید نہاد ما ز و سخ

گشت گرما بہ ساز از دوزخ

لغت: ”سخ“ = آلودگی، ناپاکی۔ ”نہاد“ = جسم۔

ہمارے جسم کو آلودگیوں سے پاک کرنے (دھونے) کے لیے اس نے دوزخ کو حام بنا

لیا ہے۔

دوزخ کیا ہے۔؟ گنہگاروں کو گناہوں سے پاک کرنے کی ایک صورت ہے جس کے

بعد وہ جنت کے سزاوار ہوں گے۔

تاچہ بخشد در جہان دگر

کشتگان ترا چمن برزخ

لغت: ”جہاں دگر“ = عقبی۔

تیرے کشتگان عشق کے لیے تو چمن برزخ ہے۔ انھیں عقبی میں آخر کیا عطا ہوگا۔

عاشقوں کا دل چمن زاروں سے خوش نہیں ہوتا، وہ عاقبت میں کیسے خوش ہوں گے۔

وہ کہ از کشت زار امیدم

بھرہ مور نیز مرد ملخ

کیا کہنے (اس بد نصیبی کے) کہ میری امید کی کھیتی سے، نڈی، چیونٹی کا حصہ بھی چٹ کر گئی۔

یعنی میری چھوٹی سے چھوٹی امید بھی بر نہ آئی۔

دلم اجزای نالہ را مدفن

دردت اشخاص بقعہ را مسلخ

لغت: ”مسلخ“ = مقتل۔ ”اشخاص بقعہ“ = وہ اشخاص جو محبوب کے گھر میں بار یاب ہیں۔

میرادل میری فریادوں کے بکھرے ہوئے اجزا کا مدفن بنا ہوا ہے، اور تیرا دروازہ، تیرے گھر میں بار یابی حاصل کرنے والوں کی قتل گاہ ہے۔

از دل آرم بساط من آتش

از تو گویم برات من بر سخ



لغت: "از دل آرم" = میرادل کہتا ہے۔ "از تو گویم" = تیری طرف سے کہتا ہوں۔  
میرادل آواز دیتا ہے۔ میں آگ میں بیٹھا ہوں۔ تیری طرف سے کہتا ہوں کہ  
میرے نصیب میں برف (خ) ہے۔ یعنی مرادل تو محبت کی آگ میں جل رہا ہے اور تیری  
طرف سے سرد مہری ہے۔

هوس ما و دانه از یک دست  
نفس ما و دام از یک نخ  
"نخ" = دھاگا۔

ہماری خواہشات (ہوس) اور دانے کی ایک ہی نوعیت ہے۔  
ہمارا سانس اور جال (دام) کا تانا بانا ایک ہی دھاگے سے بنا ہوا ہے۔ انسانی  
خواہشات اور ان خواہشات میں اسیر ہونا، دونوں انسانی فطرت میں داخل ہیں۔ قدرت نے  
انسان کو ایسا ہی بنایا۔

برگ در خوردِ همت فلک است  
به شکایت چه می زیم ز نخ  
"برگ" = ساز و سامان، نصیب۔ "ز نخ" = ٹھوڑی۔ "ز نخ زدن" = تاسف کرنا۔  
جو کچھ انسان کو ملتا ہے اس کا دار و مدار آسمان کے ظرف اور ہمت پر ہے۔ پھر گلے  
شکوے کیسے اور افسردہ دلی کس بات پر (سارا معاملہ انسان کے مقدر کا ہے)

مور چون ساز میزبانی کرد  
به سلیمان رسید پائی ملخ

چیونٹی نے جب میزبانی کا اہتمام کیا تو حضرت سلیمانؑ کے پاس مکاری کی ٹانگ  
پہنچ گئی۔

با تو شد هم سخن پیام گزار  
چه شکیم بارزش پاخ  
لغت: "پیام گزار" = قاصد۔

"پاخ" = (جواب) دراصل پائے خون تھا، مخفف ہو کر پاخ رہ گیا۔ پائے سے پا  
اور خون سے سخن بن گیا۔

اب سخن کے تلفظ کی تین صورتیں رائج ہیں۔ سخن، سخن، او سخن۔ آخری تلفظ پشتی رائج  
ہے اور فارسی اور اردو کے شعرا کے یہاں بطور قافیہ آتا ہے (مثلاً بدن کا قافیہ سخن)۔

مرزا غالب نے اس شعر میں جب پاخ کا لفظ سین مفتوح کے ساتھ لکھا، یعنی پاخ  
لکھا تو اعتراض ہوا۔ اس کے جواب میں مرزا نے سخن کی تلفظ کی تین صورتوں کے حوالے سے کہا  
کہ سخن کا تتبع کیا ہے جس کا مخفف سخ بنتا ہے، سخ نہیں بنتا کیونکہ سخن کے نون کو گرائیں تو خاما کن  
ہو جائے گا اور سین مفتوح رہے گا۔ وہ کہتا ہے:

"مجھے تیرے جواب کی ارزش (اہمیت، قدر و قیمت) سے تسکین (شکب) کیا  
ہوگی مجھے تو رشک نے مار ڈالا ہے۔ مجھے تو رشک اس بات کا ہے تو میرے قاصد سے ہمکلام  
ہوا ہے۔

مرزا غالب کے یہاں رشک کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں فارسی کا ایک شعر ہے:

چون به قاصد بہرم پیغام را  
رشک مگذارد کہ گویم نام ار



(جب میں خط قاصد کے سپرد کرتا ہوں تو رشک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں

تیرا نام بھی لوں)

اردو کا شعر ہے:

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں  
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

در سخن کار بر قیاس مکن  
ترش گردد خز، نہ تلخ تلخ

لغت: ”قیاس“ = لغوی معنی خیال اور گمان اور اندازہ کے ہیں لیکن منطق میں یہ لفظ بطور اصطلاح کے مستعمل ہے۔ منطق دو طرح کی ہے، منطق استقرائی اور منطق استخراجی۔ قیاس استقرائی کی ایک اصطلاح ہے کہ چند مثالوں سے اندازہ کر کے ہم کوئی نتیجہ نکال لیں۔

زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زبان میں قیاس نہیں چلتا یعنی کوئی محاورہ یا روزمرہ، اندازہ کر کے نہیں بنائے جاسکتے غالب نے اسی اصول کو مد نظر رکھ کر یہ شعر کہا ہے کہ۔

زبان میں قیاس سے کام نہیں چلتا ترش کا تلفظ خز بھی ہے لیکن اسی قیاس پر تلخ کا تلفظ تلخ نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مرزا نے یہ شعر محض تلخ کا قافیہ لانے کے لیے لکھا ہے، ورنہ اس شعر میں کوئی اور خوبی نہیں۔

قاصد من بہ راہ مرزہ و من

ہمچنان در شمارہ فرخ

لغت: ”فرخ“ = میل فاصلہ۔

میرا قاصد تو راستے ہی میں مرچکا ہے (یا مارا گیا ہے) اور میں ابھی تک میل ہی گن رہا ہوں کہ اب وہ اتنا فاصلہ طے کر چکا ہوگا۔

مرگ غالب دلت بدرد آورد

خویش را کشت و ہرزہ کشت آوخت

غالب کی موت نے تجھے آزرہ کر دیا۔ افسوس اس نے (غالب نے) اپنے آپ کو مارا اور رائگاں مارا۔ غالب کا یہ اردو شعر دیکھئے:

آہی جاتا وہ راہ پر غالب

کوئی دن اور بھی جیسے ہوتے

چنانچہ یہی احساس فارسی شعر میں موجود ہے کہ غالب کے مرنے کا دوست کو دکھ ہوا تو پتا چلا کہ اس کے دل میں غالب کی محبت تھی۔ اب اسے اپنی موت پر افسوس ہو رہا ہے کہ یونہی مایوس ہو کر جان دی۔





# Sharah Ghazaliyat-e-Ghalib Farsi

(Complete Works of Ghalib with Meanings & Translation in Urdu) (Vol. I)

by

Sufi Ghulam Mustufa Tabassum

## Ghalib As A Poet

With the conquest of India by Persians, the art of ghazal writing came along in the wake of it. Though Ghalib's master pieces of art are in Persian, the irony is that he derived greater fame from the Urdu Versions. He delivered excellence in quality to the Urdu languages of ghazal. The ghazal is a verse of amorousness - boy meets girl - the cry of a wounded gazelle. To understand ghazal, especially the ones by Ghalib, I think the reader wants to know that in this form of verse, the thought contained in every couplet is supposed to be and complete. In rare cases if it shows some relation with others, it is the skill of a master poet. The theme or mood of the ghazal need not be the same throughout because it is simply a diamond of many facets. Ghalib polished it with humanity. He is not a gloomy poet like good old Mir, instead he believed a poet should create beauty out of terror, flowers out of fire and good out of evil. He invited grief and misery till death, as though his contented soul had nothing to live for.



**Kitabi Duniya**

1955, Turkman Gate, Delhi - 110006 (INDIA)

Mobile: 9313972589, Phone: 0091-11-23288452

E-mail: kitabiduniya@rediffmail.com



ISBN-81-89461-08-7

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

(488)

شرح غزلیات غالب (فارسی)

میرا قصد تو راستے ہی میں مر چکا ہے (یا مارا گیا ہے) اور میں ابھی تک میل ہی گن رہا ہوں کہ اب وہ اتنا فاصلہ طے کر چکا ہوگا۔

مرگ غالب دلت بدرد آورد

خویش را کشت و ہرزہ کشت آوخت

غالب کی موت نے تجھے آزرده کر دیا۔ افسوس اس نے (غالب نے) اپنے آپ کو مارا اور رائگاں مارا۔ غالب کا یہ اردو شعر دیکھئے:

آہی جاتا وہ راہ پر غالب

کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

چنانچہ یہی احساس فارسی شعر میں موجود ہے کہ غالب کے مرنے کا دوست کو دکھ ہوا تو پتا چلا کہ اس کے دل میں غالب کی محبت تھی۔ اب اسے اپنی موت پر افسوس ہو رہا ہے کہ یونہی مایوس ہو کر جان دی۔

